(مجموعہ خطبات وتحریرات)

جلد نمبر ۸

اخلاق سیئہ اور ان کی اصلاح

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے ہم افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

اخلاقِ سیّئہ اور ان کی اصلاح

جلد ۸

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبات وتحریرات

جلد ۸

اخلاق سیئہ اور ان کی اصلاح

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور — فون ۳۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۷۸۵
★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور پاکستان — فون ۳۷۲۲۳۹۹۱، ۳۷۳۵۳۲۵۵
★ موہن روڈ چوک اُردو بازار، کراچی — فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

نام کتاب

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خطبات وتحریرات

جلد ۸

اخلاق سیئہ اور ان کی اصلاح

جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — جون ۲۰۱۰ء

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴- دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور فون ۳۷۳۲۳۴۱۲ فیکس ۳۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲+
۱۹۰- انارکلی، لاہور- پاکستان ــــــ فون ۳۷۲۴۳۹۹۱-۳۷۳۵۳۲۵۵
موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی- پاکستان ــــ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

www.idaraeislamiat.com
E-mail:idara.e.islamiat@gmail.com

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴
مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴
مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴
ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، اردو بازار، کراچی
دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر ۱
بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر ۱
بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

ہماری روزمرہ زندگی اور اس میں اُلجھنوں اور پریشانیوں کا حل قرآن وسنت میں پوشیدہ ہے۔ ہم افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اسلام کی بیش بہا تعلیمات کے مطابق کس طرح اعتدال کی راہ اختیار کر سکتے ہیں؟ کس طرح ایک خوشگوار زندگی گزار سکتے ہیں جس میں دین ودنیا کی راحتیں میسر ہوں اور دل کا سکون نصیب ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہر مسلمان ڈھونڈ رہا ہے۔ ''اسلام اور ہماری زندگی'' انہی سوالات کا جواب فراہم کرتی ہے۔

اسلام اور ہماری زندگی

مجموعہ خُطبَات وتحریرات

جلد ۸

اخلاق سیئہ اور ان کی اصلاح

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مولانا مُحمّد تقی عثمانی دامت برکاتہم

مرتب

مولانا محمد اویس سرور صاحب

★ ۱۴ دینا ناتھ مینشن مال روڈ، لاہور ★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان ★ موہن روڈ چوک اُردو بازار، کراچی

فون ۳۷۳۵۳۲۵۵-۳۷۲۴۳۹۹۱ فون ۳۷۲۳۲۳۴۱۲ فیکس ۹۲-۴۲-۳۷۳۲۴۳۷۸۵ فون ۳۲۷۲۲۴۰۱

فہرست مضامین

غیبت اور اس کا علاج ۱۰۳

کثرتِ کلام اور اس کا علاج ۱۵۲

وساوس اور ان کا علاج ۱۶۶

حسد اور اس کا علاج ۲۱۸

کینہ اور اس کا علاج ۲۳۴

جھوٹ
اور
اس کی مروجہ صورتیں ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا.

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ، وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ)) فِيْ رِوَايَةٍ ((وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ))[1]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین خصلتیں ایسی ہیں جو منافق ہونے کی نشانی ہیں۔ یعنی کسی مسلمان کا کام نہیں ہے کہ وہ یہ کام کرے، اگر کسی انسان میں یہ باتیں پائی جائیں تو سمجھ لو کہ وہ منافق ہے۔ وہ تین باتیں یہ ہیں کہ جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے۔ اور جب وعدہ کرے، تو اس کی خلاف ورزی کرے، اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھوائی جائے تو وہ خیانت کرے۔ ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ چاہے وہ نماز بھی پڑھتا ہو اور روزے بھی رکھتا ہو اور چاہے وہ دعویٰ کرتا ہو کہ وہ مسلمان ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں، اس لئے کہ مسلمان ہونے کی جو بنیادی صفات ہیں، وہ ان کو چھوڑے ہوئے ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۳/۱۳۶ تا ۱۵۵)، ۲۹ نومبر ۱۹۹۱ء، بروز جمعہ بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب علامة المنافق، رقم: ۳۲، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان خصال المنافق، رقم: ۸۹، سنن الترمذی، کتاب الإیمان عن رسول اللہ، باب ما جاء فی علامة المنافق، رقم: ۲۵۵۵، مسند أحمد، رقم: ۸۳۳۱

اسلام ایک مکمل دین ہے

خدا جانے یہ بات ہمارے ذہنوں میں کہاں سے بیٹھ گئی ہے، اور ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ دین بس نماز روزے کا نام ہے، نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا، اور نماز روزے کا اہتمام کرلیا، بس مسلمان ہوگئے، اب مزید ہم سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں ہے، چنانچہ جب بازار گئے تو اب وہاں جھوٹ فریب اور دھوکے سے مال حاصل ہو رہا ہے، حرام اور حلال ایک ہو رہے ہیں، اس کی کوئی فکر نہیں، زبان کا بھروسہ نہیں، امانت میں خیانت ہے۔ وعدہ کا پاس نہیں۔ لہٰذا اسلام کے بارے میں یہ تصور کہ یہ بس نماز روزہ کا نام ہے، یہ بڑا خطرناک اور غلط تصور ہے۔ حضورِ اقدس ﷺ نے بتادیا کہ ایسا شخص چاہے نماز بھی پڑھ رہا ہو، اور روزے بھی رکھ رہا ہو، لیکن وہ مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں، چاہے اس پر کفر کا فتویٰ نہ لگاؤ، اس لئے کہ کفر کا فتویٰ لگانا بڑی سنگین چیز ہے، اور فتویٰ کے اعتبار سے اس کو کافر نہ قرار دو، دائرۂ اسلام سے اس کو خارج نہ کرو، لیکن ایسا شخص سارے کام کافروں جیسے اور منافق جیسے کر رہا ہے۔

فرمایا کہ تین چیزیں منافق کی علامت ہیں، نمبر ایک جھوٹ بولنا، دوسرے وعدہ خلافی کرنا، تیسرے امانت میں خیانت کرنا، ان تینوں کی تھوڑی سی تفصیل عرض کرنا چاہتا ہوں، اس لئے کہ عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں ان تینوں کا تصور بہت محدود ہے، حالانکہ ان تینوں کا مفہوم بہت وسیع اور عام ہے۔ اس لئے ان کی تھوڑی سی تفصیل کرنے کی ضرورت ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں جھوٹ کا تصور

چنانچہ فرمایا کہ سب سے پہلی چیز جھوٹ بولنا، یہ جھوٹ بولنا حرام ہے، ایسا حرام ہے کہ کوئی ملت، کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس میں جھوٹ بولنا حرام نہ ہو، یہاں تک کہ زمانۂ جاہلیت کے لوگ بھی جھوٹ بولنے کو برا سمجھتے تھے۔ واقعہ یاد آیا کہ جب حضورِ اقدس ﷺ نے روم کے بادشاہ کی طرف اسلام کی دعوت کے لئے خط بھیجا تو خط پڑھنے کے بعد اس نے اپنے درباریوں سے کہا کہ ہمارے ملک میں اگر ایسے لوگ موجود ہوں، جو ان (حضورِ اقدس ﷺ) سے واقف ہوں تو ان کو میرے پاس بھیج دو، تاکہ میں ان سے حالات معلوم کروں کہ وہ کیسے ہیں۔ اتفاق سے اسی وقت حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ، جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، ایک تجارتی قافلہ لے کر وہاں گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ لوگ ان کو بادشاہ کے پاس لے آئے۔ یہ بادشاہ کے پاس پہنچے تو بادشاہ نے ان سے سوالات کرنا شروع کیے۔ پہلا سوال یہ کیا کہ یہ بتاؤ کہ یہ (محمد ﷺ) کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟ وہ کیسا خاندان ہے اس کی شہرت کیسی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ خاندان تو بڑے اعلیٰ درجے کا ہے، اعلیٰ درجے کے

خاندان میں وہ پیدا ہوئے۔ اور سارا عرب اس خاندان کی شرافت کا قائل ہے۔ اس بادشاہ نے تصدیق کرتے ہوئے کہا: بالکل ٹھیک ہے، جو اللہ کے نبی ہوتے ہیں، وہ اعلیٰ خاندان سے ہوتے ہیں۔ پھر دوسرا سوال بادشاہ نے یہ کیا کہ ان کی پیروی کرنے والے معمولی درجے کے لوگ ہیں، یا بڑے بڑے رؤساء ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ان کے متبعین کی اکثریت کم درجے کے معمولی قسم کے لوگ ہیں۔ بادشاہ نے تصدیق کی نبی کے متبعین ابتداءً ضعیف اور کمزور قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ پھر سوال کیا کہ تمہاری ان کے ساتھ جب جنگ ہوتی ہے تو تم جیت جاتے ہو یا وہ جیت جاتے ہیں؟ اس وقت تک چونکہ صرف دو جنگیں ہوئی تھیں، ایک جنگِ بدر، اور ایک اُحد، اور غزوۂ اُحد میں چونکہ مسلمانوں کو تھوڑی سی شکست ہوئی تھی، اس لئے انہوں نے اس موقع پر جواب دیا کہ کبھی ہم غالب آجاتے ہیں اور کبھی وہ غالب آجاتے ہیں۔

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ مسلمان ہونے کے بعد فرماتے تھے کہ اس وقت تو میں کافر تھا۔ اس لئے اس فکر میں تھا کہ میں کوئی ایسا جملہ کہہ دوں جس سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تاثر قائم ہو، لیکن اس بادشاہ نے جتنے سوالات کیے، ان کے جواب میں اس قسم کی کوئی بات کہنے کا موقع نہیں ملا، اس لئے کہ جو سوال وہ کر رہا تھا، اس کا جواب تو مجھے دینا تھا۔ اور جھوٹ بول نہیں سکتا تھا۔ اس لئے میں جتنے جوابات دے رہا تھا، وہ سب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جا رہے تھے۔ (۱)

بہرحال! جاہلیت کے لوگ جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے وہ بھی جھوٹ بولنے کو گوارا نہیں کرتے تھے، چہ جائیکہ مسلمان اسلام لانے کے بعد جھوٹ بولے۔

جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ، ایک جرم

افسوس کہ اب اس جھوٹ میں عام ابتلاء ہے، یہاں تک کہ جو لوگ حرام وحلال اور جائز ناجائز کا اور شریعت پر چلنے کا اہتمام کرتے ہیں، ان میں بھی یہ بات نظر آتی ہے کہ انہوں نے بھی جھوٹ کی بہت سی قسموں کو جھوٹ سے خارج سمجھ رکھا ہے، اور یہ سمجھتے ہیں کہ گویا یہ جھوٹ ہی نہیں ہے، حالانکہ جھوٹا کام کر رہے ہیں، غلط بیانی کر رہے ہیں، اور اس میں دوہرا جرم ہے۔ ایک جھوٹ بولنے کا جرم، اور دوسرے اس گناہ کو گناہ نہ سمجھنے کا جرم، چنانچہ ایک صاحب جو بڑے نیک تھے، نماز روزے کے پابند، اذکار واشغال کے پابند، بزرگوں سے تعلق رکھنے والے، پاکستان سے باہر قیام تھا۔ ایک مرتبہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب بدء الوحی، باب بدء الوحی، رقم:٦، صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب کتاب النبی إلی هرقل یدعوه إلی الإسلام، رقم:٣٣٢٢، مسند أحمد، رقم:٢٢٥٢

جب پاکستان آئے تو میرے پاس بھی ملاقات کے لئے آگئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ واپس کب تشریف لے جارہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں ابھی آٹھ دس روز اور ٹھہروں گا۔ میری چھٹیاں تو ختم ہوگئیں، البتہ کل ہی میں نے مزید چھٹی لینے کے لئے ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ بھجوادیا ہے۔

کیا دین صرف نماز روزے کا نام ہے؟

انہوں نے میڈیکل سرٹیفکیٹ بھجوانے کا ذکر اس انداز سے کیا کہ جس طرح یہ ایک معمول کی بات ہے، اس میں کوئی پریشانی کی بات ہی نہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ میڈیکل سرٹیفکیٹ کیسا؟ انہوں نے جواب دیا کہ مزید چھٹی لینے کے لئے بھیج دیا ہے، ویسے اگر چھٹی لیتا تو چھٹی نہ ملتی، اس کے ذریعہ چھٹی مل جائے گی۔ میں نے پھر سوال کیا کہ آپ نے اس میڈیکل سرٹیفکیٹ میں کیا لکھا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس میں یہ لکھا تھا کہ یہ اتنے بیمار ہیں کہ سفر کے لائق نہیں۔ میں نے کہا کہ کیا دین صرف نماز روزے کا نام ہے؟ ذکر شغل کا نام ہے؟ آپ کا بزرگوں سے تعلق ہے، پھر یہ میڈیکل سرٹیفکیٹ کیسا جارہا ہے؟ چونکہ نیک آدمی تھے، اس لئے انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں نے آج پہلی مرتبہ آپ کے منہ سے یہ بات سنی کہ یہ بھی کوئی غلط کام ہے۔ میں نے کہا کہ جھوٹ بولنا اور کس کو کہتے ہیں؟ انہوں نے پوچھا کہ مزید چھٹی کس طرح لیں؟ میں نے کہا کہ جتنی چھٹیوں کا استحقاق ہے، اتنی چھٹی لو، مزید چھٹی لینی ضروری ہو تو بغیر تنخواہ کے لے لو، لیکن یہ جھوٹا سرٹیفکیٹ بھیجنے کا جواز تو پیدا نہیں ہوتا۔

آج کل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوانا جھوٹ میں داخل ہی نہیں ہے، اور دین صرف ذکر و شغل کا نام رکھ دیا۔ باقی زندگی کے میدان میں جاکر جھوٹ بول رہا ہو تو اس کا کوئی خیال نہیں۔

جھوٹی سفارش کا حکم

ایک اچھے خاصے پڑھے لکھے نیک اور سمجھدار بزرگ کا میرے پاس سفارشی خط آیا، اس وقت میں جدہ میں تھا، اس خط میں یہ لکھا تھا کہ یہ صاحب جو آپ کے پاس آرہے ہیں یہ انڈیا کے باشندے ہیں، اب یہ پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا آپ پاکستانی سفارت خانے سے ان کے لئے سفارش کردیں کہ ان کو ایک پاکستانی پاسپورٹ جاری کردیا جائے اس بنیاد پر کہ یہ پاکستانی باشندے ہیں، اور ان کا پاسپورٹ یہاں سعودی عرب میں گم ہوگیا ہے، اور خود انہوں نے پاکستانی سفارت خانے میں درخواست دے رکھی ہے کہ ان کا پاسپورٹ گم ہوگیا ہے۔ لہٰذا آپ ان کی سفارش کردیں۔

اب آپ بتایئے! وہاں عمرے ہو رہے ہیں، حج بھی ہو رہا ہے، طواف اور سعی بھی ہو رہی ہے، اور ساتھ میں یہ جھوٹ اور فریب بھی ہو رہا ہے، گویا کہ یہ دین کا حصہ ہی نہیں ہے۔ اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ شاید لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جب قصد اور ارادہ کر کے باقاعدہ جھوٹ کو جھوٹ سمجھ کر بولا جائے تب جھوٹ ہوتا ہے، لیکن ڈاکٹر سے جھوٹا سرٹیفکیٹ بنوالینا، جھوٹی سفارش لکھوالینا، یا جھوٹے مقدمات دائر کر دینا، یہ کوئی جھوٹ نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾(۱)

یعنی زبان سے جو لفظ نکل رہا ہے، وہ تمہارے نامۂ اعمال میں ریکارڈ ہو رہا ہے۔

بچوں کے ساتھ بھی جھوٹ نہ بولیں

ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ کے سامنے ایک خاتون ایک بچے کو بلا کر گود میں لینا چاہتی تھی، لیکن وہ بچہ قریب نہیں آرہا تھا، ان خاتون نے بچے کو بہلانے کے لئے کہا کہ بیٹا یہاں آؤ، ہم تمہیں چیز دیں گے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی بات وہ سن لی، اور آپ نے خاتون سے پوچھا کہ تمہارا کوئی چیز دینے کا ارادہ ہے یا ویسے ہی اس کو بلانے اور بہلانے کے لئے کہہ رہی ہو؟ اس خاتون نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا کھجور دینے کا ارادہ ہے کہ جب وہ میرے پاس آئے گا تو میں اس کو کھجور دوں گی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہارا کھجور دینے کا ارادہ نہ ہوتا، بلکہ محض بہلانے کے لئے کہتی کہ میں تمہیں کھجور دوں گی، تو تمہارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھ دیا جاتا۔(۲)

اس حدیث سے یہ سبق دے دیا کہ بچے کے ساتھ بھی جھوٹ نہ بولو، اور اس کے ساتھ بھی وعدہ خلافی نہ کرو، ورنہ شروع ہی سے جھوٹ کی برائی اس کے دل سے نکل جائے گی۔

مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولیں

ہم لوگ محض مذاق اور تفریح کے لئے زبان سے جھوٹی باتیں نکال دیتے ہیں، حالانکہ نبی کریم ﷺ نے مذاق میں بھی جھوٹی باتیں زبان سے نکالنے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ افسوس ہے اس شخص پر یا سخت الفاظ میں اس کا صحیح ترجمہ یہ کر سکتے ہیں کہ ''اس شخص

---

(۱) ق: ۱۸، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: انسان کوئی لفظ زبان سے نکال نہیں پاتا، مگر اس پر ایک نگران مقرر ہوتا ہے، ہر وقت (لکھنے کے لئے) تیار!''

(۲) سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في التشديد في الكذب، رقم: ۴۳۳۹، مسند أحمد، رقم: ۱۵۱۴۷

کے لئے دردناک عذاب ہے، جو محض لوگوں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ بولتا ہے"۔(۱)

حضور ﷺ کی خوش طبعی

خوش طبعی کی باتیں اور مذاق حضورِ اقدس ﷺ نے بھی کیا، لیکن کبھی کوئی ایسا مذاق نہیں کیا جس میں بات غلط ہو، یا واقعہ کے خلاف ہو۔ آپ نے کیسا مذاق کیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک بڑھیا حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں آئی، اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرے لئے دعا کردیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں پہنچادیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کوئی بڑھیا جنت میں نہیں جائے گی، اور وہ بڑھیا رونے لگی کہ یہ تو بڑی خطرناک بات ہوگئی کہ بڑھیا جنت میں نہیں جائے گی، پھر آپ نے وضاحت کرکے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی عورت اس حالت میں جنت میں نہیں جائے گی کہ وہ بوڑھی ہو، بلکہ وہ جوان ہوکر جائے گی۔

تو آپ نے ایسا لطیف مذاق فرمایا کہ اس میں کوئی بات نفس الامر کے خلاف اور جھوٹی نہیں تھی

خوش طبعی کا ایک انوکھا انداز

ایک دیہاتی آپ ﷺ کی خدمت میں آیا، اور عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے ایک اُونٹنی دے دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم تم کو ایک اُونٹنی کا بچہ دیں گے۔ اس نے کہا: یا رسول اللہ! میں بچے کو لے کر کیا کروں گا۔ مجھے تو سواری کے لئے ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہیں جو بھی اُونٹ دیا جائے گا وہ کسی اُونٹنی کا بچہ ہی تو ہوگا۔ یہ آپ نے اس سے مذاق فرمایا، اور ایسا مذاق جس میں خلافِ حقیقت اور غلط بات نہیں کہی۔ تو مذاق کے اندر بھی اس بات کا لحاظ ہے کہ زبان کو سنبھال کر استعمال کریں، اور زبان سے کوئی لفظ غلط نہ نکل جائے، اور آج کل ہمارے اندر سچے جھوٹے قصے پھیل گئے ہیں، اور خوش گپیوں کے اندر ہم ان کو بطور مذاق بیان کردیتے ہیں۔ یہ سب جھوٹ کے اندر داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ (۳)

---

(۱) سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی التشدید فی الکذب، رقم: ۴۳۳۷، مسند أحمد، رقم: ۱۹۱۷۰، سنن الدارمی، کتاب الإستئذان، رقم: ۲۵۸۶۔

(۲) مشکاۃ المصابیح (۵۹/۳)، احیاء علوم الدین (۱۲۹/۳)

(۳) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، باب ماجاء فی المزاح، رقم: ۱۹۱۴، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب ماجاء فی المزاح، رقم: ۴۳۴۶، مسند أحمد، رقم: ۱۳۳۱۵

جھوٹا کیریکٹر سرٹیفکیٹ

آج کل اس کا عام رواج ہوگیا ہے، اچھے خاصے دیندار اور پڑھے لکھے لوگ بھی اس میں مبتلا ہیں، کہ جھوٹے سرٹیفکیٹ حاصل کرتے ہیں، یا دوسروں کے لئے جھوٹے سرٹیفکیٹ جاری کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی کو کیریکٹر سرٹیفکیٹ کی ضرورت پیش آگئی، اب وہ کسی کے پاس گیا، اور اس سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا، اور جاری کرنے والے نے اس کے اندر یہ لکھ دیا کہ میں ان کو پانچ سال سے جانتا ہوں، یہ بڑے اچھے آدمی ہیں، ان کا اخلاق و کردار بہت اچھا ہے۔ کسی کے حاشیۂ خیال میں یہ بات نہیں آتی کہ ہم یہ ناجائز کام کررہے ہیں، بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نیک کام کررہے ہیں، اس لئے کہ یہ ضرورت مند تھا۔ ہم نے اس کی ضرورت پوری کردی۔ اس کا کام کردیا۔ یہ تو باعثِ ثواب کام ہے، حالانکہ اگر آپ اس کے کیریکٹر سے واقف نہیں ہیں تو آپ کے لئے ایسا سرٹیفکیٹ جاری کرنا ناجائز ہے، چہ جائیکہ وہ سمجھے کہ میں ایک ثواب کا کام کررہا ہوں۔ اور کسی ایسے شخص سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ حاصل کرنا جو آپ کو نہیں جانتا، یہ بھی ناجائز ہے، گویا کہ سرٹیفکیٹ لینے والا بھی گناہ گار ہوگا، اور دینے والا بھی گناہ گار ہوگا۔

کردار معلوم کرنے کے دو طریقے

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک شخص نے کسی تیسرے شخص کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ حضرت! وہ تو بڑا اچھا آدمی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ فلاں شخص بڑے اچھے اخلاق اور کردار کا آدمی ہے، اچھا یہ بتاؤ کہ کیا کبھی تمہارا اس کے ساتھ لین دین کا معاملہ پیش آیا؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں، لین دین کا معاملہ تو کبھی پیش نہیں آیا۔ پھر آپ نے پوچھا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا؟ اس نے کہا نہیں، میں نے کبھی اس کے ساتھ سفر تو نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تمہیں کیا معلوم کہ وہ اخلاق و کردار کے اعتبار سے کیسا آدمی ہے؟

اس لئے کہ اخلاق و کردار کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے، جب انسان اس کے ساتھ لین دین کرے، اور اس میں وہ کھرا ثابت ہو، تب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کردار اچھا ہے، اور اس کے اخلاق معلوم کرنے کا دوسرا راستہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ سفر کرے۔ اس لئے کہ سفر کے اندر انسان اچھی طرح کھل کر سامنے آجاتا ہے، اس کے اخلاق، اس کا کردار، اس کے حالات، اس کے جذبات، اس کے خیالات، یہ ساری چیزیں سفر میں ظاہر ہوجاتی ہیں، لہٰذا اگر تم نے اس کے ساتھ کوئی لین دین کا معاملہ کیا ہوتا، یا اس کے ساتھ سفر کیا ہوتا، تب تو بیشک یہ کہنا درست ہوتا کہ وہ اچھا آدمی ہے، لیکن جب تم

نے اس کے ساتھ نہ تو معاملہ کیا، نہ اس کے ساتھ سفر کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کو جانتے نہیں ہو، اور جب تم جانتے نہیں تو پھر خاموش رہو، نہ برا کہو، اور نہ اچھا کہو، اور اگر کوئی شخص اس کے بارے میں پوچھے تو تم اس حد تک بتادو، جتنا تمہیں معلوم ہے، مثلاً یہ کہہ دو کہ بھائی! مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے تو میں نے دیکھا ہے، باقی آگے کے حالات مجھے معلوم نہیں۔

سرٹیفکیٹ شرعاً ایک گواہی ہے

قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾(۱)

یاد رکھئے! یہ سرٹیفکیٹ اور یہ تصدیق نامہ شرعاً ایک گواہی ہے، اور جو شخص اس سرٹیفکیٹ پر دستخط کر رہا ہے، وہ حقیقت میں گواہی دے رہا ہے اور اس آیت کی رو سے گواہی دینا اس وقت جائز ہے جب آدمی کو اس بات کا علم ہو، اور یقین سے جانتا ہو کہ یہ واقع میں ایسا ہے، تب انسان گواہی دے سکتا ہے، اس کے بغیر انسان گواہی نہیں دے سکتا۔ آج کل ہوتا یہ ہے کہ آپ کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، لیکن آپ نے کیریکٹر سرٹیفکیٹ جاری کر دیا، تو یہ جھوٹی گواہی کا گناہ ہوا، اور جھوٹی گواہی اتنی بری چیز ہے کہ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اس کو شرک کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا۔

جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ کیا میں تم کو بتاؤں کہ بڑے بڑے گناہ کون کون سے ہیں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ضرور بتائیے۔ آپ نے فرمایا کہ بڑے گناہ یہ ہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا۔ اس وقت تک آپ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ پھر آپ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، اور پھر فرمایا کہ جھوٹی گواہی دینا، اور اس جملے کو تین مرتبہ دہرایا۔ (۲)

اب آپ اس سے اس کی شناعت کا اندازہ لگائیں کہ ایک طرف تو آپ نے اس کو شرک کے

---

(۱) الزخرف: ۸۶، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''ہاں البتہ جن لوگوں نے حق بات کی گواہی دی ہو، اور انہیں اس کا علم بھی ہو''

(۲) صحيح البخاري، كتاب الشهادات، باب ما قيل في شهادة الزور، رقم: ٢٤٦٥، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان الكبائر وأكبرها، رقم: ١٢٦، سنن الترمذي، كتاب البر والصلة والآداب، باب ما جاء في حقوق الوالدين، رقم: ١٨٢٣، مسند أحمد، رقم: ١٥٤٦٥

ساتھ ملا کر ذکر فرمایا، دوسرے یہ کہ اس کو تین مرتبہ ان الفاظ کو اس طرح دہرایا کہ پہلے آپ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، پھر اس کے بیان کے وقت سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، اور خود قرآن کریم نے بھی اس کو شرک کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾(۱)

یعنی تم بت پرستی کی گندگی سے بھی بچو، اور جھوٹی بات سے بچو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹی بات اور جھوٹی گواہی کتنی خطرناک چیز ہے۔

سرٹیفکیٹ جاری کرنے والا گناہ گار ہوگا

جھوٹی گواہی دینا جھوٹ بولنے سے بھی زیادہ شنیع اور خطرناک ہے۔ اس لئے کہ اس میں کئی گناہ مل جاتے ہیں، مثلاً ایک جھوٹ بولنے کا گناہ، اور دوسرا دوسرے شخص کو گمراہ کرنے کا گناہ، اس لئے کہ جب آپ نے غلط سرٹیفکیٹ جاری کر کے جھوٹی گواہی دی، اور وہ جھوٹا سرٹیفکیٹ جب دوسرے شخص کے پاس پہنچا تو وہ یہ سمجھے گا کہ یہ آدمی بڑا اچھا ہے، اور اچھا سمجھ کر اس سے کوئی معاملہ کرے گا، اور اگر اس معاملہ کرنے کے نتیجے میں اس کو کوئی نقصان پہنچے گا تو اس نقصان کی ذمہ داری بھی آپ پر ہوگی، یا آپ نے عدالت میں جھوٹی گواہی دی، اور اس گواہی کی بنیاد پر فیصلہ ہوگیا، تو اس فیصلے کے نتیجے میں جو کچھ کسی کا نقصان ہوا، وہ سب آپ کی گردن پر ہوگا۔ اس لئے یہ جھوٹی گواہی کا گناہ معمولی گناہ نہیں ہے، بڑا سخت گناہ ہے۔

عدالت میں جھوٹ کی وبا

آج کل تو جھوٹ کا ایسا بازار گرم ہوا کہ کوئی شخص دوسری جگہ جھوٹ بولے یا نہ بولے، لیکن عدالت میں ضرور جھوٹ بولے گا۔ بعض لوگوں کو یہاں تک کہتے ہوئے سنا:

''میاں! سچی سچی بات کہہ دو کوئی عدالت میں تھوڑی کھڑے ہو''

مطلب یہ ہے کہ جھوٹ بولنے کی جگہ تو عدالت ہے۔ وہاں پر جا کر جھوٹ بولنا، یہاں آپس میں جب بات چیت ہو رہی ہے تو سچی سچی بات بتا دو، حالانکہ عدالت میں جا کر جھوٹی گواہی دینے کو حضور اقدس ﷺ نے شرک کے برابر قرار دیا ہے، اور یہ کئی گناہوں کا مجموعہ ہے۔

---

(۱) الحج: ۳۰

مدرسہ کی تصدیق گواہی ہے

لہٰذا جتنے سرٹیفکیٹ معلومات کے بغیر جاری کیے جا رہے ہیں، اور جاری کرنے والا یہ جانتے ہوئے جاری کر رہا ہے کہ میں یہ غلط سرٹیفکیٹ جاری کر رہا ہوں، مثلاً کسی کے بیمار ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا، یا کسی کے پاس ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا، یا کسی کو کیریٹر سرٹیفکیٹ دے دیا، یہ سب جھوٹی گواہی کے اندر داخل ہیں۔

میرے پاس بہت سے لوگ مدارس کی تصدیق کرانے کے لئے آتے ہیں، جس میں اس بات کی تصدیق کرنی ہوتی ہے کہ یہ مدرسہ قائم ہے، اس میں اتنی تعلیم ہوتی ہے۔ اور اس تصدیق کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اطمینان ہو جائے کہ واقعۃً یہ مدرسہ قائم ہے۔ اور امداد کا مستحق ہے، اور اب ان مدرسوں کی تصدیق لکھنے کو دل بھی چاہتا ہے، لیکن میں نے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کو دیکھا کہ جب کبھی ان کے پاس کوئی شخص مدرسہ کی تصدیق لکھوانے کے لئے آتا تھا تو آپ یہ عذر فرماتے ہوئے کہتے کہ بھائی! یہ ایک گواہی ہے، اور جب تک مجھے مدرسہ کے حالات کا علم نہ ہو، اس وقت تک میں یہ تصدیق نامہ جاری نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یہ جھوٹی گواہی ہو جائے گی، البتہ اگر کسی مدرسے کے بارے میں علم ہوتا تو جتنا علم ہوتا اتنا لکھ دیتے۔

کتاب کی تقریظ لکھنا گواہی ہے

بہت سے لوگ کتابوں پر تقریظ لکھوانے آجاتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب لکھی ہے، آپ اس پر تقریظ لکھ دیجئے کہ یہ اچھی کتاب ہے، اور صحیح کتاب ہے۔ حالانکہ جب تک انسان اس کتاب کو پورا نہ پڑھے، اس کا پورا مطالعہ نہ کرے، اس وقت تک یہ کیسے گواہی دیدے کہ یہ کتاب صحیح ہے، یا غلط ہے۔

بہت سے لوگ اس خیال سے تقریظ لکھ دیتے ہیں کہ اس تقریظ سے اس کا فائدہ اور بھلا ہو جائے گا، حالانکہ تقریظ لکھنا ایک گواہی ہے، اور اس گواہی میں غلط بیانی کو لوگوں نے غلط بیانی سے خارج کر دیا ہے چنانچہ لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ہم تو ایک ذرا سا کام لے کر ان کے پاس گئے تھے، اگر ذرا سا قلم ہلا دیتے، اور ایک سرٹیفکیٹ لکھ دیتے تو ان کا کیا بگڑ جاتا، یہ تو بڑے بد اخلاق آدمی ہیں، کہ کسی کو سرٹیفکیٹ بھی جاری نہیں کرتے۔ بھائی، بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک ایک لفظ کے بارے میں سوال ہوگا، جو لفظ زبان سے نکل رہا ہے، جو لفظ قلم سے لکھا جا رہا ہے، سب اللہ تعالیٰ کے یہاں ریکارڈ ہو رہا ہے، اور اس کے بارے میں سوال ہوگا کہ فلاں لفظ تم نے جو زبان سے نکالا تھا، وہ کس بنیاد پر نکالا تھا، جان بوجھ کر بولا تھا، یا بھول کر بولا تھا۔

بھائی! ہمارے معاشرے میں جو جھوٹ کی وبا پھیل گئی ہے، اس میں اچھے خاصے دیندار، پڑھے لکھے، نمازی، بزرگوں سے تعلق رکھنے والے، وظائف اور تسبیح پڑھنے والے بھی مبتلا ہیں، وہ بھی اس کو ناجائز اور برا نہیں سمجھتے کہ یہ جھوٹا سرٹیفکیٹ جاری ہو جائے گا تو یہ کوئی گناہ ہوگا، حالانکہ حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے یہ جو فرمایا کہ "اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ" (وہ شخص منافق ہے جو بات بات پر جھوٹ بولے) اس میں یہ سب باتیں بھی داخل ہیں، اور یہ سب دین کا حصہ ہیں، اور ان کو دین سے خارج سمجھنا بدترین گمراہی ہے، اس لئے ان سے اجتناب ضروری ہے۔

جھوٹ کی اجازت کے مواقع

البتہ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے جھوٹ کی بھی اجازت دے دی ہے، لیکن وہ مواقع ایسے ہیں کہ جہاں انسان اپنی جان بچانے کے لئے جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جائے، اور جان بچانے کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ ہو، یا کوئی نا قابلِ برداشت ظلم اور تکلیف کا اندیشہ ہو، کہ اگر وہ جھوٹ نہیں بولے گا تو وہ ایسے ظلم کا شکار ہو جائے گا جو قابلِ برداشت نہیں ہے، اس صورت میں شریعت نے جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے۔ البتہ اس میں بھی حکم یہ ہے کہ پہلے اس بات کی کوشش کرو کہ صریح جھوٹ نہ بولنا پڑے، بلکہ کوئی ایسا گول مول لفظ بول دو، جس سے وقتی مصیبت ٹل جائے، جس کو شریعت کی اصطلاح میں "تعریض اور توریہ" کہا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا لفظ بول دیا جائے، جس کے ظاہری طور پر کچھ اور معنی سمجھ میں آرہے ہیں، اور حقیقت میں دل کے اندر آپ نے کچھ اور مراد لیا ہے، ایسا گول مول لفظ بول دو تا کہ صریح جھوٹ نہ بولنا پڑے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جھوٹ سے اجتناب

ہجرت کے موقع پر جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس ﷺ کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت فرما رہے تھے۔ تو اس وقت مکہ والوں نے آپ کو پکڑنے کے لئے چاروں طرف اپنے ہرکارے دوڑا رکھے تھے۔ اور یہ اعلان کر رکھا تھا کہ جو شخص حضورِ اقدس ﷺ کو پکڑ کر لائے گا اس کو سو اُونٹ انعام کے طور پر دیئے جائیں گے۔ اب اس وقت سارے مکہ کے لوگ آپ کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ راستے میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا جاننے والا ایک شخص مل گیا۔ وہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جانتا تھا، مگر حضورِ اقدس ﷺ کو نہیں جانتا تھا۔ اس شخص نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ تمہارے ساتھ کون صاحب ہیں؟ اب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یہ چاہتے تھے کہ آپ کے بارے میں کسی کو پتہ نہ چلے اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمنوں تک آپ کے بارے میں اطلاع پہنچ جائے۔ اب

اگر اس شخص کے جواب میں صحیح بات بتاتے ہیں تو آپ ﷺ کی جان کو خطرہ ہے، اور اگر نہیں بتاتے تو جھوٹ بولنا لازم آتا ہے۔ اب ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کی رہنمائی فرماتے ہیں۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

"هٰذَا الرَّجُلُ يَهْدِيْنِي السَّبِيْلَ"

''یہ میرے رہنما ہیں، جو مجھے راستہ دکھاتے ہیں''(۱)

آپ نے ایسا لفظ ادا کیا جس کو سن کر اس شخص کے دل میں خیال آیا کہ جس طرح عام طور پر سفر کے دوران راستہ بتانے کے لئے کوئی رہنما ساتھ رکھ لیتے ہیں، اس قسم کے رہنما ساتھ جارہے ہیں، لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دل میں یہ مراد لیا کہ یہ دین کا راستہ دکھانے والے ہیں، جنت کا راستہ دکھانے والے ہیں، اللہ کا راستہ دکھانے والے ہیں اب دیکھئے کہ اس موقع پر انہوں نے صریح جھوٹ بولنے سے پرہیز فرمایا۔ بلکہ ایسا لفظ بول دیا جس سے وقتی کام بھی نکل گیا، اور جھوٹ بھی نہیں بولنا پڑا۔

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ یہ فکر عطا فرمادیتے ہیں کہ زبان سے کوئی کلمہ خلافِ واقعہ اور جھوٹ نہ نکلے، پھر اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح مدد بھی فرماتے ہیں۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور جھوٹ سے پرہیز

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ، جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریزوں کے خلاف جہاد میں بڑا حصہ لیا تھا، آپ کے علاوہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی وغیرہ ان سب حضرات نے اس جہاد میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے، اب جو لوگ اس جہاد میں شریک تھے، آخر کار انگریزوں نے ان کو پکڑنا شروع کیا۔ چوراہوں پر پھانسی کے تختے لٹکادیئے۔

جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی صاحبِ دار ہے

اور ہر ہر محلے میں مجسٹریٹوں کی مصنوعی عدالتیں قائم کردی تھیں، جہاں کہیں کسی پر شبہ ہوا، اس کو مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا، اور اس نے حکم جاری کردیا کہ اس کو پھانسی پر چڑھادو، پھانسی پر اس کو لٹکادیا گیا۔ اسی دوران ایک مقدمہ میرٹھ میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف بھی قائم ہوگیا۔ اور مجسٹریٹ کے یہاں پیشی ہوگئی۔ جب مجسٹریٹ کے پاس پہنچے تو اس نے پوچھا کہ تمہارے پاس ہتھیار

(۱) صحيح البخاري، كتاب المناقب، باب هجرة النبي وأصحابه إلى المدينة، رقم: ٣٦٢١، مسند أحمد، رقم: ١١٦١٥

ہیں؟ اس لئے کہ اطلاع یہ ملی تھی کہ ان کے پاس بندوقیں ہیں، اور حقیقت میں حضرت کے پاس بندوقیں تھیں، چنانچہ جس وقت مجسٹریٹ نے یہ سوال کیا، اس وقت حضرت کے ہاتھ میں تسبیح تھی، آپ نے وہ تسبیح اس کو دکھاتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا ہتھیار یہ ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ میرے پاس ہتھیار نہیں ہے، اس لئے کہ یہ جھوٹ ہو جاتا آپ کا حلیہ بھی ایسا تھا کہ بالکل درویش صفت معلوم ہوتے تھے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مدد بھی فرماتے ہیں، ابھی سوال جواب ہو رہا تھا کہ اتنے میں کوئی دیہاتی وہاں آ گیا۔ اس نے جب دیکھا کہ حضرت سے اس طرح سوال جواب ہو رہے ہیں تو اس نے کہا کہ ارے! اس کو کہاں سے پکڑ لائے، یہ تو ہمارے محلے کا موجن (مؤذن) ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو خلاصی عطا فرمائی۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور جھوٹ سے پرہیز

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے ہیں، چاروں طرف پولیس تلاش کرتی پھر رہی ہے اور آپ چھتہ کی مسجد میں تشریف فرما ہیں، وہاں پولیس پہنچ گئی، مسجد کے اندر آپ اکیلے تھے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کا نام سن کر ذہنوں میں تصور آتا تھا کہ آپ بہت بڑے عالم ہیں تو آپ شاندار قسم کے لباس اور جبہ قبہ پہنے ہونگے، وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ آپ تو ہر وقت ایک معمولی لنگی ایک معمولی کرتہ پہنے ہوتے تھے جب پولیس اندر داخل ہوئی تو یہ سمجھا کہ یہ مسجد کا کوئی خادم ہے۔ چنانچہ پولیس نے پوچھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب کہاں ہیں؟ آپ فوراً اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے، اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو یہاں تھے، اور اس کے ذریعہ اس کو یہ تاثر دیا کہ اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں۔ لیکن زبان سے یہ جھوٹا کلمہ نہیں نکالا کہ یہاں نہیں ہیں، چنانچہ وہ پولیس واپس چلی گئی۔

اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے وقت میں بھی، جب کہ جان پر بنی ہوئی ہو، اس وقت بھی یہ خیال رہتا ہے کہ زبان سے کوئی غلط لفظ نہ نکلے۔ زبان سے صریح جھوٹ نہ نکلے، اور اگر کبھی مشکل وقت آ جائے تو اس وقت بھی توریہ کر کے اور گول مول بات کر کے کام چل جائے، یہ بہتر ہے۔ البتہ اگر جان پر بن جائے، جان جانے کا خطرہ ہو، یا شدید ناقابل برداشت ظلم کا اندیشہ ہو، اور توریہ سے اور گول مول بات کرنے سے بھی بات نہ بنے تو اس وقت شریعت نے جھوٹ بولنے کی بھی اجازت دیدی ہے، لیکن اس اجازت کو اتنی کثرت کے ساتھ استعمال کرنا، جس طرح آج اس کا استعمال ہو رہا ہے، یہ سب حرام ہے، اور اس میں جھوٹی گواہی کا گناہ ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

بچوں کے دلوں میں جھوٹ کی نفرت

بچوں کے دل میں جھوٹ کی نفرت پیدا کریں، خود بھی شروع سے جھوٹ سے بچنے کی عادت ڈالیں۔ اور بچوں سے اس طرح بات کریں کہ ان کے دلوں میں بھی جھوٹ کی نفرت پیدا ہو جائے، اور سچائی کی محبت پیدا ہو، اس لئے بچوں کے سامنے کبھی غلط بات کوئی جھوٹ نہ بولیں، اس لئے کہ جب بچہ یہ دیکھتا ہے کہ باپ جھوٹ بول رہا ہے، ماں جھوٹ بول رہی ہے تو پھر بچے کے دل سے جھوٹ بولنے کی نفرت ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ جھوٹ بولنا تو روزانہ کا معمول ہے، اس لئے بچپن ہی سے بچوں میں اس بات کی عادت ڈالی جائے کہ زبان سے جو بات نکلے، وہ پتھر کی لکیر ہو، اس میں کوئی غلطی نہ ہو، اور نفس الامر کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔ دیکھئے، نبوت کے بعد سب سے اُونچا مقام ''صدیق'' کا مقام ہے۔ اور ''صدیق'' کے معنی ہیں ''بہت سچا'' جس کے قول میں خلافِ واقعہ بات کا شبہ بھی نہ ہو۔

جھوٹ عمل سے بھی ہوتا ہے

جھوٹ جس طرح زبان سے ہوتا ہے، بعض اوقات عمل سے بھی ہوتا ہے، اس لئے کہ بعض اوقات انسان ایسا عمل کرتا ہے، جو درحقیقت جھوٹا عمل ہوتا ہے۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْمُتَشَبِّعُ بِمَا لَمْ يُعْطَ كَلَابِسِ ثَوْبَىْ زُوْرٍ))(۱)

''جو شخص اپنے عمل سے اپنے آپ کو ایسی چیز کا حامل قرار دے جو اس کے اندر نہیں ہے تو وہ جھوٹ کا لباس پہننے والا ہے''

مطلب اس کا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل سے اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرے جیسا کہ حقیقت میں نہیں ہے۔ یہ بھی گناہ ہے۔ مثلاً ایک شخص جو حقیقت میں بہت دولت مند نہیں ہے، لیکن وہ اپنے آپ کو اپنی اداؤں سے، اپنی نشست و برخاست سے، اپنے طریقِ زندگی سے اپنے آپ کو دولت مند ظاہر کرتا ہے، یہ بھی عملی جھوٹ ہے، یا اس کے برعکس ایک اچھا خاصا کھاتا پیتا انسان ہے۔ لیکن اپنے عمل سے تکلف کر کے اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرتا ہے، تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے،

(۱) صحيح البخارى، كتاب النكاح، باب المتشبع بما ينل وما ينهى من افتخاره الضرّة، رقم: ٤٨١٨، صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب النهى التزوير فى اللباس وغيره، رقم: ٣٩٧٢، سنن أبى داؤد، كتاب الأدب، باب فى المتشبع بما لم يعط، رقم: ٤٣٤٥، مسند أحمد، رقم: ٢٤١٧٥

یہ بہت مفلس ہے، نادار ہے، غریب ہے، حالانکہ حقیقت میں وہ غریب نہیں ہے، اس کو بھی نبی کریم ﷺ نے عملی جھوٹ قرار دیا لہٰذا عملی طور پر کوئی ایسا کام کرنا جس سے دوسرے شخص پر غلط تاثر قائم ہو، یہ بھی جھوٹ کے اندر داخل ہے۔

اپنے نام کے ساتھ ''سیّد'' لکھنا

بہت سے لوگ اپنے ناموں کے ساتھ ایسے الفاظ اور القاب لکھتے ہیں جو واقعہ کے مطابق نہیں ہوتے، چونکہ رواج چل پڑا ہے، اس لئے بلا تحقیق لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً کسی شخص نے اپنے نام کے ساتھ ''سیّد'' لکھنا شروع کر دیا۔ جبکہ حقیقت میں ''سیّد'' نہیں ہے، اس لئے کہ حقیقت میں ''سیّد'' وہ ہے جو باپ کی طرف سے نسب کے اعتبار سے نبی کریم ﷺ کی اولاد میں ہو، وہ ''سیّد'' ہے، بعض لوگ ماں کی طرف سے نبی کریم ﷺ کی اولاد میں سے ہوتے ہیں، اور اپنے آپ کو ''سیّد'' لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ لہٰذا جب تک ''سیّد'' ہونے کی تحقیق نہ ہو، اس وقت تک ''سیّد'' لکھنا جائز نہیں، البتہ تحقیق کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ اگر خاندان میں یہ بات مشہور چلی آتی ہے کہ یہ سادات کے خاندان میں ہیں تو پھر ''سیّد'' لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر ''سیّد'' ہونا معلوم نہیں ہے، اور نہ اس کی دلیل موجود ہے، تو اس میں بھی جھوٹ بولنے کا گناہ ہے۔

نام کے ساتھ ''پروفیسر'' یا ''مولانا'' لکھنا

بعض لوگ حقیقت میں ''پروفیسر'' نہیں ہیں، لیکن اپنے نام کے ساتھ ''پروفیسر'' لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ''پروفیسر'' تو ایک خاص اصطلاح ہے، جو خاص لوگوں کے لئے بولی جاتی ہے۔ یا جیسے ''عالم'' یا ''مولانا'' کا لفظ اس شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے جو درسِ نظامی کا فارغ التحصیل ہو۔ اور با قاعدہ اس نے کسی سے علم حاصل کیا ہو۔ اس کے لئے ''مولانا'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اب بہت سے لوگ جنہوں نے با قاعدہ علم حاصل نہیں کیا، لیکن اپنے نام کے ساتھ ''مولانا'' لکھنا شروع کر دیتے ہیں، یہ بھی خلافِ واقعہ ہے، اور جھوٹ ہے ان باتوں کو ہم لوگ جھوٹ نہیں سمجھتے، اور ہم یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بھی گناہ کے کام ہیں۔ اس لئے ان سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

خیانت
اور
اس کی مروجہ صورتیں ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ)) فِيْ رِوَايَةٍ((وَإِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ))(۱)

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے منافق کی تین نشانیاں بیان فرمائیں ہیں، اور اشارہ اس بات کی طرف فرمادیا کہ یہ تین کام مؤمن کے کام نہیں ہیں، اور جس میں یہ تین باتیں پائی جائیں، وہ صحیح معنی میں مسلمان اور مؤمن کہلانے کا مستحق نہیں ان میں سے دو کا بیان پچھلے دو جمعوں میں الحمدللہ قدرے تفصیل کے ساتھ ہوگیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

امانت داری کی تاکید

منافق کی تیسری علامت جو بیان فرمائی، وہ ہے ''امانت میں خیانت'' یعنی مسلمان کا کام نہیں ہے کہ وہ امانت میں خیانت کرے، بلکہ یہ منافق کا کام ہے۔ بہت سی آیات اور احادیث میں امانت پر زور دیا گیا ہے، اور امانت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

☆ اصلاحی خطبات (۳/۱۷۴ تا ۱۹۵)، ۱۳ دسمبر ۱۹۹۱ء، بروز جمعہ، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) صحيح البخاری، كتاب الإيمان، باب علامة المنافق، رقم: ۳۲، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان خصال المنافق، رقم: ۸۹، سنن الترمذی، كتاب الإيمان عن رسول الله، باب ما جاء فی علامة المنافق، رقم: ۲۵۵۵، مسند أحمد، رقم: ۸۳۳۱

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلٰى أَهْلِهَا﴾(۱)
یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ امانتوں کو ان کے اہل تک اور ان کے مستحقین تک پہنچاؤ،
اور اس کی اتنی تاکید فرمائی گئی ہے کہ ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:
((لَا إِيْمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ))(۲)
''جس کے اندر امانت نہیں، اس کے اندر ایمان بھی نہیں''
گویا کہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ آدمی امین ہو۔ امانت میں خیانت نہ کرتا ہو۔

اسلام میں امانت کا تصور

لیکن آج کی مجلس میں جس بات کی طرف توجہ دلانی ہے، وہ یہ ہے کہ ہم لوگوں نے ان تمام چیزوں کا مطلب اور مفہوم بہت محدود سمجھا ہوا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں امانت کا صرف اتنا تصور ہے کہ کوئی شخص پیسے لے کر آئے۔ اور یہ کہے کہ یہ پیسے آپ بطور امانت اپنے پاس رکھ لیجئے۔ جب ضرورت ہوگی اس وقت میں آپ سے واپس لے لوں گا۔ تو یہ امانت ہے۔ اور اگر کوئی شخص امانت میں خیانت کرتے ہوئے ان پیسوں کو کھا کر ختم کردے۔ یا جب وہ شخص اپنے پیسے مانگنے آئے تو اس کو دینے سے انکار کردے تو یہ خیانت ہوئی۔ ہمارے ذہنوں میں امانت اور خیانت کا بس اتنا ہی تصور ہے۔ اس سے آگے نہیں ہے۔ بیشک یہ بھی امانت میں خیانت کا حصہ ہے۔ لیکن قرآن و حدیث کی اصطلاح میں ''امانت'' اس حد تک محدود نہیں، بلکہ ''امانت'' کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اور بہت ساری چیزیں امانت میں داخل ہیں، جن کے بارے میں اکثر و بیشتر ہمارے ذہنوں میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ بھی امانت ہے۔ اور اس کے ساتھ ''امانت'' جیسا سلوک کرنا چاہئے۔

امانت کے معنی

عربی زبان میں ''امانت'' کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص پر کسی معاملے میں بھروسہ کرنا۔ لہٰذا ہر وہ چیز جو دوسرے کو اس طرح سپرد کی گئی ہو، کہ سپرد کرنے والے نے اس پر بھروسہ کیا ہو کہ یہ اس کا حق ادا کرے گا، یہ ہے امانت کی حقیقت، لہٰذا کوئی شخص کوئی کام یا کوئی چیز یا کوئی مال جو دوسرے کے سپرد کرے، اور سپرد کرنے والا اس بھروسے پر سپرد کرے کہ یہ شخص اس سلسلے میں اپنے فریضے کو صحیح طور پر بجالائے گا، اور اس میں کوتاہی نہیں کرے گا، یہ امانت ہے۔ لہٰذا ''امانت'' کی اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو بیشمار چیزیں اس میں داخل ہو جاتی ہیں۔

(۱) النساء: ۵۸ (۲) مسند أحمد، رقم: ۱۱۹۳۵

یومِ الست میں اقرار

اللہ تعالیٰ نے ''یومِ الست'' میں انسانوں سے جو عہد لیا تھا کہ میں تمہارا پروردگار ہوں یا نہیں؟ اور تم میری اطاعت کرو گے یا نہیں؟ تمام انسانوں نے اقرار کیا کہ ہم آپ کی اطاعت کریں گے، اس عہد کو قرآن کریم نے سورۃ احزاب کے آخری رکوع میں امانت سے تعبیر فرمایا ہے، فرمایا:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوماً جَهُولاً﴾(۱)

یعنی ہم نے زمین پر امانت پیش کی، اور اس سے پوچھا کہ تم اس امانت کے بوجھ کو اُٹھاؤ گی؟ تو اس نے اس امانت کے اُٹھانے سے انکار کر دیا۔ پھر آسمانوں پر پیش کی کہ تم یہ امانت اُٹھاؤ گے؟ انہوں نے بھی انکار کر دیا، اور پھر پہاڑوں پر یہ امانت پیش کی کہ تم اس امانت کے بوجھ کو اُٹھاؤ گے؟ انہوں نے بھی اس امانت کو اُٹھانے سے انکار کر دیا۔ سب اس امانت کو اُٹھانے سے ڈر گئے۔ لیکن جب یہ امانت اس حضرت انسان پر پیش کی گئی تو یہ بڑے بہادر بن کر آگے بڑھ کر اقرار کر لیا کہ میں اس امانت کو اُٹھاؤں گا۔ چنانچہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ انسان بڑا ظالم اور جاہل تھا کہ اتنے بڑے بوجھ کو اُٹھانے کے لئے آگے بڑھ گیا، اور یہ نہ سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس امانت کے بوجھ کو اُٹھانے سے عاجز رہ جاؤں، جس کی وجہ سے میرا انجام خراب ہو جائے۔

یہ زندگی اللہ کی امانت ہے

بہر حال، اس بوجھ کو اللہ تعالیٰ نے ''امانت'' کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ یہ امانت کیا چیز تھی جو انسان پر پیش کی جا رہی تھی؟ چنانچہ مفسرین نے فرمایا کہ یہاں امانت کے معنی یہ ہیں کہ اس انسان سے یہ کہا جا رہا تھا کہ تمہیں ایک زندگی دی جائے گی، اور اس میں تمہیں اچھے کام کرنے کا بھی اختیار دیا جائے گا، اور برے کام کرنے کا بھی، اور جب اچھے کام کرو گے تو ہماری خوشنودی حاصل ہو گی، جنت کی ابدی اور دائمی نعمتیں تمہیں حاصل ہوں گی۔ اور اگر برے کام کرو گے تو اس کے نتیجے میں تم پر ہمارا غضب ہو گا، اور جہنم کا ابدی عذاب تم پر ہو گا، اب بتاؤ تمہیں ایسی زندگی منظور ہے یا نہیں؟ چنانچہ اور سب نے انکار کر دیا، لیکن انسان اس کے لئے تیار ہو گیا۔ حافظ شیرازی اسی کو بیان فرماتے ہیں کہ ؎

آسمان بار امانت نتوانست کشید
قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

(۱) الأحزاب: ۷۲

یعنی آسمان سے تو یہ بوجھ نہیں اُٹھا، اس نے تو انکار کر دیا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے، لیکن یہ حضرت انسان، مشت استخوان نے یہ بوجھ اُٹھالیا، اور قرعۂ فال میرے نام پر پڑ گیا۔ بہر حال! قرآن کریم نے اس کو "امانت" سے تعبیر فرمایا ہے۔

یہ جسم ایک امانت ہے

یہ پوری زندگی ہمارے پاس امانت ہے اور اس امانت کا تقاضا یہ ہے کہ اس زندگی کو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق گزار دیں، لہٰذا سب سے بڑی امانت جو ہر انسان کے پاس ہے، جس سے کوئی انسان بھی مستثنیٰ نہیں ہے، وہ امانت خود اس کا "وجود" اور اس کی "زندگی" اور اس کے اعضاء و جوارح، اس کے اوقات، اس کی توانائیاں ہیں، یہ سب کی سب امانت ہیں۔ کیا کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنے اس ہاتھ کا مالک ہو، یہ آنکھ جو مجھے ملی ہوئی ہے، میں اس کا مالک ہوں، ایسا نہیں، بلکہ یہ سارے اعضا ہمارے پاس امانت ہیں، ہم اس کے مالک نہیں ہیں کہ جس طرح چاہیں ان کو استعمال کریں، بلکہ اعضا کی یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں استعمال کے لئے عطا فرمائی ہیں۔ لہٰذا اس امانت کا تقاضا یہ ہے کہ ان اعضا کو، اپنے اس وجود کو، اپنی صلاحیتوں کو اور اپنی توانائیوں کو اسی کام میں صرف کریں، جس کام کے لئے یہ دی گئی ہیں، اس کے علاوہ دوسرے کاموں میں صرف کریں گے تو یہ امانت میں خیانت ہوگی۔

آنکھ ایک امانت ہے

مثلاً آنکھ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو اس نے ہمیں عطا فرمائی ہے اور یہ ایسی نعمت ہے کہ ساری دنیا کی مال و دولت خرچ کر کے اس کو حاصل کرنا چاہے تو حاصل نہیں ہو سکتی، لیکن اس کی قدر اس لئے نہیں ہے کہ پیدائش کے وقت سے یہ سرکاری مشین لگی ہوئی ہے، اور کام کر رہی ہے۔ اس کے حاصل کرنے میں نہ تو کوئی پیسہ لگا ہے، اور نہ محنت کرنی پڑی ہے، لیکن جس دن خدا نہ کرے اس آنکھ کی بینائی پر ادنیٰ سا نقص آجائے، اور اس بات کا اندیشہ ہو کہ کہیں میری یہ بینائی نہ چلی جائے، اس وقت اس کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے، اور اس وقت آدمی ساری دولت ایک آنکھ کی بینائی کے لئے خرچ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اور یہ ایسی سرکاری مشین ہے کہ نہ اس کی سروس کی ضرورت ہے، نہ اس کی اوور ہالنگ کی ضرورت۔ نہ اس کا ماہانہ خرچ، نہ ٹیکس، نہ کرایہ، بلکہ مفت ملی ہوئی ہے۔

لیکن یہ مشین اللہ تعالیٰ نے بطور امانت کے دے رکھی ہے، اور یہ فرما دیا ہے کہ اس مشین کو استعمال کرو، اس کے ذریعہ دنیا کو دیکھو، دنیا کا نظارہ کرو، دنیا کے مناظر سے لطف اُٹھاؤ، سب کچھ کرو،

لیکن صرف چند چیزوں کو دیکھنے سے منع کردیا کہ اس سرکاری مشین کو ان کاموں میں استعمال نہ کریں، مثلاً حکم دے دیا کہ اس کے ذریعہ نامحرم پر نگاہ نہ ڈالی جائے۔ اب اگر اس کے ذریعہ ہم نے نامحرم کی طرف نگاہ ڈالی تو یہ اللہ تعالیٰ کی امانت میں خیانت ہوئی۔ اسی لئے قرآن کریم نے نامحرم کی طرف نگاہ کرنے کو خیانت سے تعبیر فرمایا، چنانچہ فرمایا:

﴿يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ﴾ (۱)

یعنی آنکھوں کی خیانت کو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ تم نے اس کو ایسی جگہ استعمال کیا جہاں استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا تھا۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ کسی شخص نے دوسرے کے پاس اپنا مال بطور امانت رکھوایا، اور اب وہ چوری چھپے آنکھ بچا کر اس کا مال استعمال کرنا چاہتا ہے، وہی معاملہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کے ساتھ بھی کرتا ہے، اور بیوقوف کو یہ پتہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی عمل چھپ نہیں سکتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کی خیانت کو بہت بڑا گناہ اور جرم قرار دیا، اور نبی کریم ﷺ نے اس پر وعیدیں بیان فرمائیں۔

اور اگر آنکھ کی اس امانت اور نعمت کو صحیح جگہ استعمال کرو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر ایک شخص باہر سے گھر کے اندر داخل ہوا، اور اس نے اپنی بیوی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا، اور بیوی نے شوہر کو محبت کی نگاہ سے دیکھا تو اس وقت اللہ تعالیٰ دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس لئے کہ اس نے اس امانت کو صحیح جگہ پر استعمال کیا، اگرچہ اپنی ذاتی لذت کے لئے اپنے فائدے کے لئے کیا۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کیا، اس لئے ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہوئی۔

کان ایک امانت ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے کان سننے کے لئے عطا فرمایا ہے، اور پھر ہر چیز سننے کی اجازت دیدی، صرف چند چیزوں پر پابندی گادی کہ تم گانا بجانا مت سننا، موسیقی مت سننا، غیبت مت سننا، غلط اور جھوٹی باتیں مت سننا، لہٰذا اگر کان ان چیزوں کے سننے میں استعمال ہو رہا ہے تو یہ امانت میں خیانت ہے۔

زبان ایک امانت ہے

''زبان'' اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی نعمت ہے جو پیدائش کے وقت سے چل رہی ہے، اور مرتے

(۱) الغافر: ۹

دم تک چلتی رہتی ہے۔زبان کی ذرا سی حرکت سے نہ جانے کیا کیا کام انسان لے رہا ہے۔ یہ زبان اتنی بڑی نعمت ہے کہ اگر ایک مرتبہ زبان کو حرکت دے کر یہ کہہ دو:

"سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰه"

حدیث شریف میں ہے کہ اس کے ذریعہ سے میزانِ عمل کا آدھا پلڑا بھر جاتا ہے۔اس لئے اس کے ذریعہ آخرت کی تیاری کرنی چاہئے۔لیکن اگر اس زبان کو جھوٹ بولنے میں استعمال کیا، غیبت کرنے میں استعمال کیا، مسلمان کی دل آزاری کرنے میں استعمال کیا، دوسروں کو تکلیف پہنچانے میں استعمال کیا تو یہ امانت میں خیانت ہے۔

خودکشی کیوں حرام ہے؟

یہ تو صرف اعضاء کی بات تھی۔ ہمارا یہ پورا وجود، پورا جسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ جسم ہمارا اپنا ہے، لہٰذا اس کے ساتھ ہم جو چاہیں کریں۔حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ جسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔اسی لئے شریعت میں خودکشی کرنا حرام ہے۔اگر یہ جسم ہمارا اپنا ہوتا تو خودکشی کیوں حرام ہوتی۔وہ اس لئے حرام ہے کہ یہ جان، یہ جسم، یہ وجود، یہ اعضاء، حقیقت میں ہماری ملکیت نہیں ہے۔بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ملکیت ہیں۔

مثلاً یہ کتاب میری ملکیت ہے۔اب اگر میں کسی شخص سے کہوں کہ یہ کتاب تم لے جاؤ۔ میرے لئے ایسا کرنا جائز ہے۔لیکن اگر کوئی شخص دوسرے سے کہے کہ مجھے قتل کر دو، میری جان لے لو، اب اس نے قتل کرنے کی اجازت دے دی۔ اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دے دیا۔ دستخط کر دئے۔مہر بھی لگا دی۔سب کچھ کر دیا۔لیکن اس کے باوجود جس کو قتل کی اجازت دی گئی ہے، اس کے لئے قتل کرنا جائز نہیں۔کیوں؟ اس لئے کہ یہ جان اس کی ملکیت ہی نہیں ہے۔اگر اس کی ملکیت ہوتی، تب وہ دوسرے کو اس کے لینے کی اجازت دے سکتا تھا۔لہٰذا جب ملکیت نہیں، تو پھر دوسرے کو اجازت دینے کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔

گناہ کرنا خیانت ہے

اللہ تعالیٰ نے یہ پورا وجود، پوری جان، اور یہ صلاحیتیں اور توانائیاں یہ سب ہمیں امانت کے طور پر عطا فرمائی ہیں، لہٰذا اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ پوری زندگی امانت ہے، اس لئے زندگی کا کوئی کام، اور ان اعضاء سے کیا جانے والا کوئی عمل، کوئی قول، کوئی فعل ایسا نہ ہو جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس امانت میں خیانت کا سبب بنے، لہٰذا امانت کا جو محدود تصور ہمارے ذہنوں میں ہے کہ کوئی شخص آ کر

پیسے رکھوائے گا، اور ہم صندوقچی کھول کر اس میں وہ پیسے رکھیں گے، اور تالہ لگادیں گے، اب اگر ان پیسوں کو نکال کر خرچ کر لیا تو یہ خیانت ہوگی۔ امانت کا اتنا محدود تصور غلط ہے۔ بلکہ یہ پوری زندگی ایک امانت ہے۔ اور زندگی کا ایک ایک قول و فعل امانت ہے۔

لہٰذا یہ جو فرمایا کہ امانت میں خیانت کرنا نفاق کی علامت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنے بھی گناہ ہیں، چاہے وہ آنکھ کا گناہ ہو، یا کان کا گناہ ہو، یا زبان کا گناہ ہو، یا کسی اور عضو کا گناہ ہو، وہ سارے امانت میں خیانت کے اندر داخل ہیں، اور وہ مؤمن کے کام نہیں ہیں۔ بلکہ منافق کے کام ہیں۔

''عاریت'' کی چیز امانت ہے

یہ تو امانت کے بارے میں عام باتیں تھیں۔ لیکن امانت کے کچھ خاص شعبے بھی ہیں، بعض اوقات ہم ان کو امانت نہیں سمجھتے، اور امانت جیسی حفاظت نہیں کرتے۔ مثلاً ''عاریت'' کی چیز ہے، ''عاریت'' اس کو کہتے ہیں کہ ایک آدمی کو ایک چیز کی ضرورت تھی۔ وہ چیز اس کے پاس نہیں تھی۔ اس لئے اس نے وہ چیز استعمال کرنے کے لئے دوسرے سے مانگ لی کہ مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے، تھوڑی دیر کے لئے دے دو۔ اب یہ ''عاریت'' کی چیز ''امانت'' ہے۔ مثلاً میرا ایک کتاب پڑھنے کو دل چاہ رہا تھا، لیکن وہ کتاب میرے پاس نہیں تھی، اس لئے میں نے دوسرے شخص سے پڑھنے کے لئے وہ کتاب مانگ لی کہ میں پڑھ کر واپس کر دوں گا، اب یہ کتاب میرے پاس ''عاریت'' ہے، شریعت کی اصطلاح میں اس کو عاریت کہا جاتا ہے، اور یہ عاریت کی چیز امانت ہوتی ہے، لہٰذا اس لینے والے شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس چیز کو مالک کی مرضی کے خلاف استعمال کرے۔ بلکہ اسے چاہئے کہ اس عاریت کی چیز کو اس طرح استعمال نہ کرے، جس سے مالک کو تکلیف ہو، اور دوسرے یہ کہ اس کو بروقت مالک کے پاس لوٹانے کی فکر کرے۔

یہ برتن امانت ہیں

حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ نے بیشمار مواعظ میں اس بات پر تنبیہ فرمائی ہے کہ لوگ بکثرت ایسا کرتے ہیں کہ جب ان کے گھر کسی نے کھانا بھیج دیا، اس بیچارے بھیجنے والے سے یہ غلطی ہوگئی کہ اس نے آپ کے گھر کھانا بھیج دیا، اب صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ وہ کھانا تم دوسرے برتن میں نکال لو، اور وہ برتن اس کو فوراً واپس کر دو، مگر ہوتا یہ ہے کہ وہ بیچارہ کھانا بھیجنے والا برتن سے بھی محروم ہوگیا، چنانچہ وہ برتن گھر میں پڑے ہوئے ہیں، واپس پہنچانے کی فکر نہیں، بلکہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ان برتنوں کو خود اپنے استعمال میں لانے شروع کر دیئے، یہ امانت میں خیانت

ہے، اس لئے کہ وہ برتن آپ کے پاس بطور عاریت کے آئے تھے، آپ کو ان کا مالک نہیں بنایا گیا تھا، لہٰذا ان برتنوں کو استعمال کرنا، اور ان کو واپس پہنچانے کی فکر نہ کرنا امانت میں خیانت ہے۔

یہ کتاب امانت ہے

یا مثلاً آپ نے کسی سے کتاب پڑھنے کے لئے لے لی، اور کتاب پڑھ کر اس کو مالک کے پاس واپس نہیں پہنچائی یہ امانت میں خیانت ہے، حتیٰ کہ اب تو لوگوں میں یہ مقولہ بھی مشہور ہو گیا ہے کہ ''کتاب کی چوری جائز ہے'' اور جب کتاب کی چوری جائز ہوگئی تو امانت میں خیانت بطریق اولیٰ جائز ہوگی۔ اگر کسی نے کوئی کتاب پڑھنے کے لئے دے دی تو اب لوٹانے کا کوئی سوال نہیں، حالانکہ یہ سب باتیں امانت میں خیانت کے اندر داخل ہیں۔ اسی طرح جتنی عاریت کی چیزیں ہیں، جو آپ کے پاس کسی بھی طریقے سے آئی ہوں۔ ان کو حفاظت سے رکھنا، اور ان کو مالک کی مرضی کے خلاف استعمال نہ کرنا واجب اور فرض ہے، اس کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں۔

ملازمت کے اوقات امانت ہیں

اسی طرح ایک شخص نے کہیں ملازمت کر لی۔ اور ملازمت میں آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دینے کا معاہدہ ہو گیا، یہ آٹھ گھنٹے آپ نے اس کے ہاتھ فروخت کر دیئے، لہٰذا یہ آٹھ گھنٹے کے اوقات آپ کے پاس اس شخص کی امانت ہے جس کے یہاں آپ نے ملازمت کی ہے۔ لہٰذا اگر ان آٹھ گھنٹوں میں سے ایک منٹ بھی آپ نے کسی ایسے کام میں صرف کر دیا، جس میں صرف کرنے کی مالک کی طرف سے اجازت نہیں تھی، تو یہ امانت میں خیانت ہے۔ مثلاً ڈیوٹی کے اوقات میں دوست احباب ملنے کے لئے آ گئے، اب ان کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھ کر باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ وقت اس میں صرف ہو رہا ہے۔ حالانکہ یہ وقت تمہارا بکا ہوا تھا۔ تمہارے پاس امانت تھا، تم نے اس وقت کو باتوں میں اور ہنسی مذاق میں گزار دیا تو یہ امانت میں خیانت ہے۔

اب بتایئے، ہم لوگ کتنے غافل ہیں کہ جو اوقات ہمارے بکے ہوئے ہیں، ہم ان کو دوسرے کاموں میں صرف کر رہے ہیں، یہ امانت میں خیانت ہو رہی ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مہینے کے آخر میں جو تنخواہ مل رہی ہے، وہ پوری طرح حلال نہیں ہوئی، اس لئے کہ وقت پورا نہیں دیا۔

دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کا معمول

دارالعلوم دیوبند کے حضرات اساتذہ کرام کو دیکھئے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے

ذریعہ صحابہ کرام کے دور کی یادیں تازہ کرائیں، ان حضرات اساتذہ کرام کی تنخواہ دس روپے ماہانہ یا پندرہ روپے ماہانہ ہوتی تھی، لیکن چونکہ جب تنخواہ مقرر ہوگئی، اور اپنے اوقات مدرسے کے ہاتھ فروخت کر دیئے، اس لئے ان حضرات اساتذہ کا یہ معمول تھا کہ اگر مدرسے کے اوقات کے دوران مہمان یا دوست احباب ملنے کے لئے آتے تو جس وقت وہ مہمان آتے فوراً گھڑی دیکھ کر وقت نوٹ کر لیتے۔ اور پھر ان کو جلد از جلد نمٹانے کی فکر کرتے۔ اور جس وقت وہ مہمان چلے جاتے، اس وقت گھڑی دیکھ کر وقت نوٹ کر لیتے۔ پورا مہینہ اس طرح وقت نوٹ کرتے رہتے پھر جب مہینہ پورا ہو جاتا تو وہ اساتذہ باقاعدہ درخواست دیتے کہ اس ماہ کے دوران ہم نے اتنا وقت مدرسے کے کام کے علاوہ دوسرے کاموں میں صرف کیا ہے۔ لہٰذا براہِ کرم میری تنخواہ میں سے اتنے وقت کے پیسے کاٹ لیے جائیں۔ وہ حضرات اساتذہ اس لئے ایسا کرتے تھے کہ اگر ہم نے اس وقت کی تنخواہ لے لی وہ تنخواہ ہمارے لئے حرام ہوگئی۔ اس لئے واپس کر دیتے۔ آج تنخواہ لینے کے لئے تو درخواستیں دی جاتی ہیں، تنخواہ کٹوانے کے لئے درخواست دینے کا آج تصور بھی مشکل ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تنخواہ

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ، جو دار العلوم دیوبند کے پہلے طالب علم ہیں، جن کے ذریعہ دار العلوم دیوبند کا آغاز ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کو علم میں، تقویٰ میں، معرفت میں بہت اُونچا مقام بخشا تھا۔ جس زمانے میں آپ دار العلوم دیوبند میں شیخ الحدیث تھے، اس وقت آپ کی تنخواہ ماہانہ دس روپے تھی، پھر جب آپ کی عمر زیادہ ہوگئی اور تجربہ بھی زیادہ ہو گیا، تو اس وقت دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ نے یہ طے کیا کہ حضرت والا کی تنخواہ بہت کم ہے۔ جبکہ آپ کی عمر زیادہ ہوگئی ہے۔ ضروریات بھی زیادہ ہیں، مشاغل بھی زیادہ ہیں، اس لئے تنخواہ بڑھانی چاہئے۔ چنانچہ مجلس شوریٰ نے یہ طے کیا کہ اب آپ کی تنخواہ دس روپے کے بجائے پندرہ روپے ماہانہ کر دی جائے۔ جب تنخواہ تقسیم ہوئی تو حضرت والا نے دیکھا کہ اب دس کے بجائے پندرہ روپے ملے ہیں۔ حضرت والا نے پوچھا کہ یہ پندرہ روپے مجھے کیوں دیئے گئے۔ لوگوں نے بتایا کہ مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کی تنخواہ دس روپے کے بجائے پندرہ روپے کر دی جائے۔ آپ نے وہ تنخواہ لینے سے انکار کر دیا، اور دار العلوم دیوبند کے مہتمم صاحب کے نام ایک درخواست لکھی کہ حضرت! آپ نے میری تنخواہ دس روپے کے بجائے پندرہ روپے کر دی ہے۔ حالانکہ اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ پہلے تو میں نشاط کے ساتھ دو تین گھنٹے سبق پڑھا لیتا تھا، اور اب تو میں کم پڑھاتا ہوں۔ وقت کم دیتا ہوں۔ لہٰذا میری تنخواہ میں اضافے کا کوئی جواز نہیں، لہٰذا جو اضافہ آپ حضرات نے کیا ہے یہ واپس لیا جائے۔ اور میری تنخواہ اسی طرح

دس روپے کر دی جائے۔

لوگوں نے آکر حضرت والا سے منت سماجت شروع کر دی کہ حضرت! آپ تو اپنے تقویٰ اور ورع کی وجہ سے اضافہ واپس کر رہے ہیں، لیکن دوسرے لوگوں کے لئے یہ مشکل ہو جائے گی کہ آپ کی وجہ سے ان کی ترقیاں رک جائیں گی۔ لہٰذا آپ اس کو منظور کرلیں۔ مگر انہوں نے اپنے لئے اس کو گوارا نہ کیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہر وقت یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ یہ دنیا تو چند روز کی ہے۔ خدا جانے آج ختم ہو جائے، یا کل ختم ہو جائے۔ لیکن یہ پیسہ جو میرے پاس آرہا ہے، کہیں یہ پیسہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر وہاں شرمندگی کا سبب نہ بن جائے۔

دارالعلوم دیوبند عام یونیورسٹی کی طرح نہیں تھا کہ استاذ نے سبق پڑھا دیا۔ اور طالب علم نے سبق پڑھ لیا۔ بلکہ وہ ان اداؤں سے دارالعلوم دیوبند بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کی فکر سے بنا ہے۔ اس ورع اور تقویٰ سے بنا ہے۔ لہٰذا یہ اوقات جو ہم نے بیچ دیئے ہیں، یہ امانت ہیں۔ اس میں خیانت نہ ہونی چاہئے۔

آج حقوق کے مطالبے کا دور ہے

آج سارا زور حقوق کے حاصل کرنے پر ہے، حقوق حاصل کرنے کے لئے جلوس اور جلسے ہو رہے ہیں، نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ اور اس بات پر احتجاج ہو رہا ہے کہ ہمیں ہمارا حق دو، ہر شخص یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ مجھے میرا حق دو۔ لیکن کسی کو یہ فکر نہیں کہ دوسروں کے حقوق جو مجھ پر عائد ہو رہے ہیں وہ میں ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ آج یہ مطالبہ تو ہر شخص کر رہا ہے کہ میری تنخواہ بڑھنی چاہئے۔ مجھے ترقی ملنی چاہئے۔ یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ مجھے اتنی چھٹیاں ملنی چاہئیں، مجھے اتنا الاؤنس ملنا چاہئے۔ لیکن جو فرائض مجھے سونپے گئے ہیں، وہ میں ادا کر رہا ہوں یا نہیں، اس کی کوئی فکر نہیں۔

ہر شخص اپنے فرائض کی نگرانی کرے

حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ جب تک ہماری یہ ذہنیت برقرار رہے گی کہ میں دوسرے سے حقوق کا مطالبہ کرتا رہوں، اور مجھ سے کوئی حقوق کا مطالبہ نہ کرے، میں اپنے فرائض سے غافل رہوں، اور دوسروں سے حقوق کا مطالبہ کرتا رہوں، یاد رکھو! اس وقت تک دنیا میں کسی کا حق ادا نہیں ہوگا۔ حق ادا ہونے کا صرف ایک راستہ ہے، جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں بتایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی نگرانی کرے، میرے ذمہ جو فریضہ ہے، میں اس کو ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ جب اس بات کا احساس دل میں ہوگا تو پھر سب کے حقوق ادا ہو جائیں گے۔ اگر شوہر کے دل میں یہ

احساس ہو کہ میرے ذمے بیوی کے جو فرائض ہیں، میں ان کو ادا کردوں، بس بیوی کا حق ادا ہو گیا۔ بیوی کے دل میں یہ احساس ہو کہ میرے ذمے شوہر کے جو فرائض ہیں، میں ان کو ادا کر دوں، بس شوہر کا حق ادا ہو گیا۔ مزدور کے دل میں یہ احساس ہو کہ مالک کے میرے ذمے جو فرائض ہیں، میں ان کو ادا کردوں، مالک کا حق ادا ہو گیا۔ اور مالک کے دل میں یہ احساس ہو کہ مزدور کے میرے ذمے جو حقوق ہیں، وہ میں ادا کردوں، مزدور کا حق ادا ہو گیا۔ جب تک دلوں میں یہ احساس پیدا نہیں ہوگا، اس وقت تک حقوق کے مطالبے کے صرف نعرے ہی لگتے رہیں گے اور تحفظِ حقوق کی انجمنیں ہی قائم ہوتی رہیں گی۔ اور جلسے جلوس نکلتے رہیں گے، لیکن اس وقت تک کسی کا حق ادا نہ ہوگا، جب تک اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے مجھے اس کے حقوق کا جواب دینا ہے۔ بس دنیا میں امن وسکون کا یہی راستہ ہے۔ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

یہ بھی ناپ تول میں کمی ہے

لہٰذا یہ اوقات ہمارے پاس امانت ہیں، قرآن کریم نے فرمایا:

﴿وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ الَّذِيۡنَ اِذَا اكۡتَالُوۡا عَلَى النَّاسِ يَسۡتَوۡفُوۡنَ وَاِذَا كَالُوۡهُمۡ اَوْ وَّزَنُوۡهُمۡ يُخۡسِرُوۡنَ﴾(۱)

فرمایا کہ ان لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے جو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں، جب دوسروں سے وصول کرنے کا وقت آتا ہے تو پورا پورا وصول کرتے ہیں، تاکہ ذرا بھی کمی نہ ہو جائے، لیکن جب دوسروں کو دینے کا وقت آتا ہے تو اس میں کم دیتے ہیں اور ڈنڈی مارتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے اب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ناپ تول میں کمی اس وقت ہوتی ہے، جب آدمی کوئی سودا بیچے، اور اس میں ڈنڈی مار جائے، حالانکہ علماء نے فرمایا:

"اَلتَّطْفِيْفُ فِيْ كُلِّ شَيْءٍ"

یعنی ناپ تول میں کمی ہر چیز میں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص آٹھ گھنٹے کا ملازم ہے، اور وہ پورے آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی نہیں دے رہا ہے، وہ بھی ناپ تول میں کمی کر رہا ہے۔ اور اس عذاب کا مستحق ہو رہا ہے۔ اس کا لحاظ کرنا چاہئے۔

"منصب" اور "عہدہ" ذمہ داری کا پھندا

آج ہم پر یہ بلا جو مسلط ہے کہ اگر کسی کو سرکاری دفتر میں کوئی کام پڑ جائے تو اس پر قیامت

(۱) المطففین: ۳

ٹوٹ پڑتی ہے، اس کا کام آسانی سے نہیں ہوتا، بار بار دفتروں کے چکر لگانے پڑتے ہیں، کبھی افسر صاحب سیٹ پر موجود نہیں ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ آج کام نہیں ہوسکتا کل کو آنا۔ جب دوسرے دن پہنچے تو کہا کہ پرسوں آنا۔ چکر پر چکر لگوائے جارہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے فرض کا احساس اور امانت کا احساس ختم ہوگیا ہے۔ اگر کسی کے پاس کوئی منصب ہے تو وہ کوئی منفعت نہیں ہے۔ وہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے، بلکہ وہ ذمہ داری کا ایک پھندا ہے، حکومت، اقتدار، منصب، عہدہ یہ سب ذمہ داری کے پھندے ہیں، یہ ایسی ذمہ داری ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا پیاسا مرجائے تو مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ قیامت کے روز مجھ سے سوال نہ ہوجائے کہ اے عمر! تیرے عہدِ خلافت میں فلاں کتا بھوکا پیاسا مر گیا تھا۔

کیا ایسے شخص کو خلیفہ بنادوں؟

روایت میں آتا ہے کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ ہوا، اور آپ شدید زخمی ہوگئے تو کچھ صحابہ کرام آپ کی خدمت میں آئے، اور عرض کیا کہ حضرت آپ دنیا سے تشریف لے جارہے ہیں، آپ اپنے بعد کسی کو خلیفہ اور جانشین نامزد فرمادیں، تاکہ آپ کے بعد وہ حکومت کی باگ دوڑ سنبھال لے، اور بعض حضرات نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر کو نامزد فرمادیں تاکہ آپ کی وفات کے بعد وہ خلیفہ بن جائیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پہلے تو جواب میں فرمایا کہ نہیں، تم مجھ سے ایسے شخص کو خلیفہ بنوانا چاہتے ہو، جسے اپنی بیوی کو طلاق دینی بھی نہیں آتی۔ (۱)

واقعہ یہ ہوا تھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض یعنی ماہواری کے ایام میں طلاق دے دی تھی، اور مسئلہ یہ ہے کہ جب عورت ایام کی حالت میں ہو، اس وقت عورت کو طلاق دینا شرعاً ناجائز ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ مسئلہ معلوم نہیں تھا۔ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ تم نے یہ غلط کیا، اس لئے اب رجوع کرلو، اور پھر سے اگر طلاق دینی ہو تو پاکی کی حالت میں طلاق دینا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ تم ایسے شخص کو خلیفہ بنانا چاہتے ہو جسے اپنی بیوی کو طلاق دینی بھی نہیں آتی۔ (۲)

---

(۱) تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۱۱۳

(۲) تاریخ الخلفاء للسیوطی: ۱۱۳، تاریخ الطبری (۲۹۲/۳)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور احساسِ ذمہ داری

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کو دوسرا جواب یہ دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ خلافت کے بوجھ کا پھندا خطاب کی اولاد میں سے ایک شخص کے گلے میں پڑ گیا تو یہ بھی کافی ہے، مراد اپنی ذات تھی کہ بارہ سال تک یہ پھندا میرے گلے میں پڑا رہا، وہی کافی ہے۔ اب اس خاندان کے کسی اور فرد کے گلے میں یہ پھندا میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ اس واسطے کہ کچھ پتہ نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے جب مجھے اس ذمہ داری کا حساب دینا ہوگا، اس وقت میرا کیا حال ہوگا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ وہ شخص ہیں جو خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یہ خوشخبری سن چکے ہیں کہ ”عُمَرُ فِي الْجَنَّةِ“ کہ عمر جنت میں جائے گا۔ (۱)

اس بشارت کے بعد اس بات کا کوئی احتمال باقی نہیں رہتا کہ جنت میں نہ جائیں، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے سامنے حساب و کتاب کا ڈر اور اس امانت کا اتنا احساس ہے۔

ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ قیامت کے روز اگر میں اس امانت کے حساب کے نتیجے میں برابر سرابر بھی چھوٹ جاؤں کہ میرے اوپر نہ کوئی گناہ ہو، اور نہ ثواب ہو اور مجھے ”اعراف“ میں بھیج دیا جائے (جو جنت اور جہنم کے درمیان ایک علاقہ ہے جس میں ان لوگوں کو رکھا جائے گا، جن کے گناہ اور ثواب برابر ہوں گے) تو میرے لئے یہ بھی کافی، اور میں خلاصی پا جاؤں گا۔ حقیقت میں یہ ہے اس امانت کا احساس جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے، اگر اس احساس کا تھوڑا ذرہ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں پیدا فرما دے تو ہمارے سارے مسئلے حل ہو جائیں۔

پاکستان کا اوّلین مسئلہ ”خیانت“ ہے

ایک زمانے میں یہ بحث چلی تھی کہ پاکستان کا مسئلہ نمبر ایک کیا ہے؟ یعنی سب سے بڑی مشکل کیا ہے جس کو حل کرنے میں اولیت دی جائے۔ حقیقت میں مسئلہ نمبر ایک ”خیانت“ ہے۔ آج امانت کا تصور ہمارے ذہنوں میں موجود نہیں ہے۔ اپنے فرائض ادا کرنے کا احساس دل سے اُتر گیا۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس باقی نہیں رہا، زندگی تیزی سے چلی جا رہی ہے۔ جس میں پیسے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ کھانے کی دوڑ لگی ہے، اقتدار کی دوڑ ہے۔ اس دوڑ میں ایک دوسرے سے

---

(۱) سنن الترمذي، كتاب المناقب عن رسول الله، باب مناقب عبد الرحمن بن عوف الزهري، رقم: ۳۶۸۰، سنن أبي داؤد، كتاب السنة، باب في الخلفاء، رقم: ۴۰۳۱، سنن ابن ماجه، المقدمة، باب فضائل العشرة، رقم: ۱۳۰، مسند أحمد، رقم: ۱۵۴۳ تاريخ الطبري (۲۹۲/۳)

بازی لے جانے میں لگے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کی کوئی فکر نہیں، آج سب سے بڑا مسئلہ، اور ساری بیماریوں کی جڑ یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کے اندر یہ احساس پیدا فرمادے تو مسائل درست ہو جائیں۔

دفتر کا سامان امانت ہے

جس دفتر میں آپ کام کررہے ہیں، اس دفتر کا جتنا سامان ہے، وہ سب آپ کے پاس امانت ہے، اس لئے کہ وہ سامان آپ کو اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کو دفتری کاموں میں استعمال کریں لہٰذا آپ اس کو ذاتی کاموں میں استعمال نہ کریں۔ اس لئے کہ یہ بھی امانت میں خیانت ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر دفتر کی معمولی چیز اپنے ذاتی کام میں استعمال کرلی اس میں کیا حرج ہے؟ یاد رکھو! خیانت چھوٹی چیز کی ہو یا بڑی چیز کی ہو، دونوں حرام ہیں، اور گناہِ کبیرہ ہیں۔ دونوں میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ اس لئے ان دونوں سے بچنا ضروری ہے۔

سرکاری اشیاء امانت ہیں

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ "امانت" کے صحیح معنی یہ ہیں کہ کسی شخص نے آپ پر بھروسہ کرکے اپنا کوئی کام آپ کے سپرد کیا، اور پھر آپ نے وہ کام اس کے بھروسہ کے مطابق انجام نہ دیا تو یہ خیانت ہوگی۔ یہ سڑکیں جن پر آپ چلتے ہیں۔ یہ بسیں جن میں آپ سفر کرتے ہیں۔ یہ ٹرینیں جن میں آپ سفر کرتے ہیں۔ یہ سب امانت ہیں۔ یعنی ان کو جائز طریقے پر استعمال کیا جائے اور اگر ان کو اس جائز طریقے سے ہٹ کر استعمال کیا جارہا ہے، تو وہ خیانت کے اندر داخل ہے۔ مثلاً اس کو استعمال کرتے وقت گندہ اور خراب کردیا۔ آج کل تو لوگوں نے سڑکوں کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ رکھا ہے۔ کسی نے کھود کر نالی نکال لی اور پانی جانے کا راستہ بنادیا۔ کسی نے سڑک گھیر کر شامیانہ لگادیا۔ حالانکہ فقہاء کرام نے یہاں تک مسئلہ لکھا ہے کہ اگر ایک شخص نے اپنے گھر کا پرنالہ باہر سڑک کی طرف نکال دیا، تو اس شخص نے ایک ایسی فضا استعمال کی جو اس کی ملکیت میں نہیں تھی، اس لئے اس شخص کے لئے سڑک کی طرف پرنالہ نکالنا جائز نہیں، حالانکہ وہ پرنالہ کوئی جگہ نہیں گھیر رہا ہے۔ بلکہ فضا کے ایک حصے میں وہ پرنالہ نکلا ہوا ہے۔ اس پر فقہاء کرام نے تفصیلی بحث کی ہے کہ کہاں پرنالہ نکالنا جائز ہے، کتنا نکالنا جائز ہے، کتنا نکالنا حرام ہے، اس لئے کہ وہ جگہ امانت ہے، اپنی مِلک کا حصہ نہیں ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا پرنالہ

حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں ان کے پرنالے کا قصہ مشہور ہے ان کا گھر مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل ساتھ ملا ہوا تھا۔ ان کے گھر کا ایک پرنالہ مسجد نبوی کے صحن میں گرتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی اس پرنالے پر نظر پڑی تو دیکھا کہ وہ پرنالہ مسجد میں نکلا ہوا ہے۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہ پرنالہ کس کا ہے جو مسجد کے صحن کی طرف لگا ہوا ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا پرنالہ ہے۔ آپ نے حکم فرمایا کہ اس کو توڑ دو۔ مسجد کی طرف کسی کو پرنالہ نکالنا جائز نہیں۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو ملاقات کے لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ عمر یہ تم نے کیا کیا؟ انہوں نے فرمایا کہ یہ پرنالہ مسجد نبوی میں نکلا ہوا تھا۔ اس لئے گرادیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ پرنالہ میں نے نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے لگایا تھا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب یہ سنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے لگایا تھا تو فوراً فرمایا کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔ چنانچہ مسجد نبوی میں تشریف لاکر خود جھک کر رکوع کی حالت میں کھڑے ہوگئے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے عباس! خدا کے لئے میری کمر پر سوار ہو کر اس پرنالے کو دوبارہ لگاؤ، اس لئے کہ خطاب کے بیٹے کی یہ مجال کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجازت دیئے ہوئے پرنالے کو توڑ دے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں لگوالوں گا، آپ رہنے دیں۔ لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں، جب میں نے توڑا ہے لہٰذا اب میں ہی اس کی سزا بھگتوں گا۔ (۱)

بہر حال! شریعت کا اصل مسئلہ تو یہی تھا کہ حاکم کی اجازت کے بغیر وہ پرنالہ لگانا جائز نہیں تھا۔ لیکن چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لگانے کی اجازت دیدی تھی، اس لئے اس کو لگانا ان کے لئے جائز ہوگیا۔

آج یہ حال ہے کہ جس شخص کا جتنی زمین پر قبضہ کرنے کا دل چاہا قبضہ کرلیا۔ اور اس کی کوئی فکر نہیں کہ یہ ہم گناہ کے کام کررہے ہیں۔ نمازیں بھی ہورہی ہیں، اور یہ خیانت بھی ہورہی ہے۔ یہ سب کام امانت میں خیانت کے اندر داخل ہیں، اس سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔

مجلس کی گفتگو امانت ہے

ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) طبقات ابن سعد (۲۰/۴)

((اَلْمَجَالِسُ بِالْأَمَانَةِ))(۱)

یعنی مجلسوں میں جو بات کی گئی ہو، وہ بھی سننے والوں کے پاس امانت ہے۔ مثلاً دو تین آدمیوں نے آپس میں مل کر باتیں کیں۔ بے تکلفی میں باہم اعتماد کی فضا میں راز کی باتیں کرلیں۔ اب ان باتوں کو ان کی اجازت کے بغیر دوسروں تک پہنچانا بھی خیانت کے اندر داخل ہے۔ اور ناجائز ہے۔ جیسے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ اِدھر کی بات اُدھر لگادی۔ اور اُدھر کی بات اِدھر لگادی۔ یہ سارا فتنہ فساد اسی طرح پھیلتا ہے۔ البتہ اگر مجلس میں کوئی ایسی بات کہی گئی ہو جس سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، مثلاً دو تین آدمیوں نے مل کر یہ سازش کی فلاں وقت پر فلاں شخص کے گھر پر حملہ کریں گے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ بات ایسی نہیں ہے جس کو چھپایا جائے، بلکہ اس شخص کو بتادیا جائے کہ تمہارے خلاف یہ سازش ہوئی ہے۔ لیکن جہاں اس قسم کی بات نہ ہوئی ہو وہاں کسی کے راز کی بات دوسروں تک پہنچانا ناجائز ہے۔

راز کی باتیں امانت ہیں

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ راز کی بات مجلس میں ایک شخص نے سنی، اس نے جاکر دوسرے کو یہ تاکید کرکے سنادی کہ یہ راز کی بات بتارہا ہوں۔ تمہیں تو بتادی، لیکن کسی اور سے مت کہنا۔ اب وہ سمجھ رہا ہے کہ یہ تاکید کرکے میں نے راز کا تحفظ کرلیا کہ آگے یہ بات کسی اور کو مت بتانا۔ اب وہ سننے والا آگے تیسرے شخص کو وہ راز کی بات اس تاکید کے ساتھ بتادیتا ہے۔ کہ یہ راز کی بات ہے، تم آگے کسی اور سے مت کہنا۔ یہ سلسلہ آگے اسی طرح چلتا رہتا ہے، اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم نے امانت کا خیال کرلیا۔ حالانکہ جب وہ بات راز تھی، اور دوسروں سے کہنے کو منع کیا گیا تھا تو پھر اس تاکید کے ساتھ کہنا بھی امانت کے خلاف ہے۔ یہ خیانت ہے اور جائز نہیں۔

یہ وہ چیزیں ہیں جنہوں نے ہمارے معاشرے میں فساد برپا کر رکھا ہے۔ آپ غور کر کے دیکھیں گے تو یہی نظر آئے گا کہ فساد اسی طرح برپا ہوتے ہیں کہ فلاں شخص تو آپ کے بارے میں یہ کہہ رہا تھا، اب اس کے دل میں اس کے خلاف غصہ اور بغض اور عناد پیدا ہوگیا۔ اس لئے اس لگائی بجھائی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔

ٹیلیفون پر دوسروں کی باتیں سننا حرام ہے

دو آدمی آپ سے علیحدہ ہوکر آپس میں سرگوشی کر رہے ہیں۔ اور آپ چھپ کر ان کی باتوں کو

(۱) سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في نقل الحديث، رقم: ٤٢٢٦، مسند أحمد، رقم: ١٤١٦٦

سننے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ میں ان کی باتیں سن لوں کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ امانت میں خیانت ہے۔

یا ٹیلیفون کرتے وقت کسی کی لائن آپ کے فون سے مل گئی۔ اب آپ نے ان کی باتوں کو سننا شروع کر دیا۔ یہ سب امانت میں خیانت ہے، تجسّس میں داخل ہے، اور ناجائز ہے، حالانکہ آج اس پر بڑا فخر کیا جاتا ہے۔ مجھے فلاں کا راز معلوم ہو گیا۔ اس کو بڑا ہنر اور بڑا فن سمجھا جاتا ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ فرما رہے ہیں کہ یہ خیانت کے اندر داخل ہے، اور ناجائز ہے۔

خلاصہ

غرض یہ ہے کہ امانت میں خیانت کے مصداق اتنے ہیں کہ شاید زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں ہمیں امانت کا حکم نہ ہو۔ اور خیانت سے ہمیں روکا نہ گیا ہو۔ یہ ساری باتیں جو میں نے ذکر کی ہیں، یہ سب امانت کے خلاف ہیں اور نفاق کے اندر داخل ہیں۔ لہٰذا یہ حدیث ہر وقت مستحضر رہنی چاہئے کہ تین چیزیں منافق کی علامت ہیں۔ بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، اور اگر اس کے پاس کوئی امانت آئے تو اس میں خیانت کرے۔ اللہ تعالیٰ ہماری اور آپ سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔ یہ سب دین کا حصہ ہے۔ ہم لوگوں نے دین کو بہت محدود کر رکھا ہے، اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان باتوں کو فراموش کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمارے دلوں میں فکر پیدا فرما دے۔ اور اس کی توفیق عطا فرما دے کہ نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے اس طریقے پر ہم عمل کریں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

وعدہ خلافی اور اس کی مروجہ صورتیں ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:
((آيَةُ الْمَنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ)) فِيْ رِوَايَةٍ ((وَإِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ أَنَّهٗ مُسْلِمٌ))(۱)

پچھلے جمعہ کو اس حدیث میں بیان کی گئیں تین علامات میں سے ایک یعنی جھوٹ پر الحمدللہ قدرے تفصیل کے ساتھ بیان ہوگیا تھا۔ منافق کی دوسری علامت جو نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمائی، وہ یہ ہے:

((وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ))

کہ جب وہ وعدہ کرے، تو اس کی خلاف ورزی کرے۔ مؤمن کا کام یہ ہے کہ جب وہ وعدہ کرتا ہے تو اس کو نبھاتا ہے، اس کو پورا کرتا ہے۔ چنانچہ شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی وعدہ کیا، اور بعد میں اس وعدہ کو پورا کرنے میں کوئی شدید عذر پیش آیا، یا کوئی رکاوٹ پیش آگئی جس کی وجہ سے اس کے لئے اس وعدہ کو پورا کرنا ممکن نہیں رہا، تو اس صورت یہ وعدہ کرنے والا شخص اس دوسرے شخص سے بتادے کہ اب میرے لئے اس وعدہ کو پورا کرنا ممکن نہیں رہا۔ اس لئے میں اس وعدہ سے دست بردار ہوتا ہوں۔ مثلاً ایک شخص نے وعدہ کیا کہ میں تم کو فلاں تاریخ کو ایک ہزار روپے دوں گا، بعد میں اس وعدہ کرنے والے کے پاس پیسے ختم ہوگئے۔ اور اب وہ اس قابل نہیں رہا کہ اس کی مدد کرسکے، اور اس کو ایک ہزار روپے دے سکے، تو اس صورت میں اس کو بتادے کہ میں نے ایک ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اب میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ اس وعدے کو پورا کرسکوں۔

☆ اصلاحی خطبات (۳/۱۵۸تا۱۷۱)، ۲دسمبر ۱۹۹۱ء، بروز جمعہ، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی۔

(۱) صحیح البخاری، كتاب الإيمان، باب علامة المنافق، رقم: ۳۲، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان خصال المنافق، رقم: ۸۹، سنن الترمذی، كتاب الإيمان عن رسول الله، باب ما جاء فی علامة المنافق، رقم: ۲۵۵۵، مسند أحمد، رقم: ۸۳۳۱

لیکن جب تک اس وعدہ کو پورا کرنے کی قدرت ہے، اور کوئی شرعی عذر نہیں ہے، اس وقت تک اس وعدہ کو پورا کرے۔

''منگنی'' ایک وعدہ ہے

مثلاً کسی شخص نے منگنی کرلی، اور کسی سے رشتہ کرنے کے بارے میں طے کرلیا تو یہ منگنی ایک وعدہ ہے۔ اس لئے حتی الامکان اس کو نبھانا چاہئے۔ لیکن اگر کوئی عذر پیش آجائے، مثلاً منگنی کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان دونوں کے درمیان اتفاق و اتحاد قائم نہیں رہے گا، طبیعتوں اور مزاجوں میں فرق ہے۔ اور کچھ حالات سامنے آئے جو پہلے معلوم نہیں تھے۔ اس صورت میں اس کو بتادے کہ ہم نے آپ سے شادی کا وعدہ اور منگنی کی تھی۔ لیکن اب فلاں عذر کی وجہ سے ہم اس کو پورا نہیں کرسکتے۔ لیکن جب تک عذر نہ ہو، اس وقت تک وعدہ کو نبھانا اور اس وعدہ کو پورا کرنا شرعاً واجب ہے۔ اور اگر وعدہ پورا نہیں کرے گا تو اس حدیث کا مصداق بن جائے گا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا ابوجہل سے وعدہ

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ایسے وعدوں کو نبھایا کہ اللہ اکبر آج اس کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دار ہیں۔ جب یہ اور ان کے والد یمان رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے، تو مسلمان ہونے کے بعد حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ آرہے تھے۔ راستے میں ان کی ملاقات ابوجہل اور اس کے لشکر سے ہوگئی۔ اس وقت ابوجہل اپنے لشکر کے ساتھ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لئے جارہا تھا۔ جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ملاقات ابوجہل سے ہوئی تو اس نے پکڑلیا۔ اور پوچھا کہ کہاں جارہے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ ہم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ جارہے ہیں۔ ابوجہل نے کہا کہ پھر تو ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے، اس لئے کہ تم مدینہ جاکر ہمارے خلاف جنگ میں حصہ لوگے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا مقصد تو صرف حضور کی ملاقات اور زیارت ہے۔ ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔ ابوجہل نے کہا کہ اچھا ہم سے وعدہ کرو کہ وہاں جاکر صرف ملاقات کروگے، لیکن جنگ میں حصہ نہیں لوگے۔ انہوں نے وعدہ کرلیا۔ چنانچہ ابوجہل نے آپ کو چھوڑ دیا۔ آپ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، اس وقت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام کے ساتھ غزوۂ بدر کے لئے مدینہ منورہ سے روانہ ہوچکے تھے، اور راستے میں ملاقات ہوگئی۔

حق و باطل کا پہلا معرکہ ”غزوۂ بدر“

اب اندازہ لگایئے کہ اسلام کا پہلا حق و باطل کا معرکہ (غزوۂ بدر) ہو رہا ہے۔ اور یہ وہ معرکہ ہے جس کو قرآن کریم نے ”یوم الفرقان“ فرمایا، یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دینے والا معرکہ، وہ معرکہ ہو رہا ہے جس میں جو شخص شامل ہو گیا، وہ ”بدری“ کہلایا، اور صحابہ کرام میں ”بدری“ صحابہ کا بہت اُونچا مقام ہے۔ اور ”اسمائے بدریین“ بطور وظیفے کے پڑھے جاتے ہیں۔ ان کے نام پڑھنے سے اللہ تعالیٰ دعائیں قبول فرماتے ہیں۔ وہ ”بدریین“ جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے یہ پیشین گوئی فرمادی کہ اللہ تعالیٰ نے سارے اہلِ بدر کی، جنہوں نے بدر کی لڑائی میں حصہ لیا، بخشش فرمادی ہے، ایسا معرکہ ہونے والا ہے۔

گردن پر تلوار رکھ کر لیا جانے والا وعدہ

بہر حال! جب حضورِ اقدس ﷺ سے ملاقات ہوئی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے سارا قصہ سنادیا کہ اس طرح راستے میں ہمیں ابوجہل نے پکڑ لیا تھا۔ اور ہم نے یہ وعدہ کر کے بمشکل جان چھڑائی کہ ہم لڑائی میں حصہ نہیں لیں گے، اور پھر درخواست کی کہ یا رسول اللہ! یہ بدر کا معرکہ ہونے والا ہے، آپ اس میں تشریف لے جارہے ہیں۔ ہماری بڑی خواہش ہے کہ ہم بھی اس میں شریک ہو جائیں، اور جہاں تک اس وعدہ کا تعلق ہے، وہ تو انہوں نے ہماری گردن پر تلوار رکھ کر ہم سے یہ وعدہ لیا تھا کہ ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے، اور اگر ہم وعدہ نہ کرتے تو وہ ہمیں نہ چھوڑتے، اس لئے ہم نے وعدہ کر لیا، لیکن آپ ہمیں اجازت دے دیں کہ ہم اس جنگ میں حصہ لے لیں، اور فضیلت اور سعادت ہمیں حاصل ہو جائے۔ (۱)

تم وعدہ کر کے زبان دے کر آئے ہو

لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ نہیں، تم وعدہ کر کے آئے ہو، اور زبان دے کر آئے ہو، اور اسی شرط پر تمہیں رہا کیا گیا ہے کہ تم وہاں جا کر محمد رسول اللہ ﷺ کی زیارت کرو گے، لیکن ان کے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لو گے، اس لئے میں تم کو جنگ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتا

یہ وہ مواقع ہیں، جہاں انسان کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان اور اپنے وعدے کا کتنا پاس کرتا ہے۔ اگر ہم جیسا آدمی ہوتا تو ہزار تاویلیں کر لیتا، مثلاً یہ تاویل کر لیتا کہ ان کے ساتھ جو وعدہ کیا

---

(۱) الإصابة (۱/۳۱۶)

تھا، وہ سچے دل سے تو نہیں کیا تھا، وہ تو ہم سے زبردستی لیا گیا تھا۔ اور خدا جانے کیا کیا تاویلیں ہمارے ذہنوں میں آجاتیں۔ یا یہ تاویل کر لیتا کہ یہ حالتِ عذر ہے، اس لئے حضور اقدس ﷺ کے ساتھ جہاد میں شامل ہونا ہے اور کفر کا مقابلہ کرنا ہے۔ جبکہ وہاں ایک ایک آدمی کی بڑی قیمت ہے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے لشکر میں صرف ۳۱۳ نہتے افراد ہیں۔ جن کے پاس صرف ۷۰ اونٹ، ۲ گھوڑے اور ۸ تلواریں ہیں۔ باقی افراد میں سے کسی نے لاٹھی اُٹھالی ہے، کسی نے ڈنڈے، اور کسی نے پتھر اُٹھالیے ہیں۔ یہ لشکر ایک ہزار مسلح سورماؤں کا مقابلہ کرنے کے لئے جارہا ہے، اس لئے ایک ایک آدمی کی جان قیمتی ہے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو بات کہہ دی گئی ہے، اور جو وعدہ کر لیا گیا ہے، اس وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔

جہاد کا مقصد، حق کی سربلندی

یہ جہاد کوئی ملک حاصل کرنے کے لئے نہیں ہو رہا ہے، کوئی اقتدار حاصل کرنے کے لئے نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ یہ جہاد حق کی سربلندی کے لئے ہو رہا ہے۔ اور حق کو پامال کر کے جہاد کیا جائے؟ گناہ کا ارتکاب کر کے اللہ تعالیٰ کے دین کا کام کیا جائے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ آج ہم لوگوں کی یہ ساری کوششیں بیکار جارہی ہیں، اور ساری کوششیں بے اثر ہو رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ گناہ کر کے اسلام کی تبلیغ کریں، گناہ کر کے اسلام کو نافذ کریں، ہمارے دل و دماغ پر ہر وقت ہزاروں تاویلیں مسلط رہتی ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت کا یہ تقاضا ہے، چلو، شریعت کے اس حکم کو نظر انداز کر دو، اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت اس کام کے کرنے میں ہے۔ چلو، یہ کام کر لو۔

یہ ہے وعدہ کا ایفاء

لیکن وہاں تو ایک ہی مقصود تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہونا، نہ مال مقصود ہے، نہ فتح مقصود ہے۔ نہ بہادر کہلانا مقصود ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا اس میں ہے کہ جو وعدہ کر لیا گیا ہے، اس کو نبھاؤ، چنانچہ حضرت حذیفہ اور ان کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہما، دونوں کو غزوۂ بدر جیسی فضیلت سے محروم رکھا گیا، اس لئے کہ یہ دونوں جنگ میں شرکت نہ کرنے پر زبان دے کر آئے تھے۔ یہ ہے وعدہ کا ایفاء۔

اگر آج اس کی مثال تلاش کریں تو اس دنیا میں ایسی مثالیں کہاں ملیں گی؟ ہاں! محمد رسول اللہ ﷺ کے غلاموں میں ایسی مثالیں مل جائیں گی۔ انہوں نے یہ مثالیں قائم کیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، ان صحابہ کرام میں سے ہیں جن کے بارے میں لوگوں نے معلوم نہیں کیا کیا غلط

قسم کے پروپیگنڈے کیے ہیں، اللہ تعالیٰ بچائے، لوگ ان کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں۔ ان کا ایک قصہ سن لیجئے۔

فتح حاصل کرنے کے لئے جنگی تدبیر

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ چونکہ شام میں تھے۔ اس لئے روم کی حکومت سے ان کی ہر وقت جنگ رہتی تھی۔ ان کے ساتھ برسرِ پیکار رہتے تھے۔ اور روم اس وقت کی سپر پاور سمجھی جاتی تھی اور بڑی عظیم الشان عالمی طاقت تھی۔ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ کرلیا، اور ایک تاریخ متعین کرلی کہ اس تاریخ تک ہم ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے۔ ابھی جنگ بندی کے معاہدے کی مدت ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں خیال آیا کہ جنگ بندی کی مدت تو درست ہے لیکن اس مدت کے اندر میں اپنی فوجیں رومیوں کی سرحد پر لے جاکر ڈال دوں، تاکہ جس وقت جنگ بندی کی مدت ختم ہو، اس وقت میں فوراً حملہ کردوں، اس لئے کہ دشمن کے ذہن میں تو یہ ہوگا کہ جب جنگ بندی کی مدت ختم ہوگی، پھر کہیں جاکر لشکر روانہ ہوگا، اور یہاں آنے میں وقت لگے گا، اس لئے معاہدہ کی مدت ختم ہوتے ہی فوراً مسلمانوں کا لشکر حملہ آور نہیں ہوگا، اس لئے وہ اس حملے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ لہٰذا اگر میں اپنا لشکر سرحد پر ڈال دوں گا، اور مدت ختم ہوتے ہی فوراً حملہ کردوں گا تو جلدی فتح حاصل ہوجائے گی۔

یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے

چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی فوجیں سرحد پر ڈال دیں، اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندر ان کے علاقے میں ڈال دیا، اور حملہ کے لئے تیار ہوگئے۔ اور جیسے ہی جنگ بندی کے معاہدے کی آخری تاریخ کا سورج غروب ہوا، فوراً حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لشکر کو پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ چنانچہ جب لشکر نے پیش قدمی کی تو یہ چال بڑی کامیاب ثابت ہوئی، اس لئے کہ وہ لوگ اس حملے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر شہر کے شہر، بستیاں کی بستیاں فتح کرتا ہوا چلا جارہا تھا۔ اب فتح کے نشے کے اندر پورا لشکر آگے بڑھتا جارہا تھا کہ اچانک دیکھا کہ اب پیچھے سے ایک گھوڑ اسوار دوڑتا چلا آرہا ہے۔ اس کو دیکھ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے انتظار میں رک گئے کہ شاید یہ امیر المؤمنین کا کوئی نیا پیغام لے کر آیا ہو۔ جب وہ گھوڑ اسوار قریب آیا تو اس نے آوازیں دینا شروع کردیں

"اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ، قِفُوْا عِبَادَ اللّٰہِ قِفُوْا عِبَادَ اللّٰہِ"

اللہ کے بندو، ٹھہر جاؤ، اللہ کے بندو، ٹھہر جاؤ۔ جب وہ اور قریب آیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

نے دیکھا کہ وہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا:

"وَفَاءٌ لَا غَدْرٌ، وَفَاءٌ لَا غَدْرٌ"

مؤمن کا شیوہ وفاداری ہے، غداری نہیں ہے، عہد شکنی نہیں ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے تو کوئی عہد شکنی نہیں کی ہے، میں نے تو اس وقت حملہ کیا ہے جب جنگ بندی کی مدت ختم ہوگئی تھی۔ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر چہ جنگ بندی کی مدت ختم ہوگئی تھی، لیکن آپ نے اپنی فوجیں جنگ بندی کی مدت کے دوران ہی سرحد پر ڈال دی تھیں، اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندر بھی داخل کر دیا تھا، اور یہ جنگ بندی کے معاہدے کی خلاف ورزی تھی۔ اور میں نے اپنے ان کانوں سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

((مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ فَلَا يَحِلَّنَّهُ وَلَا يَشُدَّنَّهُ اِلٰى أَن يَّمْضِىَ أَجَلٌ لَهُ أَوْ يَنْبِذَ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ))[۱]

یعنی جب تمہارا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو، تو اس وقت تک عہد نہ کھولے اور نہ باندھے جب تک کہ اس کی مدت نہ گزر جائے، یا ان کے سامنے پہلے کھلم کھلا یہ اعلان نہ کر دے کہ ہم نے وہ عہد ختم کر دیا۔ لہٰذا مدت گزرنے سے پہلے یا عہد کے ختم کرنے کا اعلان کیے بغیر ان کے علاقے کے پاس لے جا کر فوجوں کو ڈال دینا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق آپ کے لئے جائز نہیں تھا۔

سارا مفتوحہ علاقہ واپس کر دیا

اب آپ اندازہ لگائیے کہ ایک فاتح لشکر ہے، جو دشمن کا علاقہ فتح کرتا ہوا جا رہا ہے، اور بہت بڑا علاقہ فتح کر چکا ہے، اور فتح کے نشے میں چور ہے۔ لیکن جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کان میں پڑا کہ اپنے عہد کی پابندی مسلمان کے ذمے لازم ہے، اسی وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حکم دے دیا کہ جتنا علاقہ فتح کیا ہے، وہ سب واپس کر دو، چنانچہ پورا علاقہ واپس کر دیا اور اپنی سرحد میں دوبارہ واپس آ گئے۔ پوری دنیا کی تاریخ میں کوئی قوم اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی کہ اس نے صرف عہد شکنی کی بناء پر اپنا مفتوحہ علاقہ اس طرح واپس کر دیا ہو۔ لیکن یہاں پر چونکہ کوئی زمین کا حصہ پیشِ نظر نہیں تھا، کوئی اقتدار اور سلطنت مقصود نہیں تھی، بلکہ مقصود اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا تھا، اس لئے جب اللہ تعالیٰ کا حکم

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب السیر عن رسول اللہ، صلی اللہ علیہ وسلم، باب ما جاء فی الغدر، رقم: ۱۵۰۶، سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، [illegible] مسند احمد، مسند الشامیین، رقم: ۱۶۴۰

معلوم ہوگیا کہ وعدہ کی خلاف ورزی درست نہیں ہے، اور چونکہ یہاں وعدہ کی خلاف ورزی کا تھوڑا سا شائبہ پیدا ہو رہا تھا، اس لئے واپس لوٹ گئے۔ یہ ہے وعدہ کہ جب زبان سے بات نکل گئی تو اب اس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور معاہدہ کی پاسداری

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب بیت المقدس فتح کیا تو اس وقت وہاں پر جو عیسائی اور یہودی تھے، ان سے یہ معاہدہ ہوا کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے، تمہارے جان و مال کی حفاظت کریں گے، اور اس کے معاوضے میں تم ہمیں جزیہ ادا کرو گے، ''جزیہ'' ایک ٹیکس ہوتا ہے جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا ہے، چنانچہ جب معاہدہ ہوگیا تو وہ لوگ ہر سال جزیہ ادا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مسلمانوں کا دوسرے دشمنوں کے ساتھ معرکہ پیش آگیا، جس کے نتیجے میں وہ فوج جو بیت المقدس میں متعین تھی ان کی ضرورت پیش آئی۔ کسی نے یہ مشورہ دیا کہ اگر فوج کی کمی ہے تو بیت المقدس میں فوجیں بہت زیادہ ہیں، اس لئے وہاں سے ان کو محاذ پر بھیج دیا جائے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ مشورہ اور تجویز بہت اچھی ہے، لہٰذا فوجیں وہاں سے اُٹھا کر محاذ پر بھیج دو، لیکن اس کے ساتھ ایک کام اور بھی کرو، وہ یہ کہ بیت المقدس کے جتنے عیسائی اور یہودی ہیں، ان سب کو ایک جگہ جمع کرو، اور ان سے کہو کہ ہم نے آپ کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا، اور یہ معاہدہ کیا تھا کہ آپ کے جان و مال کی حفاظت کریں گے، اور اس کام کے لئے ہم نے وہاں فوج ڈالی ہوئی تھی، لیکن اب ہمیں دوسری جگہ فوج کی ضرورت پیش آگئی ہے، اس لئے ہم آپ کی حفاظت نہیں کر سکتے، لہٰذا اس سال آپ نے ہمیں جو جزیہ بطور ٹیکس ادا کیا ہے، وہ ہم آپ کو واپس کر رہے ہیں، اور اس کے بعد ہم اپنی فوجوں کو یہاں سے لے جائیں گے۔ اور اب آپ لوگ اپنی حفاظت کا انتظام خود کریں۔

یہ مثالیں ہیں اور میں کسی تردید کے خوف کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی کہ جس نے اپنے مخالف مذہب والوں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کیا ہو۔

وعدہ خلافی کی مروجہ صورتیں

بہر حال، منافق کی دوسری علامت جو اس حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے، وہ یہ کہ وعدہ کی خلاف ورزی اور وعدہ کو توڑنا ایک منافق کی نشانی ہے۔ اس سے ہر مسلمان کو بچنا چاہئے۔ لیکن جیسے میں نے جھوٹ کے بارے میں پچھلے جمعہ کو عرض کیا تھا کہ جھوٹ کی بہت سی صورتیں

ایسی ہیں، جن کو ہم اور آپ نے بالکل شِیرِ مادر سمجھ لیا ہے، اور ان کو جھوٹ کی فہرست سے خارج کر دیا ہے۔ ان کو جھوٹ سمجھتے ہی نہیں ہیں، اسی طرح وعدہ خلافی کی بھی بعض صورتیں وہ ہیں، جن کو وعدہ خلافی کی فہرست سے خارج کر دیا ہے۔ چنانچہ اگر کسی سے پوچھا جائے کہ وعدہ خلافی اچھی چیز ہے؟ تو جواب میں وہ یہی کہے گا کہ یہ تو بہت بری چیز اور گناہ ہے، لیکن عملی زندگی میں جب موقع آتا ہے تو اس وقت وہ وعدہ خلافی کر لیتا ہے۔ اور اس کو وعدہ خلافی سمجھتا ہی نہیں کہ یہ وعدہ خلافی ہے۔

ملکی قانون کی پابندی کرنا واجب ہے

مثلاً ایک بات عرض کرتا ہوں، جس کی طرف عام لوگوں کو توجہ نہیں ہے، اور اس کو دین کا معاملہ نہیں سمجھتے، میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین وہ فرمایا کرتے تھے کہ ''وعدہ'' صرف زبانی نہیں ہوتا، بلکہ وعدہ عملی بھی ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص ایک ملک میں بطور باشندے کے رہتا ہے تو وہ شخص عملاً اس حکومت سے وعدہ کرتا ہے کہ میں آپ کے ملک کے قوانین کی پابندی کروں گا، لہٰذا اب اس شخص پر اس وعدے کی پابندی کرنا واجب ہے، جب تک اس ملک کا قانون اس کو کسی گناہ کرنے پر مجبور نہ کرے، اس لئے کہ اگر کوئی قانون اس کو گناہ کرنے پر مجبور کر رہا ہے تو پھر اس قانون پر عمل کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ اس کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ کا صاف ارشاد ہے:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ))

''یعنی خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں''(۱)

لہٰذا ایسے قانون کی پابندی نہ صرف یہ کہ واجب نہیں، بلکہ جائز بھی نہیں، لیکن اگر کوئی قانون ایسا ہے جو آپ کو گناہ اور معصیت پر مجبور نہیں کر رہا ہے، اس قانون کی پابندی اس لئے واجب ہے کہ آپ نے عملاً اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ میں اس ملک کے قانون کی پابندی کروں گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قانون

اس کی مثال میں حضرت والد صاحب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ سنایا کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے ملک میں رہتے تھے، اور نبی بننے سے پہلے ایک قبطی کو مکا مار کر قتل کر دیا تھا، جس کا واقعہ مشہور ہے، اور قرآن کریم نے بھی اس واقعہ کو ذکر کیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قتل پر استغفار کیا کرتے تھے، اور فرماتے: ﴿لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ﴾ (۲)

(۱) مسند أحمد، رقم: ۱۰۴۱ (۲) الشعراء: ۱۴

یعنی میرے اُوپر ان کا ایک گناہ ہے، اور میں نے ان کا ایک جرم کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو جرم اور گناہ قرار دیتے تھے اور اس پر استغفار فرمایا کرتے تھے، اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ قتل جان بوجھ کر نہیں کیا تھا، بلکہ ایک مظلوم کی مدد فرمائی تھی اور یہ اندازہ نہیں تھا کہ مکا مارنے سے وہ مر جائے گا اس لئے یہ حقیقۃً گناہ نہیں تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عصمت کے منافی بھی نہیں تھا، لیکن چونکہ صورت گناہ کی سی تھی، اس لئے آپ نے اسے گناہ سے تعبیر فرمایا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ قبطی جس کو موسیٰ علیہ السلام نے قتل کیا تھا، وہ تو کافر تھا، اور کافر بھی حربی تھا، لہٰذا اگر اسے جان بوجھ کر بھی قتل کرتے تو اس حربی کافر کو قتل کرنے میں کیا گناہ ہوا؟ حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ اس لئے گناہ ہوا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے شہر میں رہ رہے ہیں تو عملاً اس بات کا وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم آپ کے ملک کے قوانین کی پابندی کریں گے، اور ان کا قانون یہ تھا کہ کسی کو قتل کرنا جائز نہیں، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو قتل کیا، وہ اس قانون کی خلاف ورزی میں کیا، لہٰذا ہر حکومت کا ہر شہری، چاہے حکومت مسلمانوں کی ہو یا غیر مسلم حکومت ہو، عملاً اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس ملک کے قانون کی پابندی کرے گا، جب تک وہ قانون کسی گناہ پر مجبور نہ کرے۔

''ویزہ'' لینا ایک عملی وعدہ ہے

اسی طرح جب آپ ویزہ لے کر دوسرے ملک جاتے ہیں۔ چاہے وہ غیر مسلم ملک ہو۔ مثلاً ہندوستان، امریکہ یا یورپ ویزہ لے کر چلے گئے، یہ ویزہ لینا عملاً ایک وعدہ ہے کہ ہم حتی الامکان اس ملک کے قوانین کی پابندی کریں گے، جب تک وہ قانون کسی گناہ پر مجبور نہ کرے، ہاں اگر وہ قانون گناہ پر مجبور کرے تو پھر اس قانون کی پابندی جائز نہیں۔ لہٰذا جو قوانین ایسے ہیں، جو انسان کو کسی گناہ پر مجبور نہیں کرتے، یا ناقابل برداشت ظلم کا سبب نہیں بنتے، ان قوانین کی پابندی بھی وعدہ کی پابندی میں داخل ہے۔

ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی گناہ ہے

مثلاً ٹریفک کا قانون ہے کہ دائیں طرف چلو، یا بائیں طرف چلو، یا یہ قانون ہے کہ جب سگنل کی لال بتی جلے تو رک جاؤ، اور جب سبز بتی جلے تو چل پڑو، اب ایک شہری ہونے کی حیثیت سے آپ نے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ ان قوانین کی پابندی کروں گا، لہٰذا اگر کوئی شخص ان قوانین کی پابندی نہ کرے، تو یہ وعدہ خلافی ہے۔ اور گناہ ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی کرلی تو اس میں گناہ کی کیا بات ہے؟ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آدمی اپنے کو بڑا سیانا اور ہوشیار جتانے

کے لئے خلاف ورزی بھی کر رہا ہے، اور قانون کی گرفت میں بھی نہیں آ رہا ہے۔

یاد رکھئے، یہ کئی اعتبار سے گناہ ہے، ایک تو اس حیثیت سے گناہ ہے کہ یہ وعدہ کی خلاف ورزی ہے، دوسرے اس حیثیت سے بھی گناہ ہے یہ قوانین تو اس لئے بنائے گئے ہیں تاکہ نظم وضبط پیدا ہو، اور اس کے ذریعہ سے ایک دوسرے کو نقصان اور تکلیف پہنچانے کے راستے بند ہوں، لہٰذا اگر آپ نے قانون کی خلاف ورزی کی، اور اس سے کسی کو نقصان پہنچ گیا، تو اس نقصان کی دنیا و آخرت کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔

یہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے

یہ سب باتیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان باتوں کا دین سے کیا تعلق ہے؟ یہ تو دنیاداری کی باتیں ہیں۔ ان کی پابندی کی کیا ضرورت ہے؟ خوب سمجھ لیجئے، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا دین ہے، جو ہماری زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہے، اور دین داری صرف ایک شعبے کی حد تک محدود نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو قانون کسی گناہ پر مجبور کرے، اس کی تو کسی حال میں بھی اطاعت جائز نہیں، اور جو قانون ناقابلِ برداشت ظلم کرے، اس کی بھی پابندی نہیں کرنی ہے، لیکن اس کے علاوہ جتنے قوانین ہیں ان کی پابندی شرعاً بھی ہمارے ذمے واجب ہے، اگر ان کی پابندی نہیں کریں گے تو وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا۔

خلاصہ

لہٰذا بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم وعدہ خلافی سمجھتے ہیں۔ اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم وعدہ خلافی نہیں سمجھتے، مگر وہ وعدہ خلافی اور گناہ کے اندر داخل ہیں۔ ان سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔ دین ہماری زندگی کے ہر شعبے کے اندر داخل ہے۔ ان تمام چیزوں کا لحاظ نہ کرنا دین کے خلاف ہے۔

منافق کی دو علامتوں کا بیان ہوگیا، تیسری علامت ہے ''امانت میں خیانت'' اس کا معاملہ بھی ایسا ہے کہ اس کی اہمیت اور فضیلت تو اپنی جگہ ہے، مگر بیشمار کام ایسے ہیں جو ''خیانت'' کے اندر داخل ہوتے ہیں، لیکن ہم ان کو خیانت نہیں سمجھتے۔ اب چونکہ وقت ختم ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے زندگی عطا فرمائی تو اگلے جمعہ اس کے بارے عرض کروں گا۔ جو باتیں ہم نے کہیں اور سنیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

طنز اور طعنہ سے بچئے ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا بِاللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِيءِ))(۱)

پچھلے چند جمعوں سے زبان کے گناہوں کا بیان چل رہا ہے، زبان کے اِن گناہوں کو صوفیاء کرام ''آفاتِ لسانی'' سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی زبان کی آفتیں۔ ''آفت'' کے معنی ہیں ''مصیبت'' ہم اور آپ ظاہری اعتبار سے مصیبت اس کو سمجھتے ہیں جیسے کوئی بیماری آجائے، یا جان یا مال کو نقصان پہنچ جائے، یا اور کوئی دنیاوی ضرر لاحق ہو جائے، تو ہم اس کو آفت اور مصیبت سمجھتے ہیں۔ لیکن جن اللہ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ حقیقت شناس نگاہ عطا فرماتے ہیں، وہ یہ فرماتے ہیں کہ حقیقی آفت وہ ہے جس کے ذریعے انسان کے دین کو ضرر لاحق ہو جائے۔

دنیا غم اور خوشی سے مرکب ہے

اگر کسی کو کوئی دنیاوی ضرر لاحق ہو گیا تو وہ اتنا تشویش ناک نہیں، کیونکہ دنیا میں دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، کبھی فائدہ اور کبھی نقصان، کبھی خوشی اور کبھی غم، نہ تو دنیا کا غم پائیدار ہے اور نہ خوشی پائیدار ہے۔ اگر کسی کو کوئی غم یا پریشانی آئی ہے تو وہ ان شاء اللہ چند دنوں کے بعد رفع ہو جائے گی اور انسان اس تکلیف اور غم کو بھول جائے گا، لیکن خدا نہ کرے اگر دین کو کوئی مصیبت لاحق ہو جائے تو یہ ناقابلِ تلافی ہے۔

☆ اصلاحی خطبات (۱۱/۸۴ تا ۱۱۸)، بعد از نماز عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء فی اللعنة، رقم: ۱۹۰۰، مسند أحمد، رقم: ٣٦٤٦

”ہمارے دین پر مصیبت واقع نہ ہو“

حضورِ اقدس ﷺ نے بھی کیا کیا عجیب وغریب دعائیں تلقین فرمائی ہیں، آدمی اس کے ایک ایک لفظ پر قربان ہو جائے۔ چنانچہ ایک دعا کے اندر آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَللّٰھُمَّ لَاتَجْعَلْ مُصِیْبَتَنَا فِیْ دِیْنِنَا))

”اے اللہ! کوئی مصیبت ہمارے دین پر واقع نہ ہو“(۱)

اس لئے کہ جب انسان اس دنیا میں آیا ہے تو اس کو کسی نہ کسی مصیبت سے سابقہ پیش آنا ہی ہے، کوئی بڑے سے بڑا بادشاہ ہو یا مالدار ہو یا صاحبِ اقتدار ہو، کوئی بھی ایسا نہیں ملے گا جس کو کوئی نہ کوئی مصیبت پیش نہ آئی ہو، اس دنیا میں مصیبت تو ضرور پیش آئے گی، لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ یہ دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! جو مصیبت پیش آئے وہ دنیا کی مصیبت ہو، دین کی مصیبت پیش نہ آئے۔

پھر آگے ارشاد فرمایا:

((وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ ھَمِّنَا وَلَامَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَاغَایَةَ رَغْبَتِنَا))(۲)

”اے اللہ! ہماری ساری سوچ بچار دنیا ہی کے بارے میں نہ بنائیے کہ ہر وقت دنیا ہی کے بارے میں سوچتے رہیں اور آخرت کا کچھ خیال نہ ہو۔ اور اے اللہ! نہ اس دنیا کو ایسا بنائیے کہ ہمارا سارا علم اس دنیا ہی کے بارے میں ہو اور دین کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہ ہو۔ اور نہ ہماری ساری خواہشات کا مرکز اس دنیا کو بنائیے کہ ہماری ساری خواہشات اور ہماری ساری اُمنگیں اس دنیا ہی سے متعلق ہوں اور آخرت کے بارے میں ہمارے دل میں کوئی خواہش اور اُمنگ نہ ہو“

تمام گناہ آفات ہیں

لہٰذا حقیقی مصیبت وہ ہے جو انسان کے دین کو لاحق ہو۔ اور جتنے بھی گناہ ہیں وہ حقیقت میں آفت اور مصیبت ہیں، اگرچہ ظاہری اعتبار سے اس گناہ کے کرنے میں لذت آتی ہے، لیکن حقیقت میں وہ لذت دنیا میں بھی تباہی لانے والی ہے اور آخرت میں بھی تباہی لانے والی ہے۔ اس وجہ سے صوفیاء کرام گناہوں کو ”آفات“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ سب آفتیں ہیں۔ اور زبان کے گناہوں کو ”آفات اللسان“ کہتے ہیں، یعنی زبان پر آنے والی آفتیں اور مصیبتیں، جن کے ذریعہ انسان مصیبت

(۱) روضة المحدثین، رقم:۳۳۱٦(۸/۴۱)، الجامع الصغیر وزیادته، رقم:۲۱۴۸ (۱/۲۱۵)

(۲) روضة المحدثین، رقم:۳۳۱٦(۸/۴۱)، الجامع الصغیر وزیادته، رقم:۲۱۴۸ (۱/۲۱۵)

کا شکار ہوتا ہے۔ان آفتوں میں سے ایک آفت یعنی ''غیبت'' کا بیان ہو چکا۔

مؤمن یہ چار کام نہیں کرتا

جو حدیث میں نے تلاوت کی ہے، اس حدیث میں بعض دوسری آفتوں کو بیان فرمایا ہے۔
حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''مؤمن طعنہ دینے والا نہیں ہوتا، لعنت کرنے والا نہیں ہوتا، فحش کلامی کرنے والا نہیں ہوتا اور بد کلامی کرنے والا نہیں ہوتا''

یعنی مؤمن کا کام یہ ہے کہ اس کی زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ نکلے جو طعنہ میں شامل ہو یا لعنت میں شامل ہو یا فحاشی میں شامل ہو یا بدگوئی میں شامل ہو۔اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار چیزیں بیان فرمائیں، ان چار چیزوں کا تعلق انسان کی زبان سے ہے۔

طعنہ کیا چیز ہے؟

اس حدیث میں پہلی چیز یہ بیان فرمائی کہ ''مؤمن طعنہ دینے والا نہیں ہوتا''
طعنہ دینا یہ ہے کہ کسی شخص کے منہ پر لپیٹ کر ایسی بات کرنا جس سے اس کی دل آزاری ہو۔ دیکھئے! ایک صورت یہ ہے کہ انسان دوسرے کو براہِ راست یہ کہہ دے کہ تمہارے اندر یہ برائی ہے، لیکن ''طعنہ'' اسے کہتے ہیں کہ گفتگو کسی اور موضوع پر ہو رہی ہے، مگر درمیان میں آپ نے ایک فقرہ اور ایک لفظ بول دیا، اور اس لفظ کو بولنے سے اس شخص پر طنز کرنا اور طعنہ دینا اور اعتراض کرنا مقصود تھا اور اس ''طنز اور طعنہ'' کے نتیجے میں اس کی دل آزاری ہوئی، یہ ''طنز اور طعنہ'' بہت سخت گناہ ہے۔اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرما دیا کہ مؤمن کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو طعنہ دے۔

زبان سے دل زخمی ہو جاتے ہیں

عربی زبان میں ''طعنہ'' کے معنی ہے ''کسی کو نیزہ مارنا'' اس لفظ کے اندر اس طرف اشارہ ہے کہ ''طعنہ دینا'' ایسا ہے جیسے دوسرے کو نیزہ مارنا۔عربی کا ایک مشہور شعر ہے۔

جِرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامٌ
وَلَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ

''نیزے کے زخم تو بھر جاتے ہیں، لیکن زبان کے لگائے ہوئے زخم نہیں بھرتے''(۱)

(۱) شرح کتاب الأمثال (۲۳/۱)، تاج العروس من جواهر القاموس (۷۰۶۷/۱)

اس لئے کہ جب دوسرے کے لئے "طعنہ" کا کوئی لفظ بولا، اور اس سے اس کا دل ٹوٹا، اور اس کی دل آزاری ہوئی تو دل آزاری کا زخم نہیں بھرتا، انسان ایک مدت تک یہ بات نہیں بھولتا کہ اس نے فلاں وقت مجھے اس طرح طعنہ دیا تھا۔ لہٰذا یہ طنز کرنا، دوسرے پر اعتراض کرنا اور طعنہ دینے کے انداز میں بات کرنا یہ دوسرے کی دل آزاری ہے اور اس کی آبرو پر حملہ ہے، اور حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ عمل انسان کے ایمان کے منافی ہے۔

مؤمن کے جان و مال اور عزت کی حرمت

ایک مسلمان کی جان، اس کا مال، اس کی آبرو، یہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ان کی اتنی حرمت بیان فرمائی ہے جس کا ہم اور آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر جب حضورِ اقدس ﷺ خطبہ دے رہے تھے تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ یہ دن جس میں تم سے گفتگو کر رہا ہوں، کونسا دن ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! یہ عرفہ کا دن ہے۔ آپ ﷺ نے دوسرا سوال کیا کہ یہ جگہ جہاں میں کھڑا ہوں، یہ کونسی جگہ ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ یہ حرم کا علاقہ ہے۔ آپ ﷺ نے پھر تیسرا سوال کیا کہ یہ مہینہ جس میں میں خطاب کر رہا ہوں، یہ کونسا مہینہ ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ یہ ذی الحجہ کا مقدس اور حرمت والا مہینہ ہے۔ پھر فرمایا کہ اے مسلمانو! تمہاری جانیں، تمہارے مال، تمہاری آبروئیں ایک دوسرے پر ایسی ہی حرام ہیں جیسے آج کا یہ دن، آج کی یہ جگہ اور آج کا یہ مہینہ حرام ہے، یعنی جو حرمت اللہ تعالیٰ نے اس مکانِ مقدس کو اور اس وقتِ مقدس کو عطا فرمائی ہے، وہی حرمت ایک مؤمن کے جان و مال اور آبرو کی ہے۔ (۱)

ایسا شخص کعبہ کو ڈھانے والا ہے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ بیت اللہ کا طواف فرما رہے تھے، طواف کرتے ہوئے آپ ﷺ نے "کعبہ" سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے بیت اللہ! تو کتنی حرمت والا ہے، کتنے تقدس والا ہے، تو کتنا عظیم الشان ہے۔ پھر آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ اے عبداللہ! کیا دنیا میں کوئی چیز ہے جس کی حرمت اور جس کا تقدس بیت اللہ سے زیادہ ہو؟ میں نے عرض کیا کہ "الله ورسوله أعلم"، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ متعین جواب تھا کہ اللہ اور اس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ کونسی چیز اس سے زیادہ حرمت والی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں تمہیں ایک چیز بتاتا ہوں جس کی حرمت اس بیت اللہ کی حرمت سے بھی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب الخطبة أيام منى، رقم: ۱۶۲۳، مسند أحمد، رقم: ۱۹۳۲

زیادہ ہے، وہ ہے ایک مسلمان کی جان، اس کا مال، اس کی آبرو، اگر ان میں سے کسی چیز کو کوئی شخص ناحق نقصان پہنچاتا ہے تو وہ شخص کعبہ کو ڈھانے والے کی طرح ہے۔ (۱)

مؤمن کا دل تجلی گاہ ہے

کسی کو طعنہ دینا، دراصل اس کی آبرو پر حملہ کرنا اور اس کی دل آزاری کرنا ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مؤمن کا دل تو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی کام کے لئے بنایا ہے، وہ یہ کہ مؤمن کا دل صرف اللہ رب العالمین کی جلوہ گاہ ہو، اس دل میں ان کا ذکر اور ان کی یاد ہو، ان کی فکر ہو، ان کی محبت ہو، یہاں تک کہ بعض صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمادیا کہ مؤمن کا دل ''عرشِ الٰہی'' ہے، یعنی مؤمن کا دل اللہ تعالیٰ کی محبت کی فرودگاہ ہے، یہ دل اللہ تعالیٰ کی ''تجلی گاہ'' ہے، چاہے انسان کتنا ہی برا ہو جائے، لیکن اگر اس کے دل میں ایمان ہے تو کسی نہ کسی وقت اس میں اللہ کی محبت ضرور اُترے گی۔ انشاء اللہ! اور جب یہ دل اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے لئے بنایا ہے تو ایک مؤمن کے دل کو توڑنا، درحقیقت اللہ جل شانہ کی جلوہ گاہ پر العیاذ باللہ حملہ کرنا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ تم کسی دوسرے مسلمان کا دل توڑو۔

مسلمان کا دل رکھنا موجبِ ثواب ہے

اگر تم نے کسی کا دل رکھ لیا، اس کو تسلی دیدی، یا کوئی ایسا کلمہ کہہ دیا جس سے اس کا دل خوش ہو گیا، تو یہ عمل تمہارے لئے بہت بڑے اجر و ثواب کا موجب ہے۔ اسی کو مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ

دل بدست آور کہ حج اکبر است

یعنی کسی مسلمان کے دل کو تھامنا، یہ حجِ اکبر کا ثواب رکھتا ہے، اور طعنہ دینا دوسرے کا دل توڑنا ہے، اور یہ گناہِ کبیرہ ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

بعض لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو یہ کہا جارہا ہے کہ امر بالمعروف کرو اور نہی عن المنکر کرو، یعنی لوگوں کو اچھائی کی دعوت دو اور اگر کوئی غلط کام میں مبتلا ہے تو اس کو بتادو اور اس کو روک دو، اور دوسری طرف یہ کہا جارہا ہے کہ دوسرے مسلمان کا دل مت توڑو۔ اب دونوں کے درمیان تطبیق کس طرح کی جائے گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں کے درمیان تطبیق اس طرح

(۱) سنن ابی ماجه، کتاب الفتن، باب حرمة دم المؤمن وماله، رقم: ۳۹۲۲

ہوگی کہ جب دوسرے شخص سے کوئی بات کہو تو خیر خواہی سے کہو، تنہائی میں کہو، نرمی سے کہو، محبت سے کہو اور اس انداز میں کہو کہ جس سے اس کا دل کم سے کم ٹوٹے۔ مثلاً تنہائی میں اس سے کہے کہ بھائی! تمہارے اندر یہ بات قابلِ اصلاح ہے، تم اس کی اصلاح کرلو۔ لیکن طعنہ کے انداز میں کہنا یا لوگوں کے سامنے سر بازار اس کو رسوا کرنا، یہ چیز انسان کے دل میں گھاؤ ڈال دیتی ہے، اس لئے حرام اور گناہ ہے۔

ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے لئے آئینہ ہے

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْمُؤْمِنَ مِرْآةُ الْمُؤْمِنِ))(۱)

''ایک مؤمن دوسرے مؤمن کا آئینہ ہے''

جس طرح اگر کوئی شخص اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھ لے تو چہرہ میں کوئی عیب یا داغ دھبہ ہوتا ہے وہ نظر آجاتا ہے اور انسان اس کی اصلاح کر لیتا ہے، اسی طرح ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے سامنے آنے کے بعد اس کو بتا دیتا ہے کہ تمہارے اندر فلاں بات ہے اس کو درست کرلو۔ یہ حدیث کا مضمون ہے۔

آئینہ سے تشبیہ دینے کی وجہ

یہ حدیث ہم نے بھی پڑھی ہے اور آپ حضرات نے بھی اس کو پڑھا اور سنا ہوگا، لیکن جس شخص کو اللہ تعالیٰ علم حقیقی عطا فرماتے ہیں، ان کی نگاہ بہت دور تک پہنچتی ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے مؤمن کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے، لوگ اتنا تو جانتے ہیں کہ آئینہ کے ساتھ یہ تشبیہ اس وجہ سے دی ہے کہ جس طرح آئینہ چہرے اور جسم کے عیوب بتا دیتا ہے، اسی طرح مؤمن بھی دوسرے مؤمن کے عیوب بتا دیتا ہے۔ لیکن آئینہ کے ساتھ تشبیہ دینے میں ایک اور وجہ بھی ہے، وہ یہ کہ آئینہ کا یہ کام ہے کہ وہ آئینہ عیب اور برائی صرف اس کو بتاتا ہے جس کے اندر وہ عیب ہوتا ہے اور جو اس کے سامنے کھڑا ہے، لیکن دوسرا شخص جو دور کھڑا ہے، اس کو نہیں بتاتا کہ دیکھو اس کے اندر یہ عیب ہے۔ اسی طرح مؤمن کا کام یہ ہے کہ جس کے اندر کمزوری یا نقص یا عیب ہے، اس کو تو محبت اور پیار سے بتا دے کہ تمہارے اندر یہ نقص اور کمزوری ہے، لیکن دوسرے کو بتاتا اور گاتا نہ پھرے کہ

(۱) سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في النصيحة والحياطة، رقم: ٤٢٧٢

فلاں کے اندر فلاں عیب ہے اور فلاں نقص ہے۔ لہٰذا دوسروں کو ذلیل کرنا، رسوا کرنا، اس کی برائیاں بیان کرنا مؤمن کا کام نہیں۔

غلطی بتائے، ذلیل نہ کرے

لہٰذا اس ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے دونوں باتیں بیان فرمادیں، ایک یہ کہ مؤمن کا کام یہ بھی ہے کہ اگر وہ دوسرے مؤمن کے اندر کوئی غلطی دیکھ رہا ہے تو اس کو بتائے۔ دوسرے یہ کہ اس کو دوسروں کے سامنے ذلیل اور رسوا نہ کرے، اس کا عیب دوسروں کو نہ بتائے۔

''طنز'' ایک فن بن گیا ہے

آج ہمارے معاشرے میں طعنہ دینے کا رواج پڑ گیا ہے، اب تو ''طنز'' باقاعدہ ایک فن بن گیا ہے اور اس کو ایک ہنر سمجھا جاتا ہے کہ کس خوبصورتی کے ساتھ بات لپیٹ کر کہہ دی گئی، اس سے بحث نہیں کہ اس کے ذریعہ دوسرے کا دل ٹوٹا یا دل آزاری ہوئی۔

انبیاء علیہم السلام طعنہ نہیں دیتے تھے

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث فرمائے، اور یہ سب اللہ کے دین کی دعوت لے کر آئے، کسی نبی کی زندگی میں کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملے گی کہ کسی نبی نے اپنے مخالف کو یا کسی کافر کو طعنہ دیا ہو، یا طنز کیا ہو، بلکہ جو بات وہ دوسروں سے کہتے تھے، وہ محبت اور خیر خواہی سے کہتے تھے، تاکہ اس کے ذریعہ دوسرے کی اصلاح ہو۔ آج کل تو طعنہ دینے اور طنز نگاری کا ایک سلسلہ چلا ہوا ہے۔

جب آدمی کو ادبیت اور مضمون نگاری کا شوق ہوتا ہے یا تقریر میں آدمی کو دلچسپی پیدا کرنے کا شوق ہوتا ہے تو پھر اس مضمون نگاری میں اور اس تقریر میں طنز اور طعن و تشنیع بھی اس کا ایک لازمی حصہ بن جاتا ہے۔

میری ایک تالیف کا قصہ

چنانچہ آج سے تقریباً تیس پینتیس سال پہلے کی بات ہے، میں اس وقت دارالعلوم کراچی سے نیا نیا فارغ ہوا تھا، اس وقت ایوب خان صاحب مرحوم کے دور میں جو عائلی قوانین نافذ ہوئے تھے، ان کے خلاف میں نے ایک کتاب لکھی، جن لوگوں نے ان قوانین کی حمایت کی تھی، ان کا ذکر کرتے

ہوئے اور ان کے دلائل کا جواب دیتے ہوئے اس کتاب میں جگہ جگہ طنز کا انداز اختیار کیا تھا۔ اس وقت چونکہ مضمون نگاری کا شوق تھا، اس شوق میں بہت سے طنزیہ جملے اور طنزیہ فقرے لکھے، اور اس پر بڑی خوشی ہوتی تھی کہ یہ بڑا اچھا جملہ چست کر دیا۔ جب وہ کتاب مکمل ہوگئی تو میں نے وہ کتاب حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو سنائی، تقریباً دو سو صفحات کی کتاب تھی۔

یہ کتاب کس مقصد سے لکھی ہے؟

جب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ پوری کتاب سن چکے تو فرمایا یہ بتاؤ کہ تم نے یہ کتاب کس مقصد کے لئے لکھی ہے؟ اگر اس مقصد سے لکھی ہے کہ جو لوگ پہلے سے تمہارے ہم خیال ہیں وہ تمہاری اس کتاب کی تعریف کریں کہ واہ واہ کیسا دندان شکن جواب دیا ہے، اور یہ تعریف کریں کہ مضمون نگاری کے اعتبار سے اور انشاء اور بلاغت کے اعتبار سے بہت اعلیٰ درجے کی کتاب لکھی ہے، اگر اس کتاب کے لکھنے کا یہ منشاء ہے تو تمہاری یہ کتاب بہترین ہے۔

لیکن اس صورت میں یہ دیکھ لیں کہ اس کتاب کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا قیمت ہوگی؟ اور اگر کتاب لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ جو آدمی غلطی پر ہے، اس کتاب کے پڑھنے سے اس کی اصلاح ہو جائے، تو یاد رکھو! تمہاری اس کتاب کے پڑھنے سے ایسے آدمی کی اصلاح نہیں ہوگی، بلکہ اس کتاب کو پڑھنے سے اس کے دل میں اور ضد پیدا ہوگی۔ دیکھو! حضرات انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے، انہوں نے دین کی دعوت دی اور کفر اور شرک کا مقابلہ کیا، لیکن ان میں سے ایک نبی بھی ایسا نہیں ملے گا جس نے طنز کا راستہ اختیار کیا ہو۔ لہٰذا یہ دیکھ لو کہ یہ کتاب اللہ کے واسطے لکھی ہے یا مخلوق کے واسطے لکھی ہے۔ اگر اللہ کے واسطے لکھی ہے تو پھر اس کتاب سے اس طنز کو نکالنا ہوگا، اور اس کا طرزِ تحریر بدلنا ہوگا۔

یہ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ نہیں ہے

مجھے یاد ہے کہ جب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات ارشاد فرمائی تو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے سر پر پہاڑ توڑ دیا، کیونکہ دو اڑھائی سو صفحات کی کتاب لکھنے کے بعد اس کو از سرِ نو اُدھیڑنا بڑا بھاری معلوم ہوتا ہے، خاص طور پر اس وقت جبکہ مضمون نگاری کا بھی شوق تھا اور اس کتاب میں بڑے مزیدار فقرے بھی تھے، ان فقروں کو نکالتے بھی دل کٹتا تھا، لیکن یہ حضرت والد ماجدؒ کا فیض تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی توفیق عطا فرمائی اور میں نے پھر پوری کتاب کو ادھیڑا اور از سرِ نو اس کو لکھا۔ پھر الحمدللہ وہ کتاب ''ہمارے عائلی قوانین'' کے نام سے چھپی۔ لیکن وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، الحمدللہ یہ بات دل میں بیٹھ گئی کہ ایک داعیِ حق کے لئے طنز کا طریقہ اور طعنہ دینے کا طریقہ اختیار کرنا درست نہیں، یہ انبیاء علیہم السلام

کا طریقہ نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیج رہے تھے کہ جاؤ اس کو جا کر ہدایت کرو اور اس کو دعوت دو، تو اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو یہ ہدایت دی جا رہی تھی:

﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى﴾(۱)

یعنی فرعون کے پاس تم دونوں نرمی سے بات کرنا، شاید وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈر جائے۔

حضرت والد صاحب یہ بات بیان کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ آج تم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے مصلح نہیں ہو سکتے، اور تمہارا مخاطب فرعون سے بڑا گمراہ نہیں ہو سکتا۔ وہ فرعون جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ وہ ایمان نہیں لائے گا، کفر ہی پر مرے گا، لیکن اس کے باوجود یہ کہا جا رہا ہے کہ اس سے جا کر نرمی سے بات کرنا، تو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نرمی سے بات کرنے کو کہا جا رہا ہے تو ہما شما کس قطار میں ہیں۔

حق بات کوئی لٹھ نہیں ہے

آج ایک طرف تو یہ فکر ہی کسی کو نہیں ہوتی کہ دین کی بات کسی کو سکھائی جائے، یا کسی کو ''نہی عن المنکر'' کیا جائے، اور اگر کسی کے دل میں یہ بات آگئی کہ حق بات دوسروں کو بتانی ہے، تو وہ اس کو اس طرح بتاتا ہے جیسے کہ وہ حق بات ایک لٹھ ہے جو اس نے جس طرح دل چاہا اُٹھا کر مار دیا، یا جیسے وہ ایک پتھر ہے جو کھینچ کر اس کو مار دیا۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کے انداز جواب

حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ دعوت دینے کے وقت طعنہ نہیں دیتے، حتیٰ کہ اگر کوئی سامنے والا شخص طعنہ بھی دے تو جواب میں یہ حضرات طعنہ نہیں دیتے۔

غالباً حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کا واقعہ ہے کہ ان کی قوم نے ان سے کہا:

﴿اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ﴾(۲)

نبی سے کہا جا رہا ہے کہ ہمارا یہ خیال ہے کہ تم انتہا درجے کے بیوقوف ہو، احمق ہو، اور ہم تمہیں

(۱) طٰہٰ: ٤٤ (۲) الأعراف: ٦٦، یہ واقعہ حضرت ہود علیہ السلام کا ہی ہے۔

کاذبین میں سے سمجھتے ہیں، تم جھوٹے معلوم ہوتے ہو۔ وہ انبیاء علیہم السلام جن پر حکمت اور صدق قربان ہیں، ان کے بارے میں یہ الفاظ کہے جارہے ہیں، لیکن دوسری طرف جواب میں پیغمبر فرماتے ہیں:

﴿يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾(۱)

''اے قوم! میں بیوقوف نہیں ہوں، بلکہ میں اللہ رب العالمین کی طرف سے ایک پیغام لے کر آیا ہوں''

ایک اور پیغمبر سے کہا جارہا ہے:

﴿اِنَّا لَنَرٰكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾(۲)

''ہم تمہیں دیکھ رہے ہیں کہ تم گمراہی میں پڑے ہوئے ہو''

جواب میں پیغمبر فرماتے ہیں:

﴿يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾(۳)

اے قوم! میں گمراہ نہیں ہوں، بلکہ میں اللہ رب العالمین کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہوں''

آپ نے دیکھا کہ پیغمبر نے طعنہ کا جواب طعنہ سے نہیں دیا۔

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

میں نے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنا۔ ایسی بزرگ ہستی کہ ماضی قریب میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ شاہی خاندان کے شہزادے تھے، اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لئے نکل پڑے اور قربانیاں دیں۔ ایک مرتبہ دہلی کی جامع مسجد میں خطاب فرما رہے تھے، خطاب کے دوران بھرے مجمع میں ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ (العیاذ باللہ) ہم نے سنا ہے کہ آپ حرام زادے ہیں۔ اتنے بڑے عالم اور شہزادے کو ایک بڑے مجمع میں یہ گالی دی، اور وہ مجمع بھی معتقدین کا ہے۔ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم جیسا کوئی آدمی ہوتا تو اس کو سزا دیتا، اگر وہ سزا نہ بھی دیتا تو اس کے معتقدین اس کی تکہ بوٹی کر دیتے، اور کم از کم اس کوتر کی بہ ترکی یہ جواب تو دے ہی دیتے کہ تو حرام زادہ، تیرا باپ حرام زادہ، لیکن حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے جو پیغمبرانہ دعوت کے حامل تھے، جواب میں فرمایا:

''آپ کو غلط اطلاع ملی ہے، میری والدہ کے نکاح کے گواہ تو آج بھی دِلّی میں موجود ہیں''

اس گالی کو ایک مسئلہ بنا دیا، لیکن گالی کا جواب گالی سے نہیں دیا۔

(۱) الأعراف: ۸۷ (۲) الأعراف: ٦٠، یہ واقعہ حضرت نوح علیہ السلام کا ہے۔ (۳) الأعراف: ٦١

ترکی بہ ترکی جواب مت دو

لہٰذا طعنہ کا جواب طعنہ سے نہ دیا جائے۔ اگرچہ شرعاً ایک آدمی کو یہ حق حاصل ہے کہ جیسی دوسرے شخص نے تمہیں گالی دی ہے، تم بھی ویسی ہی گالی اس کو دے دو، لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے وارثین انتقام کا یہ حق استعمال نہیں کرتے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زندگی یہ حق کبھی استعمال نہیں فرمایا، بلکہ ہمیشہ معاف کردینے اور درگزر کردینے کا شیوہ رہا ہے اور انبیاءؑ کے وارثین کا بھی یہی شیوہ رہا ہے۔

انتقام کے بجائے معاف کردو

ارے بھائی! اگر کسی نے تمہیں گالی دے دی تو تمہارا کیا بگڑا؟ تمہاری کونسی آخرت خراب ہوئی؟ بلکہ تمہارے تو درجات میں اضافہ ہوا، اگر تم انتقام نہیں لوگے، بلکہ درگزر کردو گے اور معاف کردو گے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں معاف کردیں گے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص دوسرے کی غلطی کو معاف کردے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس دن معاف فرمائیں گے جس دن وہ معافی کا سب سے زیادہ محتاج ہوگا یعنی قیامت کے دن، لہٰذا انتقام لینے کی فکر چھوڑ دو، معاف کردو اور درگزر کردو۔

بزرگوں کی مختلف شانیں

ایک بزرگ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت ہم نے سنا ہے کہ اولیاء کرام کی شانیں عجیب و غریب ہوتی ہیں، کسی کا کوئی رنگ ہے، کسی کا کوئی رنگ ہے اور کسی کی کوئی شان ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ ان اولیاء کرام کی مختلف شانیں دیکھوں کہ وہ کیا شانیں ہوتی ہیں۔ ان بزرگ نے ان سے فرمایا کہ تم کس چکر میں پڑ گئے، اولیاء اور بزرگوں کی شانیں دیکھنے کی فکر میں مت پڑو، اپنے کام میں لگو۔ ان صاحب نے اصرار کیا کہ نہیں! میں ذرا دیکھنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کیسے کیسے بزرگ ہوتے ہیں۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اگر تم دیکھنا ہی چاہتے ہو تو ایسا کرو کہ دہلی کی فلاں مسجد میں چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں تین بزرگ اپنے ذکر واذکار میں مشغول نظر آئیں گے۔ تم جاکر ہر ایک کی پشت پر ایک مُکّا مار دینا، پھر دیکھنا کہ اولیاء کرام کی شانیں کیا ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ صاحب گئے۔ وہاں جاکر دیکھا تو واقعۃً تین بزرگ بیٹھے ہوئے ذکر میں مشغول ہیں۔ انہوں نے جاکر پہلے بزرگ کو پیچھے سے ایک مُکّا مارا تو انہوں نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں، بلکہ اپنے ذکر واذکار میں مشغول رہے۔ جب دوسرے بزرگ کو مُکّا

مارا تو انہوں نے بھی پلٹ کر ان کو مُکّا مار دیا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ جب تیسرے بزرگ کو مُکّا مارا تو انہوں نے پلٹ کر ان کا ہاتھ سہلانا شروع کر دیا کہ آپ کو چوٹ تو نہیں لگی۔

اس کے بعد یہ صاحب ان بزرگ کے پاس واپس آئے جنہوں نے ان کو بھیجا تھا۔ ان بزرگ نے ان سے پوچھا کہ کیا ہوا؟ انہوں نے بتایا کہ بڑا عجیب قصہ ہوا۔ جب میں نے پہلے بزرگ کو مارا تو انہوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا بھی نہیں، اور دوسرے بزرگ نے پلٹ کر مجھے مُکّا مار دیا، اور تیسرے بزرگ نے پلٹ کر میرا ہاتھ سہلانا شروع کر دیا۔

میں اپنا وقت بدلہ لینے میں کیوں ضائع کروں

ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ جنہوں نے تمہیں مُکّا مارا تھا، انہوں نے زبان سے کچھ کہا تھا؟ ان صاحب نے بتایا کہ زبان سے تو کچھ نہیں کہا، بس مُکّا مارا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اب سنو! پہلے بزرگ جنہوں نے بدلہ نہیں لیا، انہوں نے یہ سوچا کہ اگر اس نے مجھے مُکّا مارا تو میرا کیا بگڑ گیا، اب میں پیچھے مڑوں، اس کو دیکھوں کہ کس نے مارا ہے اور پھر اس کا بدلہ لوں، جتنا وقت اس میں صرف ہو گا وہ وقت میں اللہ کے ذکر میں صرف کر دوں۔

پہلے بزرگ کی مثال

ان پہلے بزرگ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کو بادشاہ نے بلایا اور اس سے کہا کہ میں تمہیں ایک عالیشان انعام دوں گا۔ اب وہ شخص اس انعام کے شوق میں دوڑتا ہوا بادشاہ کے محل کی طرف جا رہا ہے اور وقت کم رہ گیا ہے اور اس کو وقت پر پہنچنا ہے۔ راستے میں ایک شخص نے اس کو مُکّا مار دیا۔ اب یہ شخص اس مُکّا مارنے والے سے اُلجھے گا یا اپنا سفر جاری رکھے گا کہ میں جلد از جلد کسی طرح بادشاہ کے پاس پہنچ جاؤں؟ ظاہر ہے کہ اس مُکّا مارنے والے سے نہیں اُلجھے گا، بلکہ وہ تو اس فکر میں رہے گا کہ میں کسی طرح جلد از جلد بادشاہ کے پاس پہنچ جاؤں اور جا کر اس سے انعام وصول کروں۔

دوسرے بزرگ کا انداز

دوسرے بزرگ جنہوں نے بدلہ لے لیا، انہوں نے یہ سوچا کہ شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ جتنی زیادتی کوئی شخص تمہارے ساتھ کرے، اتنی زیادتی تم بھی اس کے ساتھ کر سکتے ہو، اس سے زیادہ نہیں کر سکتے۔ اب تم نے ان کو ایک مُکّا مارا تو انہوں نے بھی تمہیں ایک مُکّا مار دیا۔ تم نے زبان سے کچھ نہیں بولا تو انہوں نے بھی زبان سے کچھ نہیں بولا۔

بدلہ لینا بھی خیر خواہی ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض بزرگوں سے یہ جو منقول ہے کہ انہوں نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ لے لیا، یہ بدلہ لینا بھی درحقیقت اس شخص کی خیر خواہی کی وجہ سے ہوتا ہے، اس لئے کہ بعض اولیاء اللہ کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگر کوئی انسان ان کو تکلیف پہنچائے یا ان کی شان میں کوئی گستاخی کرے اور وہ صبر کر جائیں تو ان کے صبر کے نتیجے میں یہ شخص تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

حدیث قدسی میں اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

((مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ))(۱)

''جو شخص میرے کسی ولی سے دشمنی کرے، اس کے لئے میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے''

بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے پیاروں کے ساتھ کی ہوئی زیادتی پر ایسا عذاب نازل فرماتے ہیں کہ ایسے عذاب سے اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، کیونکہ اس ولی کا صبر اس شخص پر واقع ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ والے بعض اوقات اپنے ساتھ کی ہوئی زیادتی کا بدلہ لے لیتے ہیں تاکہ اس کا معاملہ برابر ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کا عذاب اس پر نازل ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کیوں بدلہ لیتے ہیں؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو اس بات پر اشکال ہو کہ اللہ تعالیٰ کا یہ عجیب معاملہ ہے کہ اولیاء اللہ تو اتنے شفیق ہوتے ہیں کہ وہ اپنے اوپر کی ہوئی زیادتی کا بدلہ نہیں لیتے، لیکن اللہ تعالیٰ عذاب دینے پر تلے ہوئے ہیں کہ وہ ضرور عذاب دیں گے اگر بدلہ نہ لیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اولیاء اللہ کی شفقت اللہ تعالیٰ کی شفقت اور رحمت کے مقابلے میں زیادہ ہوگئی۔ پھر اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ شیرنی کو اگر کوئی جا کر چھیڑے تو وہ شیرنی طرح دے جاتی ہے اور بدلہ نہیں لیتی اور اس پر حملہ نہیں کرتی، لیکن اگر کوئی جا کر اس شیرنی کے بچوں کو چھیڑے تو پھر شیرنی اس کو برداشت نہیں کرتی، بلکہ چھیڑنے والے پر حملہ کر دیتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی شان میں لوگ گستاخیاں کرتے ہیں، کوئی شرک کر رہا ہے، کوئی اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کر رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے تحمل سے اس کو درگزر فرما دیتے ہیں، لیکن اولیاء اللہ جو اللہ تعالیٰ کے پیارے ہیں، ان کی

---

(۱) جامع العلوم والحکم، ابن رجب الحنبلی (۳۵۷/۱)، معارج القبول، حافظ بن احمد حکمی (۱۰۰۱/۳)

شان میں گستاخی کرنا اللہ تعالیٰ برداشت نہیں فرماتے، اس لئے یہ گستاخی انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں یہ منقول ہے کہ کسی اللہ کے ولی نے بدلہ لے لیا، وہ بدلہ لینا اس کی خیر خواہی کے لئے ہوتا ہے، کیونکہ اگر بدلہ نہ لیا تو نہ معلوم اللہ تعالیٰ کا کیا عذاب اس پر نازل ہو جائے گا۔

جہاں تک تیسرے بزرگ کا تعلق ہے، جنہوں نے تمہارا ہاتھ سہلانا شروع کر دیا تھا، ان کو اللہ تعالیٰ نے خلقِ خدا پر رحمت اور شفقت کا وصف عطا فرمایا تھا، اس لئے انہوں نے پلٹ کر ہاتھ سہلانا شروع کر دیا۔

پہلے بزرگ کا طریقہ سنت تھا

لیکن اصل طریقہ سنت کا وہ ہے جس کو پہلے بزرگ نے اختیار فرمایا۔ اس لئے کہ اگر کسی نے تمہیں نقصان پہنچایا ہے تو میاں! کہاں تم اس سے بدلہ لینے کے چکر میں پڑ گئے، کیونکہ اگر تم بدلہ لے لو گے تو تمہیں کیا فائدہ مل جائے گا؟ بس اتنا ہی تو ہوگا کہ سینے کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی، لیکن اگر تم اس کو معاف کر دو گے اور درگزر کر دو گے تو سینے کی آگ کیا بلکہ جہنم کی آگ بھی ٹھنڈی ہو جائے گی، انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ سے نجات عطا فرمائیں گے۔

معاف کرنا باعثِ اجر و ثواب ہے

آج کل ہمارے گھروں میں، خاندانوں میں، ملنے جلنے والوں میں، دن رات یہ مسائل پیش آتے رہتے ہیں کہ فلاں نے میرے ساتھ یہ کر دیا، فلاں نے یہ کر دیا، اب اس سے بدلہ لینے کی سوچ رہے ہیں، دوسروں سے شکایت کرتے پھر رہے ہیں، اس کو طعنہ دے رہے ہیں، اس کی دوسروں سے برائی اور غیبت کر رہے ہیں، حالانکہ یہ سب گناہ کے کام ہیں۔ لیکن اگر تم معاف کر دو اور درگزر کر دو تو تم بڑی فضیلت اور ثواب کے مستحق بن جاؤ گے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ﴾(۱)

”جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا بیشک یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے“

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿إِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ﴾(۲)

دوسرے کی برائی کا بدلہ اچھائی سے دو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جن کے ساتھ عداوت ہے وہ

(۱) الشوریٰ: ۴۳ (۲) حٰمٓ السجدۃ: ۳۴

سب تمہارے گرویدہ ہو جائیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرما دیا:

﴿وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ۝﴾(۱)

یعنی یہ عمل ان ہی کو نصیب ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ صبر کی توفیق عطا فرماتے ہیں، اور یہ دولت بڑے نصیب والے کو حاصل ہوتی ہے۔

طعنہ سے بچیں

بہر حال، پہلی چیز جو اس حدیث میں بیان فرمائی، وہ یہ ہے کہ مؤمن کا کام طعنہ دینا نہیں ہے، لہٰذا یہ طنز اور طعنہ جس سے دوسرے کی دل آزاری ہو، ایک مؤمن کے لئے اس سے مکمل پرہیز کرنا ضروری ہے، کیونکہ اگر طعنہ دینے کے نتیجے میں کسی کی دل آزاری ہوگئی، اور کسی کا دل ٹوٹا تو آپ کے اس عمل سے ایسے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب ہوا جو اس وقت تک معاف نہیں ہو سکتا جب تک وہ صاحبِ حق معاف نہ کرے، محض توبہ کر لینے سے معاف نہیں ہوگا۔ العیاذ باللہ۔ لہٰذا صبح سے شام تک کی زندگی میں ہم اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ جب لوگوں کے ساتھ ہمارا واسطہ پیش آتا ہے اور ان سے شکایتیں ہوتی ہیں تو اس میں کہیں ہم سے طعنہ اور دل آزاری کا ارتکاب تو نہیں ہوتا ہے۔ اس کا خیال کرتے ہوئے انسان زندگی گزارے، جو بات بھی دوسرے سے کہنی ہے وہ نرمی سے اور شفقت سے کہہ دو، اگر شکایت بھی کسی سے ہوئی ہے تو اس کو تنہائی میں بلا کر کہہ دو کہ تم سے یہ شکایت ہے، تا کہ اس کا دل نہ ٹوٹے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مؤمن کسی پر لعنت نہیں کرتا

اس حدیث میں دوسرا لفظ یہ ارشاد فرمایا:

((وَلَا بِاللَّعَّانِ))

مؤمن لعنت کرنے والا نہیں ہوتا، یعنی لعنت کے الفاظ زبان سے نکالنا یہ مؤمن کا کام نہیں ہے۔

ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اپنے غلام پر غصہ آ گیا۔ ظاہر ہے کہ کسی سنگین غلطی پر ہی غصہ آیا ہوگا، بلا وجہ تو وہ غصہ کرنے والے نہیں تھے، اس غصے میں کوئی لعنت کا کلمہ زبان سے نکل گیا، پیچھے سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ لعنت کا کلمہ ان کی زبان سے سن لیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کلمہ سن کر ارشاد فرمایا:

(۱) حٰمٓ السجدة: ۳۵

((لَعَّانِيْنَ وَصِدِّيْقِيْنَ كَلَّا وَرَبِّ الْكَعْبَةِ))(۱)

''صدیق'' بھی ہو اور لعنت بھی کرتے ہو، ربِ کعبہ کی قسم ایسا نہیں ہوسکتا''

یعنی یہ دو چیزیں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں، اس لئے کہ جو''صدیق'' ہو وہ لعنت کرنے والا نہیں ہوتا۔ جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ جملہ سنا کہ صدیق کا یہ کام نہیں کہ وہ لعنت کرے، لیکن چونکہ یہ غلطی ان سے ہوگئی تھی، اس لئے فوراً کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اس غلام کو آزاد کرتا ہوں۔ اس غلام کو بھی آزاد کردیا۔

روایت میں آتا ہے کہ بعض دوسرے غلاموں کو بھی آزاد کردیا۔ لہٰذا طعنہ اور لعنت دونوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔

بددعا کے الفاظ

پھر لعنت کے اندر ساری بددعائیں داخل ہیں جو ہمارے معاشرے میں رائج ہیں، خاص طور پر خواتین کی زبان پر جاری رہتی ہیں۔ مثلاً کسی کو کمبخت کہہ دیا، کسی کو یہ کہہ دیا کہ اس نے جھاڑو پیٹا ہے، یہ سب لعنت کے اندر داخل ہیں، اور بلاوجہ زبان پر لعنت کے الفاظ جاری کرنا اپنے نامۂ اعمال میں گناہوں کا اضافہ کرنا ہے۔ لہٰذا اگر کسی دوسرے پر غصہ بھی آئے تو غصے میں بھی لعنت کے الفاظ زبان سے نہ نکالے۔

یہ لعنت جائز ہے

البتہ کسی انسان کو شخصی طور پر لعنت کرنا تو حرام ہے، لیکن کسی عمل کرنے والے پر لعنت کرنا، مثلاً یہ کہنا کہ جو شخص یہ عمل کرے اس پر لعنت ہے، یا جو لوگ ایسا عمل کرنے والے ہیں ان پر لعنت ہے، یہ صورت جائز ہے۔ جیسا کہ خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح سے لعنت کرنا منقول ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَعَنَ اللّٰهُ آكِلَ الرِّبَا وَمُؤْكِلَهُ))(۲)

''اللہ تعالیٰ کی لعنت سود کھانے والے پر بھی ہے اور سود کھلانے والے پر بھی ہے''

---

(۱) جامع الأحاديث، رقم: ۲۵۵۰۸ (۳۵/۲۳)، شعب الإيمان، رقم: ٥١٥٤ (٢٩٤/٤)، المعجم الكبير للطبراني، رقم: ۹۱ (۳۵/۱۹)، الترغيب والترهيب، رقم: ٤٢١١ (٣١٢/٣)، كنز العمال، رقم: ۸۱۸۹ (٦١٦/٣)

(۲) صحيح البخاري، كتاب الطلاق، باب مهر البغي والنكاح الفاسد، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اسی طرح ایک جگہ پر آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَعَنَ اللّٰهُ الْمُصَوِّرِيْنَ))(۱)

''تصویر بنانے والوں پر اللہ کی لعنت ہے''

اسی طرح اور بہت سے برے عمل کرنے والوں پر آپ ﷺ نے لعنت فرمائی ہے، لیکن کسی آدمی کا نام لے کر شخصی طور پر لعنت کرنا حرام ہے، اس لئے کہ یہ مؤمن کا کام نہیں۔

فحش گوئی کرنا مومن کی شان نہیں

اس حدیث شریف میں تیسری بات یہ بیان فرمائی:

((وَلَا الْفَاحِشِ))

''مؤمن فحش گو نہیں ہوتا''

یعنی وہ ایسی بات زبان سے نہیں نکالتا جو فحاشی کے ذیل میں آتی ہو۔ لہٰذا جہاں غصہ کرنے کا اور بولنے کا موقع ہو وہاں فحاشی سے کام نہ لیا جائے، اور بے حیائی کے کلمات زبان سے نہ نکالے جائیں، یہ مؤمن کا شیوہ نہیں ہے۔

بدگوئی کرنا مؤمن کا شیوہ نہیں

چوتھا جملہ یہ ارشاد فرمایا:

((وَلَا الْبَذِيِّ))

مؤمن بذی نہیں ہوتا۔ ''بذی'' کے معنی ہیں ''بدگو'' ''بداخلاق'' مؤمن کسی سے بات کرتے ہوئے بدگوئی سے کام لینے والا اور برے الفاظ استعمال کرنے والا نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنی زبان کو برے کلمات سے روکتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) رقم: ٤٩٢٨، صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب لعن آكل الربا ومؤكله، رقم: ٢٩٩٤، سنن الترمذي، كتاب البيوع عن رسول الله، باب ما جاء في أكل الربا، رقم: ١١٢٧، سنن النسائي، كتاب الطلاق، باب إحلال المطلقة ثلاثا وما فيه من التغليظ، رقم: ٣٣٦٣، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في آكل الربا ومؤكله، رقم: ٢٨٩٥، سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب التغليظ في الربا، رقم: ٢٢٦٨

(۱) أحكام القرآن للجصاص (٢٤٥/٥)، الكبائر للذهبي (١٦٤/١)، الأذكار للنووي (٨١٨/١)

یہودیوں کی مکاری

حضورِ اقدس ﷺ کے زمانے کے یہودی بڑے عیار تھے، اس لئے کہ ان کی فطرت میں ہمیشہ سے عیاری اور مکاری ہے، جب انہوں نے یہ دیکھا کہ مسلمان جب آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' تو انہوں نے یہ طریقہ نکالا کہ جب وہ کسی مسلمان سے ملتے تو ''السلام علیکم'' کے بجائے ''السام علیکم'' کہتے، درمیان سے ''لام'' کو گرا دیتے تھے۔ عربی میں ''السام'' کے معنی ہیں ''موت'' لہٰذا ''السام علیکم'' کے معنی یہ ہوئے کہ تمہارے اوپر موت آجائے۔

ایک مرتبہ یہودیوں کی ایک جماعت حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں آئی اور کہا ''السام علیکم''۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا موجود تھیں، وہ سمجھ گئیں کہ یہ ''السام علیکم'' کہہ کر بظاہر سلام کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں بددعا دے رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

''عَلَيْكُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَةُ''

''تمہارے اوپر موت ہو اور تم پر لعنت ہو''

جب حضورِ اقدس ﷺ نے یہ الفاظ سنے تو آپ نے فرمایا:

((مَهْلًا يَا عَائِشَةُ!))

''اے عائشہ نرمی سے کام لو''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: یا رسول اللہ! آپ نے نہیں سنا کہ انہوں نے کیا بدتمیزی کی ہے، انہوں نے ''السام علیکم'' کہہ کر آپ کو بددعا دی ہے، اس لئے میں نے اس طریقے سے اس کا جواب دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے نہیں دیکھا کہ میں نے کیا جواب دیا، میں نے تو یہ جواب دیا ''وعلیکم'' یعنی جو کچھ تم میرے بارے میں کہہ رہے ہو، وہ تمہارے اوپر ہو۔ (۱)

نرمی زینت بخشتی ہے

دوسری روایت میں آتا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاستئذان، باب کیف یرد علی أهل الذمة السلام، رقم: ۵۷۸۶، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب النهی عن ابتداء أهل الکتاب بالسلام و کیف یرد، رقم: ۴۰۲۷، سنن الترمذی، کتاب الاستئذان و الآداب عن رسول الله، باب ماجاء فی التسلیم علی اهل الذمة، رقم: ۲۶۲۵، مسند أحمد، رقم: ۲۲۹۶۱

((یَا عَائِشَۃُ! مَا کَانَ الرِّفْقُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا زَانَہٗ وَلَا نُزِعَ عَنْ شَیْءٍ اِلَّا شَانَہٗ))(۱)

''نرمی جس چیز میں بھی ہوگی وہ نرمی اس کو زینت بخشے گی، اور جس چیز سے نرمی کو ختم کر دیا جائے گا وہ اس کو عیب دار بنا دے گا''

لہٰذا اس طریقے سے جواب دے کر تم کیوں اپنی زبان خراب کرتی ہو، صرف ''وعلیکم'' کہنے سے زبان خرابی سے بچ جاتی ہے۔

لہٰذا جب آدمی کلام کرے، چاہے غصے کے وقت بھی کلام کرے، اس وقت بھی بدگوئی کے الفاظ زبان پر نہ لائے۔ حضورِ اقدس ﷺ کے وہ اوصاف جو پچھلی کتبِ سماویہ یعنی تورات اور انجیل میں بطور علامت مذکور تھے، اس میں ایک جملہ یہ بھی تھا:

((وَلَا فَاحِشًا وَلَا مُتَفَحِّشًا وَلَا سَخَّابًا بِالْاَسْوَاقِ وَلَا یُجْزِئُ بِالسَّیِّئَۃِ السَّیِّئَۃَ وَلٰکِنْ یَعْفُوْ وَیَصْفَحُ))(۲)

''نہ وہ فاحش ہوں گے، نہ متفحش ہوں گے، اور نہ بازاروں میں شور مچانے والے ہوں گے، وہ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیں گے۔ لیکن وہ معافی اور درگزر سے کام لیں گے''

اور یہ کلمات تو آج بھی ''بائبل'' میں موجود ہیں کہ ''بازاروں میں اس کی آواز سنائی نہیں دے گی'' اور وہ مسلے ہوئے سرکنڈے کو نہیں توڑے گا'' اور ٹمٹماتی ہوئی بتی کو نہیں بجھائے گا'' یہ حضورِ اقدس ﷺ کے اوصاف ہیں۔

حضور ﷺ کی اخلاق میں بھی اتباع کریں

حضورِ اقدس ﷺ کی اتباع صرف ظاہری اعمال کی حد تک محدود نہیں ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دایاں پاؤں پہلے داخل کر دیا اور نکلتے وقت بایاں پاؤں پہلے نکال دیا۔ بیشک یہ بھی بڑے اجر و ثواب کی سنتیں ہیں، ان پر ضرور عمل کرنا چاہئے، لیکن اتباعِ سنت ان اعمال کے ساتھ محدود نہیں۔ اتباعِ سنت کا ایک لازمی حصہ یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اخلاق اور آپ ﷺ کے طریقہ کار کو اپنایا جائے۔ خاص طور پر اس وقت جب کوئی شخص دوسروں کے ساتھ معاملہ کرے تو وہ فاحش اور بذی نہ ہو،

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والأداب، باب فضل الرفق، رقم: ٤٦٩٨، مسند أحمد، رقم: ٢٣٧٩١

(۲) جامع الأحادیث، رقم: ٤٣٢٥٩ (١٢٠/٤٠)، مسند أحمد، رقم: ٢٦٠٣٢، تاریخ ابن عساکر (٣٨٠/٣)، کنز العمال، رقم: ٣٢٠٩١ (٦٠٠/١١)

اور بدکلامی نہ کرے اور طعنہ نہ دے۔

لعنت کا وبال

حضورِ اقدس ﷺ نے لعنت کی ایک اور وعید یہ بیان فرمائی ہے کہ جب ایک انسان دوسرے پر لعنت کرتا ہے، تو پہلے وہ لعنت آسمان کی طرف جاتی ہے اور پھر وہ لعنت اس شخص کی طرف آتی ہے جس پر وہ لعنت کی گئی ہے، اگر وہ لعنت کا مستحق ہوتا ہے تو اس کو وہ لعنت لگ جاتی ہے اور اگر وہ لعنت کا مستحق نہیں ہوتا تو وہ لعنت واپس اس شخص پر جا کر لگ جاتی ہے جس نے لعنت کی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص لعنت کو غلط استعمال کرے تو اس لعنت کرنے والے کا کام تمام کر دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہماری زبانوں کی ان تمام گناہوں سے حفاظت فرمائے جن کا ذکر حضورِ اقدس ﷺ نے ان احادیث میں فرمایا ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

غیبت
زبان کا ایک عظیم گناہ ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ
﴿وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا، أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ، إِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ﴾(۱)

''غیبت'' ایک سنگین گناہ

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ ان گناہوں کا بیان شروع فرما رہے ہیں جو اس زبان سے سرزد ہوتے ہیں، اور سب سے پہلے اس گناہ کو ذکر فرمایا جس کا رواج بہت زیادہ ہو چکا ہے، وہ ہے غیبت کا گناہ۔ یہ ایسی مصیبت ہے جو ہماری مجلسوں پر اور ہمارے معاشرے پر چھا گئی ہے۔ کوئی مجلس اس سے خالی نہیں، کوئی گفتگو اس سے خالی نہیں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بڑی سخت وعیدیں بیان فرمائی ہیں، اور قرآن کریم نے غیبت کے لئے اتنے سنگین الفاظ استعمال کیے ہیں کہ شاید کسی اور گناہ کے لئے اتنے سنگین الفاظ استعمال نہیں کیے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا، أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ﴾

''ایک دوسرے کی غیبت مت کرو (کیونکہ یہ ایسا برا عمل ہے، جیسے اپنے مردار بھائی کا گوشت کھانا) کیا تم میں سے کوئی اس کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے؟ تم اس کو بہت برا سمجھتے ہو''

لہٰذا جب تم اس عمل کو برا سمجھتے ہو تو غیبت کو بھی برا سمجھو اس میں ذرا غور کریں کہ اس میں غیبت

☆ اصلاحی خطبات (۴/۸۰ تا ۱۰۷)، ۱۰ دسمبر ۱۹۹۳ء، بعد از نمازِ عصر، جامع مسجد بیت المکرم، کراچی

(۱) الحجرات: ۱۲

کی کتنی شناعت بیان فرمائی ہے۔ ایک تو انسان کا گوشت کھانا، اور آدم خور بن جانا ہی کتنی شناعت کی بات ہے، اور انسان بھی کونسا؟ اپنا بھائی، اور بھائی بھی زندہ نہیں، بلکہ مردہ، اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا جتنا سنگین ہے، اتنا ہی دوسرے کی غیبت کرنا سنگین اور خطرناک ہے

''غیبت'' کی تعریف

غیبت کے کیا معنی ہے؟ غیبت کے معنی ہیں، دوسرے کی پیٹھ پیچھے برائی بیان کرنا، چاہے وہ برائی صحیح ہو، وہ اس کے اندر پائی جارہی ہو، غلط نہ ہو، پھر بھی اگر بیان کروگے تو وہ غیبت میں شمار ہوگا۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضورِ اقدس ﷺ سے سوال کیا: یا رسول اللہ غیبت کیا ہوتی ہے؟ تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا:

((ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ))

''اپنے بھائی کا اس کے پیٹھ پیچھے ایسے انداز میں ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرتا ہو''

یعنی اگر اس کو پتہ چلے کہ میرا ذکر اس طرح اس مجلس میں کیا گیا تھا، تو اس کو تکلیف ہو، اور وہ اس کو برا سمجھے، تو یہ غیبت ہے۔ ان صحابی نے پھر سوال کیا:

''إِنْ كَانَ فِيْ أَخِيْ مَا أَقُوْلُ''

اگر میرے بھائی کے اندر وہ خرابی واقعۃً موجود ہے جو میں بیان کررہا ہوں، تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگر وہ خرابی واقعۃً موجود ہے تب تو یہ غیبت ہے، اور اگر وہ خرابی اس کے اندر موجود نہیں ہے، اور تم اس کی طرف جھوٹی نسبت کررہے ہو، تو پھر یہ غیبت نہیں، پھر تو یہ بہتان بن جائے گا۔ اور دوہرا گناہ ہوجائے گا۔(۱)

اب ذرا ہماری محفلوں اور مجلسوں کی طرف نظر ڈال کر دیکھئے کہ کس قدر اس کا رواج ہو چکا ہے، اور دن رات اس گناہ کے اندر مبتلا ہیں اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔ بعض لوگ اس کو درست بنانے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ میں غیبت نہیں کررہا ہوں، میں تو اس کے منہ پر یہ بات کہہ سکتا ہوں مقصد یہ ہے کہ جب میں یہ بات اس کے منہ پر کہہ سکتا ہوں تو میرے لئے یہ غیبت کرنا جائز ہے یاد رکھو، چاہے تم وہ بات اس کے منہ پر کہہ سکتے ہو، یا نہ کہہ سکتے ہو، وہ ہر حالت میں غیبت ہے۔ بس اگر تم

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب البرّ والصلة والآداب، باب تحريم الغيبة، رقم: ٤٦٩٠، سنن الترمذى، كتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء فى الغيبة، رقم: ١٨٥٧، سنن أبى داود، كتاب الأدب، باب فى الغيبة، رقم: ٤٢٣١، مسند أحمد، رقم: ٨٦٢٥، سنن الدارمى، كتاب الرقاق، باب فى الغيبة، رقم: ٢٥٩٨

کسی کا برائی سے ذکر کر رہے ہو تو یہ غیبت کے اندر داخل ہے اور یہ گناہِ کبیرہ ہے۔

''غیبت'' گناہِ کبیرہ ہے

اور یہ ایسا ہی گناہِ کبیرہ ہے جیسے شراب پینا، ڈاکہ ڈالنا، بدکاری کرنا، کبیرہ گناہوں میں داخل ہیں۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ وہ بھی حرام قطعی ہیں، یہ بھی حرام قطعی ہے۔ بلکہ غیبت کا گناہ اس لحاظ سے ان گناہوں سے زیادہ سنگین ہے کہ غیبت کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اور حقوق العباد کا معاملہ یہ ہے کہ جب تک بندہ اس کو معاف نہ کر دے اس وقت تک وہ گناہ معاف نہیں ہوگا، دوسرے گناہ صرف توبہ سے معاف ہو سکتے ہیں لیکن یہ گناہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہوگا، اس سے اس گناہ کی سنگینی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے خدا کے لئے اس کا اہتمام کریں کہ نہ غیبت کریں، اور نہ غیبت سنیں، اور جس مجلس میں غیبت ہو رہی ہو، اس میں گفتگو کا رُخ بدلنے کی کوشش کریں، کوئی دوسرا موضوع چھیڑ دیں، اگر گفتگو کا رخ نہیں بدل سکتے تو پھر اس مجلس سے اُٹھ کر چلے آئیں۔ اس لئے کہ غیبت کرنا بھی حرام ہے، اور غیبت سننا بھی حرام ہے۔

یہ لوگ اپنے چہرے نوچیں گے

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((لَمَّا عُرِجَ بِیْ مَرَرْتُ بِقَوْمٍ لَهُمْ اَظْفَارٌ مِنْ نُحَاسٍ يَخْمُشُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَصُدُوْرَهُمْ فَقُلْتُ: مَنْ هٰؤُلَاءِ يَا جِبْرِيْلُ؟ قَالَ: هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ لُحُوْمَ النَّاسِ، وَيَقَعُوْنَ فِیْ اَعْرَاضِهِمْ))(۱)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص خادم تھے، دس سال تک حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی، وہ روایت کرتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جس رات معراج میں مجھے اوپر لے جایا گیا، تو وہاں میرا گزر ایسے لوگوں پر ہوا، جو اپنے ناخنوں سے اپنے چہرے نوچ رہے تھے میں نے حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے، اور لوگوں کی آبروؤں پر حملے کیا کرتے تھے''

(۱) سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الغیبة، رقم: ۴۲۳۵، مسند أحمد، رقم: ۱۲۸۶۱

غیبت، زنا سے بدتر ہے

چونکہ اس گناہ کو حضورِ اقدس ﷺ نے مختلف طریقوں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے پیش فرمایا، ان سب کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے، تاکہ ہمارے دلوں میں اس کی شناعت اور قباحت بیٹھ جائے ـــ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کی شناعت ہمارے دلوں میں بٹھا دے، اور اس شناعت اور قباحت سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس حدیث کے اندر آپ نے دیکھا کہ آخرت میں ان کا یہ انجام ہوگا کہ اپنے چہرے نوچ رہے ہوں گے اور ایک روایت میں جو سند کے اعتبار سے بہت مضبوط نہیں ہے، مگر معنی کے اعتبار سے صحیح ہے وہ یہ کہ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ غیبت کا گناہ زنا کے گناہ سے بھی بدتر ہے، اور وجہ اس کی یہ بیان فرمائی کہ خدا نہ کرے اگر کوئی زنا میں مبتلا ہو جائے تو جب کبھی ندامت اور شرمندگی ہوگی، اور توبہ کرلے گا تو انشاء اللہ معاف ہو جائے گا، لیکن غیبت کا گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوگا جب تک وہ شخص معاف نہ کردے جس کی غیبت اور بے آبروئی کی گئی ہے، اتنا خطرناک گناہ ہے۔[1]

غیبت کرنے والے کو جنت سے روک دیا جائے گا

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ غیبت کرنے والے ہوں گے، انہوں نے بظاہر دنیا میں بڑے اچھے اعمال کیے ہوں گے، نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، عبادتیں کیں، لیکن جس وقت وہ لوگ پل صراط پر سے گزریں گے آپ حضرات جانتے ہیں کہ پل صراط ایک پل ہے جو جہنم کے اوپر سے گزرتا ہے، ہر انسان کو اس کے اوپر سے گزرنا ہے، اب جو شخص جنتی ہے، وہ اس پل کو پار کرکے جنت میں پہنچ جائے گا، اور اللہ بچائے جس کو جہنم میں جانا ہے، اس کو اسی پل کے اوپر سے نیچے کھینچ لیا جائے گا، اور جہنم میں ڈال دیا جائے گا لیکن غیبت کرنے والوں کو پل کے اوپر جانے سے روک دیا جائے گا، اور ان سے کہا جائے گا کہ تم آگے نہیں بڑھ سکتے، جب تک اس غیبت کا کفارہ ادا نہ کردو گے یعنی جس کی غیبت کی ہے ان سے معافی نہ مانگ لو گے، اور وہ تمہیں معاف نہ کردے اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہو سکتے۔

بدترین سود غیبت ہے

ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ سود اتنا زبردست گناہ ہے کہ اس کے

(۱) مجمع الزوائد، باب ما جاء فی الغیبة والنمیمة (۸/۹۱)

اندر بے شمار خرابیاں ہیں، اور بہت سے گناہوں کا مجموعہ ہے، اور اس کا ادنیٰ گناہ ایسا ہے[1] العیاذ باللہ جیسے کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرے، دیکھئے، سود پر اتنی سخت وعید آئی ہے، کہ ایسی وعید اور کسی گناہ پر نہیں آئی۔ پھر حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ سب سے بدترین سود یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی آبرو پر حملہ کرے، کتنی سخت وعید بیان فرمائی۔[2]

غیبت، مردار بھائی کا گوشت کھانا ہے

ایک روایت میں ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کے زمانے میں دو خواتین تھیں، انہوں نے روزہ رکھا، اور روزہ کی حالت میں دونوں خواتین آپس میں بات چیت کرنے میں مشغول ہوگئیں، جس کے نتیجے میں غیبت تک پہنچ گئیں۔ کسی کا ذکر شروع ہوا تو اس کی غیبت بھی شروع ہوگئی تھوڑی دیر بعد حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں ایک صاحب آئے اور آکر بتایا کہ یا رسول اللہ ان دو خواتین نے روزہ رکھ تھا، مگر اب ان کی حالت بہت خراب ہورہی ہے، اور پیاس کی وجہ سے ان کی جان لبوں پر آرہی ہے، اور وہ خواتین مرنے کے قریب ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو بظاہر بذریعہ وحی یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ ان خواتین نے غیبت کی ہے چنانچہ آپ نے حکم فرمایا کہ ان خواتین کو میرے پاس لے آؤ۔ جب ان خواتین کو حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں لایا گیا تو آپ نے دیکھا کہ واقعۃً وہ لبِ دم آئی ہوئی ہیں۔ پھر آپ نے حکم دیا کہ ایک بڑا پیالہ لاؤ۔ چنانچہ پیالہ آیا تو آپ نے ان میں سے ایک خاتون کو حکم فرمایا کہ تم اس پیالے میں قے کرو۔ جب اس نے قے کرنی شروع کی تو قے کے ذریعہ اندر سے پیپ اور خون اور گوشت کے ٹکڑے خارج ہوئے۔ پھر دوسری خاتون سے فرمایا کہ تم قے کرو، جب اس نے قے کی تو اس میں بھی خون اور پیپ اور گوشت کے ٹکڑے خارج ہوئے۔ یہاں تک وہ پیالہ بھر گیا پھر حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ تمہارے ان بہنوں اور بھائیوں کا خون اور پیپ اور گوشت ہے جو تم دونوں نے روزے کی حالت میں کھایا تھا۔[3]

تم دونوں نے روزے کی حالت میں جائز کھانے سے تو اجتناب کرلیا، لیکن جو حرام کھانا تھا، یعنی دوسرے مسلمان بھائی کا خون اور گوشت کھانا اس کو تم نے نہیں چھوڑا، جس کے نتیجے میں تم دونوں کے پیٹوں میں یہ چیزیں بھر گئی تھیں، اس کی وجہ سے تم دونوں کی یہ حالت ہوئی اس کے بعد فرمایا کہ

---

(۱) جامع الأحادیث، رقم: ۱۲۸۲۳ (۱۶۳/۱۳)، الترغیب والترهیب، رقم: ۲۸۴۶ (۵/۳)، شعب الإیمان، رقم: ۵۲۷۹ (۴۹۹/۱۱)، کنز العمال، رقم: ۹۷۵۹ (۱۰۵/۴)

(۲) سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الغیبة، رقم: ۴۲۳۳، مسند أحمد، رقم: ۱۵۶۴

(۳) التفسیر لابن کثیر (۲۷۳/۴)، سورة الحجرات

آئندہ کبھی غیبت کا ارتکاب مت کرنا گویا اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے غیبت کی صورت مثالی دکھادی کہ غیبت کا یہ انجام ہوتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگوں کا ذوق خراب ہوگیا ہے، ہماری حس مٹ چکی ہے، جس کی وجہ سے گناہ کی شناعت اور قباحت دل سے جاتی رہی ہے۔ لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ حسِ سلیم عطا فرماتے ہیں، اور ذوقِ سلیم عطا فرماتے ہیں، ان کو اس کا مشاہدہ بھی کرادیتے ہیں۔

غیبت کرنے پر عبرت ناک خواب

چنانچہ ایک تابعی جن کا نام ربعی ہے، وہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ایک مجلس میں پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ بیٹھے ہوئے باتیں کررہے ہیں، میں بھی اس مجلس میں بیٹھ گیا۔ اب باتیں کرنے کے دوران کسی آدمی کی غیبت شروع ہوگئی۔ مجھے یہ بات بری لگی کہ ہم یہاں مجلس میں بیٹھ کر کسی کی غیبت کریں، چنانچہ میں اس مجلس سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی مجلس میں غیبت ہورہی ہو، تو آدمی کو چاہئے اس کو روکے، اور اگر روکنے کی طاقت نہ ہو تو کم از کم اس گفتگو میں شریک نہ ہو۔ بلکہ اُٹھ کر چلا جائے چنانچہ میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد خیال آیا کہ اب اس مجلس میں غیبت کا موضوع ختم ہوگیا ہوگا، اس لئے میں دوبارہ اس مجلس میں جاکر ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اب تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر غیبت شروع ہوگئی۔ لیکن اب میری ہمت کمزور پڑگئی، اور میں اس مجلس سے نہ اُٹھ سکا، اور جو غیبت وہ لوگ کررہے تھے، پہلے تو اس کو سنتا رہا اور پھر میں نے خود بھی غیبت کے ایک دو جملے کہہ دیئے۔

جب اس مجلس سے اُٹھ کر گھر واپس آیا اور رات کو سویا تو خواب میں ایک انتہائی سیاہ فام آدمی کو دیکھا، جو ایک بڑے سے طشت میں میرے پاس گوشت لے کر آیا۔ جب میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ خنزیر کا گوشت ہے اور وہ سیاہ فام آدمی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ یہ خنزیر کا گوشت کھاؤ۔ میں نے کہا کہ میں مسلمان آدمی ہوں، خنزیر کا گوشت کیسے کھاؤں؟ اس نے کہا کہ نہیں، یہ تمہیں کھانا پڑے گا، اور پھر زبردستی اس نے گوشت کے ٹکڑے اُٹھا کر میرے منہ میں ٹھونسنے شروع کردیئے۔ اب میں منع کرتا جارہا ہوں۔ وہ ٹھونستا جارہا ہے۔ یہاں تک کہ مجھے متلی اور قے آنے لگی، مگر وہ ٹھونستا جارہا تھا۔ پھر اسی شدید اذیت کی حالت میں میری آنکھ کھل گئی جب بیدار ہونے کے بعد میں نے کھانے کے وقت کھانا کھایا تو خواب میں جو خنزیر کے گوشت کا بدبودار اور خراب ذائقہ تھا، وہ ذائقہ مجھے اپنے کھانے میں محسوس ہوا، اور تین دن تک میرا یہ حال رہا جس وقت بھی میں کھانا کھاتا تو ہر کھانے میں اس خنزیر کے گوشت کا بدترین ذائقہ میرے کھانے میں شامل ہوجاتا اور اس واقعہ سے اللہ تعالیٰ نے

اس پر متنبہ فرمایا کہ ذرا سی دیر جو میں نے مجلس میں غیبت کر لی تھی، اس کا برا ذائقہ میں تین دن تک محسوس کرتا رہا اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

حرام کھانے کی ظلمت

بات دراصل یہ ہے کہ اس ماحول کی خرابی کی وجہ سے ہماری حس خراب ہوگئی ہے اس لئے گناہ کا گناہ ہونا محسوس نہیں ہوتا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ ایک جگہ دعوت میں کھانے کے ایک دو لقمے کھالیے تھے۔ وہ کھانا کچھ مشتبہ سا تھا، اس کے حرام ہونے کا کچھ شبہ تھا بعد میں فرماتے تھے کہ میں نے وہ ایک یا دو لقمے جو کھالیے تو اس کی ظلمت مہینوں تک قلب میں محسوس ہوتی رہی، اور بار بار برے خیالات دل میں آتے رہے، گناہ کرنے کے داعیے دل میں پیدا ہوتے رہے، اور گناہ کی طرف رغبت ہوتی رہی۔

گناہ کا اثر ایک یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے قلب میں ظلمت پیدا ہو جاتی ہے، اس ظلمت کے نتیجے میں دوسرے گناہ کرنے کے تقاضے پیدا ہوتے ہیں، اور ان کی طرف آدمی بڑھنے لگتا ہے، اور گناہوں کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کی حس کو درست فرمادے۔

بہر حال یہ غیبت کا گناہ بڑا خطرناک گناہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ حسِ سلیم عطا فرمادے وہی جان سکتا ہے کہ میں یہ کیا کر رہا ہوں، اس سے اندازہ کریں کہ یہ غیبت کتنا بڑا گناہ ہے۔

غیبت کی اجازت کے مواقع

البتہ ایک بات ذرا سمجھ لیجئے وہ یہ کہ غیبت کی تعریف تو میں نے آپ کو بتادی تھی کہ کسی کا پیٹھ پیچھے اس طرح ذکر کرنا کہ اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ میرا اس طرح ذکر کیا گیا ہے، تو اس کو ناگوار ہو، چاہے بات صحیح کی جارہی ہو، یہ ہے غیبت لیکن شریعت نے ہر چیز کی رعایت رکھی ہے، انسان کی فطرت کی بھی رعایت کی ہے، انسان کی جائز ضروریات کا بھی لحاظ رکھا ہے، لہٰذا غیبت سے چند چیزوں کو مستثنیٰ کر دیا ہے، اگر چہ بظاہر وہ غیبت ہیں۔ لیکن شرعاً جائز ہیں۔

دوسرے کے شر سے بچانے کے لئے غیبت کرنا

مثلاً ایک شخص ایک ایسا کام کر رہا ہے، جس سے دوسرے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، اب اگر اس دوسرے کو اس کے بارے میں نہ بتایا گیا تو وہ اس کے ہاتھوں سے نقصان کا شکار ہو جائے گا۔ اس وقت اگر آپ اس دوسرے شخص کو بتادیں کہ فلاں شخص سے ہوشیار رہنا تو ایسا کرنا جائز ہے یہ بات خود

حضورِ اقدس ﷺ نے سکھادی، ہر بات بیان کر کے دنیا سے تشریف لے گئے، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں بیٹھی ہوئی تھی اور ایک صاحب ہماری طرف سامنے سے آرہے تھے، ابھی وہ صاحب راستے ہی میں تھے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے اس شخص کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے فرمایا:

((بِئْسَ اَخُو الْعَشِيْرَةِ))

''یہ شخص اپنے قبیلے کا برا آدمی ہے''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی کہ یہ برا آدمی ہے، ذرا ہوشیار رہنا چاہئے، جب وہ شخص مجلس میں آکر بیٹھ گیا تو آپ ﷺ نے اپنی عادت کے مطابق نرم انداز میں گفتگو فرمائی، اس کے بعد جب وہ شخص چلا گیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضورِ اقدس ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ! آپ نے فرمایا کہ یہ شخص برا آدمی ہے، لیکن جب وہ آپ کے پاس آکر بیٹھ گیا تو آپ اس کے ساتھ بہت نرمی اور میٹھے انداز میں گفتگو کرتے رہے، یہ کیا بات ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ دیکھو، وہ بدترین شخص ہے جس کے شر کے خوف سے لوگ اس کو چھوڑ دیں، یعنی اس آدمی میں طبیعت کے لحاظ سے فساد ہے، اگر اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ نہ کیا جائے تو فتنہ فساد کھڑا کر سکتا ہے۔ اس لئے میں نے اپنی عادت کے مطابق اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیا۔ (۱)

علماء کرام نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے پہلے سے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتادیا کہ یہ برا آدمی ہے، بظاہر تو یہ غیبت ہے، اس لئے کہ اس کے پیٹھ پیچھے اس کی برائی کی جارہی ہے، لیکن یہ غیبت اس لئے جائز ہوئی کہ اس کے ذریعہ حضورِ اقدس ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو متنبہ کر دیا جائے تاکہ آئندہ وہ اس کے کسی فساد کا شکار نہ ہو جائیں لہٰذا کسی شخص کو دوسرے کے ظلم سے بچانے کے لئے اس کے پیٹھ پیچھے اس کی برائی بیان کر دی جائے تو یہ غیبت میں داخل نہیں، ایسا کرنا جائز ہے۔

اگر دوسرے کی جان کا خطرہ ہو

بلکہ بعض صورتوں میں اس کی برائی بیان کرنا واجب ہے، مثلاً ایک آدمی کو آپ نے دیکھا کہ وہ دوسرے پر حملے کرنے اور اس کی جان لینے کی تیاری کر رہا ہے، تو ایسی صورت میں اس دوسرے شخص کو بتانا واجب ہے کہ تمہاری جان خطرے میں ہے تاکہ وہ اپنا تحفظ کر سکے، لہٰذا ایسے

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب لم یکن النبی فاحشا ولا متفحشا، رقم: ۵۵۷۲، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی حسن العشرة، رقم: ٤١٦٥، مسند أحمد، رقم: ۲۲۹۷۷

موقع پر غیبت جائز ہو جاتی ہے۔

علانیہ گناہ کرنے والے کی غیبت

ایک حدیث ہے، جس کا صحیح مطلب لوگ نہیں سمجھتے، اور وہ یہ کہ ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((لَا غِيبَةَ لِفَاسِقٍ وَلَا مُجَاهِرٍ))(۱)

وہ یہ کہ "فاسق کی غیبت غیبت نہیں" اس کا مطلب بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص اگر کسی گناہِ کبیرہ کے اندر مبتلا ہے تو اس کی جو چاہو، غیبت کرتے رہو، وہ جائز ہے، یا جو بدعات میں مبتلا ہے، تو اس کی غیبت جائز ہے حالانکہ اس قول کا یہ مطلب نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص علانیہ فسق و فجور کے اندر مبتلا ہے، مثلاً ایک شخص علی الاعلان کھلم کھلا شراب پیتا ہے، اب اگر کوئی شخص اس کے پیٹھ پیچھے یہ کہے کہ وہ شراب پیتا ہے تو یہ غیبت نہیں، اس لئے کہ وہ تو خود ہی اعلان کر رہا ہے کہ میں شراب پیتا ہوں، اب اگر اس کے پیچھے اس کے شراب پینے کا تذکرہ کیا جائے گا تو اس کو ناگواری نہیں ہوگی، اس لئے کہ وہ تو خود علانیہ لوگوں کے سامنے پیتا ہے، لہٰذا یہ غیبت میں داخل نہ ہوگا۔

یہ بھی غیبت میں داخل ہے

لیکن جو کام وہ دوسروں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا، اگر اس کا تذکرہ آپ لوگوں کے سامنے کریں گے تو وہ غیبت میں داخل ہوگا۔ مثلاً وہ شخص کھم کھلا شراب تو پیتا ہے، کھلم کھلا سود تو کھاتا ہے، لیکن کوئی گناہ ایسا ہے جو وہ چھپ کر کرتا ہے، اور لوگوں کے سامنے اس کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا، اور وہ گناہ ایسا ہے کہ اس کا نقصان دوسرے کو نہیں پہنچ سکتا تو اب اس کی غیبت کرنا اور اس گناہ کا تذکرہ کرنا جائز نہیں، لہٰذا جس فسق و فجور کا ارتکاب وہ کھم کھلا کر رہا ہو، اس کا تذکرہ غیبت میں داخل نہیں ورنہ غیبت میں داخل ہے۔ یہ مطلب ہے اس قول کا کہ "فاسق کی غیبت غیبت نہیں"

فاسق و فاجر کی غیبت جائز نہیں

حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ ایک مجلس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما موجود تھے، اسی مجلس میں کسی شخص نے حجاج بن یوسف کی برائیاں شروع

(۱) جامع الأصول من أحاديث الرسول، رقم: ٦٢١٩ (٦٣٠٣/١)، كشف الخفاء، رقم: ٣٠٨١ (٣٦٦/٢)

کردیں تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ٹوکا اور فرمایا کہ ''دیکھو یہ جو تم ان کی برائیاں بیان کررہے ہو، یہ غیبت ہے، اور یہ مت سمجھنا کہ اگر حجاج بن یوسف کی گردن پر سینکڑوں انسانوں کا خون ہے تو اب اس کی غیبت حلال ہوگئی، حالانکہ اس کی غیبت حلال نہیں ہوئی بلکہ اللہ تعالیٰ جہاں حجاج بن یوسف سے ان سینکڑوں انسانوں کے خون کا حساب لیں گے جو اس کی گردن پر ہیں تو وہاں اس غیبت کا بھی حساب لیں گے جو تم اس کے پیچھے کررہے ہو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

لہٰذا یہ مت سمجھو کہ فلاں شخص فاسق و فاجر اور بدعتی ہے، اس کی جتنی چاہو غیبت کرلو، بلکہ اس کی غیبت کرنے سے احتراز کرنا واجب ہے۔

ظالم کے ظلم کا تذکرہ غیبت نہیں

ایک اور موقع پر بھی غیبت کو شریعت نے جائز قرار دیا ہے۔ وہ یہ کہ ایک شخص نے تم پر ظلم کیا اور اب اس ظلم کا تذکرہ کسی دوسرے سے کرتے ہو کہ میرے ساتھ یہ ظلم ہوا ہے، اور یہ زیادتی ہوئی ہے۔ یہ غیبت نہیں اس میں گناہ نہیں۔ چاہے وہ شخص جس کے سامنے تم اس ظلم کا تذکرہ کررہے ہو اس ظلم کا تدارک کرسکتا ہو، چاہے تدارک نہ کرسکتا ہو۔ مثلاً ایک شخص نے تمہاری چوری کرلی، اب جاکر تھانے میں اطلاع دو کہ فلاں شخص نے چوری کرلی ہے تو اب اگر چہ یہ اس کے پیٹھ پیچھے اس کا تذکرہ ہے، لیکن غیبت میں داخل نہیں، اس لئے کہ تمہیں نقصان پہنچایا گیا، تم پر ظلم کیا گیا اور اب تم نے اس ظلم کے خلاف جاکر شکایت کی۔ وہ تمہارے ظلم کا تدارک کرسکتے ہیں تو یہ غیبت میں داخل نہیں۔

لیکن اگر اس چوری کا تذکرہ ایسے شخص کے سامنے کیا جارہا ہے جو اس ظلم کا تدارک نہیں کرسکتا مثلاً چوری کے واقعے کے بعد کچھ لوگ تمہارے پاس آئے تو تم نے ان کے سامنے تذکرہ کردیا کہ آج رات فلاں شخص نے چوری کرلی، یا فلاں شخص نے ہمیں یہ نقصان پہنچادیا، یا فلاں شخص نے ہمارے ساتھ یہ زیادتی کردی تو یہ بیان کرنے میں کوئی گناہ نہیں، یہ غیبت میں داخل نہیں۔

دیکھئے! شریعت ہماری فطرت کی کتنی رعایت رکھتی ہے، انسان کی فطرت یہ ہے کہ جب اس کے ساتھ ظلم ہوجائے تو کم از کم وہ اپنے غم کا دکھڑا رو کر اپنے دل کی تسلی کرسکتا ہے۔ چاہے دوسرا شخص اس کا تدارک کرسکتا ہو، یا نہ کرسکتا ہو، اس لئے شریعت نے اجازت دے دی کہ اس کی اجازت ہے۔

﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ﴾(۱)

ویسے تو اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں فرماتے کہ برائی کا تذکرہ کیا جائے البتہ جس شخص پر ظلم

(۱) النساء: ۱۴۸، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کسی کی برائی علانیہ زبان پر لائی جائے، اِلّا یہ کہ کسی پر ظلم ہوا ہو''

ہو اوہ اپنا ظلم دوسروں کے سامنے بیان کرسکتا ہے۔ یہ غیبت میں داخل نہیں، بلکہ جائز ہے بہر حال، یہ مستثنیات ہیں جنہیں غیبت سے اللہ تعالیٰ نے نکال دیا ہے، اس میں غیبت کا گناہ نہیں، لیکن ان کے علاوہ ہم لوگ مجلس میں بیٹھ کر قصہ گوئی کے طور پر، وقت گزاری کے طور پر مجلس آرائی کے طور پر دوسروں کا ذکر شروع کردیتے ہیں، یہ سب غیبت کے اندر داخل ہے۔ خدا کے لئے اپنی جانوں پر رحم کرکے اس کا سدِ باب کرنے کی کوشش کریں۔ اور ذرا اس زبان کو قابو میں لائیں۔ اس کو تھوڑا سا لگام لگائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

غیبت سے بچنے کے لئے عزم اور ہمت

غیبت کا تذکرہ میں نے آپ کے سامنے کردیا اور آپ نے سن لیا۔ لیکن محض کہنے سننے سے بات نہیں بنتی، جب تک عزم اور ارادہ نہ کیا جائے، ہمت نہ کی جائے اور قدم آگے نہ بڑھایا جائے۔ یہ عزم کرلو کہ آج کے بعد اس زبان سے کوئی غیبت کا کلمہ نہیں نکلے گا انشاء اللہ، اور اگر کبھی غلطی ہوجائے تو فوراً توبہ کرلو، اور صحیح علاج اس کا یہ ہے کہ جس کی غیبت کی ہے، اس سے معافی مانگ لو کہ میں نے تمہاری غیبت کی ہے، مجھے معاف کردو، بعض اللہ کے بندے یہ کام کرتے ہیں۔

غیبت سے بچنے کا علاج

حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ میرے پاس آتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ میں نے آپ کی غیبت کی تھی، مجھے معاف کردیجئے، میں ان سے کہتا ہوں کہ میں تمہیں معاف کردوں گا، لیکن ایک شرط ہے، وہ یہ کہ پہلے یہ بتادو کہ کیا غیبت کی تھی؟ تاکہ مجھے پتہ تو چلے کہ میرے پیچھے کیا کہا جاتا ہے۔

کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟

اگر بتادو گے تو میں معاف کردوں گا۔ پھر فرمایا کہ میں اس حکمت سے پوچھتا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ جو بات میرے بارے میں کہی ہو وہ درست ہو، اور واقعی میرے اندر وہ غلطی موجود ہو، اور پوچھنے سے وہ غلطی سامنے آجائے گی تو اللہ تعالیٰ مجھے اس سے بچنے کی توفیق دے دیں گے، اس لئے میں پوچھ لیتا ہوں۔

لہٰذا اگر غیبت کبھی سرزد ہوجائے تو اس کا علاج یہ ہے کہ اس سے کہہ دو کہ میں نے آپ کی غیبت کی ہے، اس وقت دل پر بہت آرے تو چلیں گے، اپنی زبان سے یہ کہنا تو بڑا مشکل کام ہے، لیکن علاج یہی ہے، دو چار مرتبہ اگر یہ علاج کرلیا تو انشاء اللہ آئندہ کے لئے سبق ہوجائے گا۔

بزرگوں نے اس سے بچنے کے لئے دوسرے علاج بھی ذکر فرمائے ہیں، مثلاً حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب دوسرے کا تذکرہ زبان پر آنے لگے تو اس وقت فوراً اپنے عیوب کا استحضار کرو، کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو عیب سے خالی ہو، اور یہ خیال لاؤ کہ خود میرے اندر تو فلاں برائی ہے، میں دوسروں کی کیا برائی بیان کروں، اور اس عذاب کا دھیان کرو جس کا بیان ابھی ہوا کہ ایک کلمہ اگر زبان سے نکال دوں گا، لیکن اس کا انجام کتنا برا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے کہ یا اللہ! اس بلا سے نجات عطا فرما دیجئے۔ جب کبھی مجلس میں کوئی تذکرہ آنے لگے تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلو، یا اللہ! یہ تذکرہ مجلس میں آرہا ہے۔ مجھے بچا لیجئے، میں کہیں اس کے اندر مبتلا نہ ہو جاؤں۔

غیبت کا کفارہ

البتہ بعض روایات میں ہے، جو اگرچہ ہیں تو ضعیف، لیکن معنی کے اعتبار سے صحیح ہیں۔ کہ اگر کسی کی غیبت ہوگئی ہے تو اس غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ اس کے لئے خوب دعائیں کرو، استغفار کرو، مثلاً فرض کریں کہ آج کسی کو غفلت سے تنبیہ ہوئی کہ واقعۃً آج تک ہم بڑی سخت غلطی کے اندر مبتلا رہے۔ معلوم نہیں کن کن لوگوں کی غیبت کرلی۔ اب آئندہ انشاء اللہ کسی کی غیبت نہیں کریں گے۔ لیکن اب تک جن کی غیبت کی ہے، ان کو کہاں کہاں تک یاد کریں اور ان سے کیسے معافی مانگیں؟ کہاں کہاں جائیں؟ اس لئے اب ان کے لئے دعا اور استغفار کرلو۔ (۱)

حقوق کی تلافی کی صورت

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ اور میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ نے تو یہ کیا تھا کہ ایک خط لکھ کر سب کو بھجوا دیا، اس خط میں یہ لکھا کہ زندگی میں معلوم نہیں آپ کے کتنے حقوق تلف ہوئے ہوں گے، کتنی غلطیاں ہوئی ہوں گی، میں اجمالی طور پر آپ سے معافی مانگتا ہوں کہ اللہ کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔ یہ خط اپنے تمام اہلِ تعلقات کو بھجوا دیا، اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ ان حقوق کو معاف کرا دیں گے۔

اگر ایسے لوگوں کے حقوق تلف کیے ہیں جن سے اب رجوع کرنا ممکن نہیں، یا تو ان کا انتقال ہو چکا ہے، یا کسی ایسی جگہ چلے گئے ہیں کہ ان کا پتہ معلوم کرنا ممکن نہیں تو ایسی صورت کے لئے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس کی غیبت کی گئی تھی یا جن کے حقوق تلف کیے تھے ان کے حق میں

(۱) مشکوٰۃ، کتاب الآداب، باب حفظ اللسان، رقم: ۴۸۷۷ (۲/۴۱۵)

خوب دعا کرو کہ یا اللہ میں نے اس کی جو غیبت کی تھی اس کو اس کے حق میں باعثِ ترقی درجات بنا دیجئے اور اس کو دین و دنیا کی ترقیات عطا فرمایئے، اور اس کے حق میں خوب استغفار کرو تو یہ بھی اس کی تلافی کی ایک شکل ہے۔

اگر ہم بھی اپنے اہلِ تعلقات کو اس قسم کا خط لکھ کر بھیج دیں تو کیا اس سے ہماری ہیٹی ہو جائے گی؟ یا بے عزتی ہو جائے گی؟ کیا بعید ہے کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ہماری معافی کا سامان کردیں۔

معاف کرنے کرانے کی فضیلت

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ کسی دوسرے سے معافی مانگے اور سچے دل سے مانگے، اب اگر سامنے والا یہ دیکھ کر کہ یہ مجھ سے معافی مانگ رہا ہے نادم اور شرمندہ ہو رہا ہے اس کو معاف کردے تو اللہ تعالیٰ اس معاف کرنے والے کو اس دن معاف کرے گا جس دن اس کو معافی کی سب سے زیادہ حاجت ہوگی، اور اگر ایک شخص نادم ہو کر معافی مانگ رہا ہے لیکن یہ شخص معافی دینے سے انکار کر رہا ہے کہ میں معاف نہیں کروں گا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں اس کو اس دن معاف نہیں کروں گا جس دن اس کو معافی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ جب تو میرے بندوں کو معاف نہیں کرتا تو تجھے کیسے معاف کیا جائے۔

اس لئے یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص نے ندامت کے ساتھ دوسرے سے معافی مانگ لی تو اس نے اپنا فریضہ ادا کرلیا اس سے عہدہ برا ہو گیا، چاہے دوسرا شخص معاف کرے یا نہ کرے۔ اس لئے حقوق کی معافی مانگ کر ہر وقت تیار رہنا ہے۔

حضور ﷺ کا معافی مانگنا

ارے ہم اور آپ کس شمار و قطار میں ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں کھڑے ہوگئے، اور تمام صحابہ کرام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: آج میں اپنے آپ کو تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ اگر کسی شخص کو مجھ سے تکلیف پہنچی ہو، یا میں نے کسی کی جانی، مالی کسی بھی اعتبار سے حق تلفی کی ہو تو آج میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں، اگر بدلہ لینا چاہتے ہو تو بدلہ لے لو، اور اگر مجھے معاف کرنا چاہتے ہو تو معاف کردو، تاکہ کل قیامت کے دن تمہارا کوئی حق میرے اوپر باقی نہ رہے۔

بتایئے! سرکارِ دو عالم ﷺ وہ محسنِ اعظم اور پیشوائے اعظم جن کے ایک سانس کے بدلے صحابہ کرام اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار تھے، وہ فرمارہے ہیں کہ اگر میں نے کسی کو مارا ہو یا

تکلیف پہنچائی ہو تو وہ مجھ سے بدلہ لے لے۔ چنانچہ ایک صحابی کھڑے ہو گئے، اور کہا کہ یا رسول اللہ! آپ نے ایک مرتبہ میری کمر پر مارا تھا، میں اس کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ حضور ﷺ نے کسی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا، بلکہ فرمایا کہ آجاؤ، اور بدلہ لے لو، کمر پر مار لو۔ جب وہ صحابی کمر کے پیچھے آگئے تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! جس وقت آپ نے مجھے مارا تھا، اس وقت میری کمر ننگی تھی، اور اس وقت آپ کی کمر پر کپڑا ہے، اگر اسی حالت میں میں بدلہ لوں گا تو بدلہ پورا نہیں ہوگا۔ حضور ﷺ اس وقت چادر اوڑھے ہوئے تھے، آپ نے فرمایا کہ میں چادر اُٹھا دیتا ہوں۔ چنانچہ جس وقت آپ نے چادر اُٹھائی تو ان صحابی نے آگے بڑھ کر اس مہرِ نبوت کو چوم لیا، جو آپ کی پشت پر تھی، اور پھر ان صحابی نے فرمایا کہ یا رسول اللہ ﷺ! یہ گستاخی میں نے صرف اس لئے کی تا کہ مجھے اس مہرِ نبوت کا بوسہ لینے کا موقع مل جائے، آپ ﷺ مجھے معاف فرما دیں۔ (۱)

بہر حال، اس طرح حضور ﷺ نے اپنے آپ کو صحابہ کرام کے سامنے پیش کر دیا۔ اب ہم اور آپ کس شمار و قطار میں ہیں۔ اگر ہم بھی اپنے اہلِ تعلقات کو یہ لکھ کر بھیج دیں تو اس سے ہمارا کیا بگڑ جائے گا۔ شاید اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں کو معاف فرما دیں، اور اتباعِ سنت کی نیت سے جب یہ کام کریں تو اس سنت کی برکت سے اللہ تعالیٰ ہمارا بیڑہ پار فرما دیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اسلام کا ایک اصول

دیکھئے! اسلام کا ایک اصول ہے جو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا، وہ یہ کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے لئے بھی وہی پسند کرو جو دوسرے کے لئے پسند کرتے ہو، اور دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ اور جو اپنے لئے ناپسند ہو وہ دوسرے کے لئے بھی ناپسند کرو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اگر کوئی شخص اس طرح پیٹھ پیچھے برائی سے تمہارا ذکر کرے تو اس وقت تمہارے دل پر کیا گزرے گی؟ تم اس کو اچھا سمجھو گے یا برا سمجھو گے؟ اگر تم اس کو برا سمجھتے ہو، اور اپنے لئے اس کو پسند نہیں کرتے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس کو تم اپنے بھائی کے لئے پسند کرو؟ یہ دوہرے معیار وضع کرنا کہ اپنے لئے کچھ اور پیمانہ ہے، اور دوسرے کے لئے کچھ اور پیمانہ ہے۔ اسی کا نام منافقت ہے۔ گویا کہ غیبت کے اندر منافقت بھی داخل ہے۔ جب ان باتوں کو سوچو گے اور اس گناہ پر جو عذاب دیا جائے گا اس کو سوچو گے تو انشاء اللہ غیبت کرنے کے جذبے میں کمی آئے گی۔

(۱) مجمع الزوائد، باب فی وداعه صلی الله علیه وسلم (۲۷/۹)

غیبت سے بچنے کا آسان راستہ

ہمارے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ غیبت سے بچنے کا آسان راستہ یہ ہے کہ دوسرے کا ذکر کرو ہی نہیں، نہ اچھائی سے ذکر کرو، اور نہ برائی سے ذکر کرو، کیونکہ یہ شیطان بڑا خبیث ہے، اس لئے کہ جب تم کسی کا ذکر اچھائی سے کرو گے کہ فلاں شخص بڑا اچھا آدمی ہے، اس کے اندر یہ اچھائی ہے، اس کے اندر یہ اچھائی ہے تو دماغ میں یہ بات رہے گی کہ میں اس کی غیبت تو نہیں کر رہا، بلکہ اچھائی سے اس کا ذکر کر رہا ہوں، لیکن پھر یہ ہوگا کہ اس کی اچھائیاں بیان کرتے کرتے شیطان کوئی جملہ درمیان میں ایسا ڈال دے گا جس سے وہ اچھائی برائی کے اندر تبدیل ہو جائے گی، مثلاً وہ کہے گا کہ فلاں شخص ہے تو بڑا اچھا آدمی، مگر اس کے اندر فلاں خرابی ہے۔ یہ لفظ "مگر" آکر سارا کام خراب کر دے گا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ گفتگو کا رخ غیبت کی طرف منتقل ہو جائے گا، اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دوسروں کا ذکر کرو ہی نہیں، اس لئے کہ دوسرے کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، نہ اچھائی سے کرو، اور نہ برائی سے کرو، اور اگر کسی کا ذکر اچھائی سے کر رہے ہو تو پھر ذرا کمر کس کے بیٹھو، تاکہ شیطان غلط راستے پر نہ ڈالے۔

اپنی برائیوں پر نظر کرو

ارے بھائی دوسروں کی برائی کیوں کرتے ہو، اپنی طرف نگاہ کرو، اپنے عیوب کا استحضار کرو، اگر دوسرے کے اندر کوئی برائی ہے تو اس برائی کا عذاب تمہیں نہیں ملے گا۔ اس برائی کا عذاب اور ثواب وہ جانے اور اس کا اللہ جانے، تمہیں تو تمہارے اعمال کا صلہ ملنا ہے، اس کی فکر کرو۔

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اپنی طرف دھیان کرو، اپنے عیوب کو دیکھو۔ دوسرے کے عیوب کا خیال انسان کو اسی وقت آتا ہے جب انسان اپنے آپ سے اور اپنی برائیوں سے بے خبر ہوتا ہے، لیکن جب اپنے عیوب کا استحضار ہوتا ہے اس وقت کبھی دوسرے کی برائی کی طرف خیال نہیں جاتا، دوسرے کی برائی کی طرف اس کی زبان ہی نہیں اُٹھ سکتی۔ بہادر شاہ ظفر مرحوم نے بڑے اچھے شعر کہے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہے ڈھونڈتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اپنے عیوب کا استحضار ہمارے دلوں میں پیدا فرما دے۔ یہ سارا فساد اس سے پیدا ہوتا ہے کہ اپنی طرف دھیان نہیں ہے، یہ خیال نہیں ہے کہ مجھے اپنی قبر میں جا کر سونا ہے،

اس کا خیال نہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے، مگر کبھی اس کی برائی ہو رہی ہے، کبھی اس کی برائی، اس کے اندر فلاں عیب ہے، اس کے اندر فلاں عیب ہے، بس دن رات اس کے اندر پھنسے ہوئے ہیں۔ خدا کے لئے اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

گفتگو کا رخ بدل دو

جن حالات میں جس معاشرے سے ہم لوگ گزر رہے ہیں، اس کے اندر یہ کام ہے تو مشکل، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن اگر اس سے بچنا انسان کے اختیار سے باہر ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کو حرام نہ کرتے، اس لئے اس سے بچنا انسان کے اختیار میں ہے، جب کبھی مجلس کے اندر گفتگو کا موضوع تبدیل ہو تو اس کو واپس لے آؤ، اور اگر کبھی غیبت کے اندر مبتلا ہو جاؤ تو فوراً استغفار کرو، اور آئندہ بچنے کے لئے دوبارہ عزم کو تازہ کرو۔

''غیبت'' تمام خرابیوں کی جڑ

یاد رکھو، یہ غیبت ایسی چیز ہے جو فساد پیدا کرنے والی ہے، جھگڑے اس کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں، باہمی نا اتفاقیاں اس سے پیدا ہوتی ہیں، اور معاشرے میں اس وقت جو بگاڑ نظر آرہا ہے، اس میں بہت بڑا دخل اس غیبت کا ہے، اگر کوئی شخص شراب پیتا ہو العیاذ باللہ تو جو شخص ذرا بھی دین سے تعلق رکھنے والا ہے، وہ اس کو بہت بری نگاہ سے دیکھے گا، اور اس کو برا سمجھے گا، اور یہ سوچے گا کہ یہ شخص بری لت کے اندر مبتلا ہے، اور جو شخص مبتلا ہو، وہ خود یہ سوچے گا کہ مجھ سے بڑی غلطی ہو رہی ہے، میں ایک بڑے گناہ کے اندر مبتلا ہوں۔ لیکن ایک شخص غیبت کر رہا ہے تو اس کے بارے میں اتنی برائی کا احساس دل میں پیدا نہیں ہوگا، اور نہ خود غیبت کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ میں کسی بڑے گناہ کے اندر مبتلا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس گناہ کی برائی دلوں میں بیٹھی ہوئی نہیں، اور اس کی حقیقت کا پورے طریقے سے اعتقاد نہیں ہے، ورنہ دونوں گناہوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر اس کو برا سمجھ رہے ہیں، تو اس کو بھی برا سمجھنا چاہئے، اس لئے اس کی برائی دلوں میں پیدا کرو کہ یہ کتنی خطرناک بیماری ہے۔

اشارہ کے ذریعہ غیبت کرنا

ایک مرتبہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے موجود تھیں۔ باتوں باتوں میں اُمّ المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا ذکر آ گیا۔ اب بتقاضۂ بشری سوکنوں کے اندر آپس میں ذرا سی چشمک ہوا کرتی ہے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا قد ذرا چھوٹا تھا۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کا ذکر

کرتے ہوئے ہاتھ سے اس طرح اشارہ کردیا کہ وہ چھوٹے قد والی ٹھگنی ہیں۔زبان سے یہ نہیں کہا کہ وہ ٹھگنی ہیں۔ بلکہ صرف ہاتھ سے اشارہ کردیا تو نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اے عائشہ! آج تم نے ایک ایسا عمل کیا کہ اگر اس عمل کی بو اور اس کا زہر سمندر میں ڈال دیا جائے تو پورے سمندر کو بدبودار اور زہریلا بنادے۔اب آپ اندازہ لگائیں کہ نبی کریم ﷺ نے غیبت کے معمولی اشارے کی کتنی شناعت بیان فرمائی ہے اور پھر فرمایا کہ کوئی شخص مجھے ساری دنیا کی دولت لاکر دیدے تو بھی میں کسی کی نقل اُتارنے کو تیار نہیں، جس میں دوسرے کا استہزاء ہو، جس میں اس کی برائی کا پہلو نکلتا ہو۔(۱)

غیبت سے بچنے کا اہتمام کریں

اب تو نقل اُتارنا فنونِ لطیفہ کے اندر داخل ہے، اور وہ شخص تعریف و توصیف کے کلمات کا مستحق ہوتا ہے جس کو دوسرے کی نقل اُتارنے کا فن آتا ہو، حالانکہ حضورِ اقدس ﷺ یہ فرمارہے ہیں کہ کوئی شخص ساری دنیا کی دولت بھی لاکر دیدے تب بھی میں نقل اُتارنے کو تیار نہیں، اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کتنے اہتمام سے ان باتوں سے روکا ہے۔مگر ہم لوگوں کو معلوم نہیں کیا ہوگیا کہ ہم شراب پینے کو برا سمجھیں گے، زنا کاری کو برا سمجھیں گے، لیکن غیبت کو برا نہیں سمجھتے، اس کو شیرِ مادر سمجھا ہوا ہے۔کوئی مجلس اس سے خالی نہیں۔خدا کے لئے اس سے بچنے کا اہتمام کریں۔

غیبت سے بچنے کا طریقہ

اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی برائی ذہن نشین کرکے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ یا اللہ! یہ غیبت بڑا سنگین گناہ ہے، میں اس سے بچنا چاہتا ہوں، لیکن مجلسوں میں دوست احباب اور عزیز واقارب سے باتیں کرتے ہوئے غیبت کی باتیں بھی ہوجاتی ہیں، اے اللہ! میں اپنی طرف سے اس بات کا عزم کررہا ہوں کہ آئندہ غیبت نہیں کروں گا، لیکن اس عزم پر قائم اور ثابت رہنا آپ کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں۔اے اللہ! اپنی رحمت سے مجھے اس کی توفیق عطا فرما، اے اللہ! مجھے ہمت عطا فرما، حوصلہ عطا فرمادیجئے۔عزم کرکے یہ دعا کریں۔یہ کام آج ہی کرلیں۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه، رقم: ۲۴۲٦، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في الغيبة، رقم: ٤٢٣٢، مسند أحمد، رقم: ٢٣٨١٦

غیبت سے بچنے کا عزم کریں

دیکھو، جب تک انسان کسی کام کا عزم اور ارادہ نہیں کر لیتا، اس وقت تک دنیا میں کوئی کام نہیں ہو سکتا، اور دوسری طرف شیطان ہر اچھے کام کو ٹلاتا رہتا ہے۔ اچھا یہ کام کل سے شروع کریں گے۔ جب کل آئی تو کوئی عذر پیش آ گیا۔ اب کہا کہ اچھا کل سے شروع کریں گے۔ اور وہ کل پھر آتی ہی نہیں۔ جو کام کرنا ہو وہ ابھی کر لو، اس لئے کہ جس کام کو ٹلا دیا، وہ ٹل گیا۔

دیکھئے! اگر کسی کو روزگار نہ مل رہا ہو تو وہ روزگار کے لئے بے چین ہوگا یا نہیں؟ کسی پر اگر قرضہ ہو تو وہ قرضہ ادا کرنے کے لئے بے چین ہوگا یا نہیں؟ اگر کوئی بیمار ہے تو وہ شفا حاصل کرنے تک بے چین ہے یا نہیں؟ تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے اندر اس بات کی بے چینی کیوں نہیں کہ ہم سے یہ بری عادت نہیں چھوٹ رہی ہے؟ بے چینی پیدا کر کے دو رکعت صلاۃ الحاجۃ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ میں اس برائی سے بچنا چاہتا ہوں۔ اپنی رحمت سے اس برائی سے بچا لیجئے، اور ہمیں استقامت عطا فرما دیجئے۔ دعا کرنے کے بعد اس بات کا عزم کر کے اپنے اوپر پابندی عائد کریں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر اس سے کام نہ چلے تو اپنے اوپر جرمانہ مقرر کر لو، مثلاً یہ عزم کریں کہ جب کبھی غیبت ہوگی تو دو رکعت نفل پڑھوں گا، یا اتنی رقم صدقہ کروں گا، اس طرح کرنے سے رفتہ رفتہ انشاء اللہ اس سے نجات ہو جائے گی، اور اس بیماری سے نجات حاصل کرنی ہے، اور اس کی بے چینی ایسی ہی پیدا کرنی ہے جیسے بیمار آدمی علاج کرانے کے لئے بے چین ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ بھی ایک بیماری ہے، اور خطرناک ترین بیماری ہے، اور جسمانی بیماری سے زیادہ خطرناک ہے، اس لئے کہ یہ بیماری جہنم کی طرف لے جا رہی ہے۔ لہٰذا خود بھی اس سے بچیں، اور اپنے گھر والوں کو بھی بچائیں، اس لئے کہ خاص طور سے خواتین کے اندر یہ وبا بہت زیادہ عام ہے۔ جہاں چار عورتیں بیٹھیں، بس کسی نہ کسی کا ذکر شروع ہو گیا، اور اس میں غیبتیں شروع ہو گئیں۔ اگر خواتین اس پر عمل کر لیں، اور اس گناہ سے بچ جائیں تو گھرانوں کی اصلاح ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی عمل کی توفیق عطا فرمائے، اور آپ کو بھی عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

''چغلی'' ایک سنگین گناہ

ایک اور گناہ جو غیبت سے ملتا جلتا ہے، اور اتنا ہی سنگین ہے، بلکہ اس سے زیادہ سنگین ہے، وہ ہے ''چغلی'' عربی زبان میں اس کو ''نمیمۃ'' کہتے ہیں۔ اُردو زبان میں ''نمیمۃ'' کا ترجمہ چغلی سے کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ صحیح ترجمہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ ''نمیمۃ'' کی حقیقت یہ ہے کہ کسی شخص کی کوئی

برائی دوسرے کے سامنے اس نیت سے کی جائے، تاکہ سننے والا اس کو کوئی تکلیف پہنچائے، اور یہ شخص خوش ہو کہ اچھا ہوا اس کو یہ تکلیف پہنچی، یہ ہے نمیمۃ کی تعریف، اور اس میں ضروری نہیں کہ جو برائی اس نے بیان کی ہو، وہ حقیقت میں اس کے اندر موجود ہو، چاہے وہ برائی اس کے اندر موجود ہو، یا نہ ہو، لیکن تم نے محض اس وجہ سے اس کو بیان کیا تاکہ دوسرا شخص اس کو تکلیف پہنچائے، یہ ''نمیمۃ'' ہے۔

''چغلی'' غیبت سے بدتر ہے

قرآن و حدیث میں اس کی بہت زیادہ مذمت بیان کی گئی ہے۔ اور یہ غیبت سے بھی زیادہ شدید اس وجہ سے ہے کہ غیبت میں نیت کا برا ہونا ضروری نہیں کہ جس کی میں غیبت کر رہا ہوں، اس کو کوئی تکلیف اور صدمہ پہنچے، لیکن نمیمہ میں بدنیتی کا ہونا بھی ضروری ہے، اس لئے یہ نمیمہ دو گناہوں کا مجموعہ ہے، ایک تو اس میں غیبت ہے، دوسرے یہ کہ دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچانے کی خواہش اور نیت بھی ہے، اس لئے اس میں دوگنا گناہ ہے، اور اس لئے قرآن و حدیث میں اس پر بڑی سخت وعیدیں آئی ہیں، چنانچہ فرمایا:

﴿هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيمٍ﴾(۱)

کافروں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ اس شخص کی طرح چلتے ہیں جو دوسروں کے اوپر طعنے دیتا ہے، اور چغلیاں لگاتا پھرتا ہے۔

حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ))(۲)

''قتات'' یعنی چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا، ''قتات'' بھی چغل خور کو کہتے ہیں۔

عذابِ قبر کے دو سبب

اور ایک حدیث مشہور ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ تشریف لے جا رہے تھے، راستے میں ایک جگہ پر دیکھا کہ دو قبریں بنی ہوئی ہیں۔ جب آپ ان قبروں کے

---

(۱) القلم:۱۱

(۲) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب ما یکره من النمیمة، رقم: ۵۵۹۶، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان غلظ تحریم النمیمة، رقم: ۱۵۲، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول اللّٰه، باب ما جاء فی النمام، رقم: ۱۹۴۹، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب باب فی القتات، رقم: ۴۲۲۸، مسند أحمد، رقم: ۲۲۱۶۳

قریب پہنچے تو آپ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صحابہ کرام سے فرمایا:

((اِنَّھُمَا لَیُعَذَّبَانِ))

ان دونوں قبر والوں پر عذاب ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس ﷺ پر عذابِ قبر منکشف فرما دیا تھا۔ یہ عذابِ قبر ایسی چیز ہے کہ ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جب قبر کے اندر عذاب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم اور رحمت سے اس عذاب کی آوازیں ہم لوگوں سے چھپالی ہیں، ورنہ اگر اس عذاب کی آوازیں ہم لوگ سننے لگیں تو کوئی انسان زندہ نہ رہ سکے، اور زندگی میں کوئی کام نہ کر سکے، اس لئے یہ اس کی رحمت ہے کہ انہوں نے اس کو چھپالیا ہے، البتہ اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنے کسی بندے پر اس کو ظاہر بھی فرما دیتے ہیں۔

بہرحال، حضورِ اقدس ﷺ پر منکشف ہوا کہ ان دونوں پر عذاب ہو رہا ہے۔ پھر صحابہ کرام سے پوچھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ ان دونوں کو کس وجہ سے عذاب ہو رہا ہے؟ پھر فرمایا: ان کو ایسی دو باتوں کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے کہ ان باتوں سے بچنا ان کے لئے کچھ مشکل نہیں تھا، اگر یہ لوگ چاہتے تو آسانی سے بچ سکتے تھے، لیکن یہ بچے نہیں، اس کی وجہ سے یہ عذاب ہو رہا ہے۔ ایک یہ کہ ان میں سے ایک صاحب پیشاب کی چھینٹوں سے نہیں بچتے تھے، احتیاط نہیں کرتے تھے، مثلاً ایسی جگہ پر پیشاب کر دیا جس کی وجہ سے جسم پر چھینٹیں آ گئیں۔ خاص طور پر اس زمانے میں اُونٹ بکریاں چرانے کا بہت رواج تھا۔ اور ہر وقت ان جانوروں کے ساتھ رہنا ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے اکثر ان کی چھینٹیں پڑ جاتی تھیں۔ اس سے احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے۔[1]

پیشاب کی چھینٹوں سے بچیئے

یہ بڑی فکر کی بات ہے۔ الحمد للہ، ہمارے یہاں اسلام میں طہارت کے آداب تفصیل کے ساتھ سکھائے ہیں کہ کس طرح طہارت کرنی چاہئے، لیکن آج مغربی تہذیب کے زیرِ اثر ظاہری صفائی ستھرائی کا تو بڑا اہتمام ہے، لیکن طہارتِ شرعیہ کے احکام کی طرف دھیان نہیں۔ بیت الخلاء ایسے طریقوں سے بنائے جاتے ہیں کہ ان میں چھینٹوں سے احتیاط نہیں ہوتی۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب ما جاء فی غسل البول، رقم: ۲۱۱، صحیح مسلم، کتاب الطھارۃ، باب الدلیل علی نجاسۃ البول، رقم: ۴۳۹، سنن الترمذی، کتاب الطھارۃ، باب ما جاء فی التشدید فی البول، رقم: ٦٥، سنن النسائی، کتاب الطھارۃ، باب التنزہ عن البول، رقم: ۳۱، سنن أبی داؤد، کتاب الطھارۃ، باب الإستبراء من البول، رقم: ۱۹، سنن ابن ماجہ، کتاب الطھارۃ وسننھا، باب التشدید فی البول، رقم: ۳۴۱

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((اِسْتَنْزِهُوْا عَنِ الْبَوْلِ، فَإِنَّ عَامَّةَ عَذَابِ الْقَبْرِ مِنْهُ))(۱)

''پیشاب سے بچو، اس لئے کہ اکثر عذابِ قبر پیشاب کی وجہ سے ہوتا ہے''

پیشاب کی چھینٹوں کا جسم پر لگ جانا کپڑوں پر لگ جانے کی وجہ سے عذابِ قبر ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

''چغلی'' سے بچئے

اور دوسرے صاحب کو اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ دوسروں کی چغلی بہت کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس میں حضورِ اقدس ﷺ نے چغلی کو قبر کے عذاب کا سبب قرار دیا۔ اس لئے یہ چغلی کا عمل غیبت سے بھی زیادہ سخت ہے، اس لئے کہ اس میں بدنیتی سے دوسروں کے سامنے برائی بیان کرتا ہے، تاکہ دوسرا شخص اس کو تکلیف پہنچائے۔

راز فاش کرنا چغلی ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ احیاء العلوم میں فرماتے کہ دوسروں کا کوئی راز فاش کر دینا بھی چغلی کے اندر داخل ہے۔ ایک آدمی یہ نہیں چاہتا ہے کہ میری یہ بات دوسروں پر ظاہر ہو، وہ بات اچھی ہو، یا بری ہو، اس سے بحث نہیں، مثلاً ایک مالدار آدمی ہے، اور وہ اپنی دولت دوسروں سے چھپانا چاہتا ہے اور وہ یہ نہیں چاہتا کہ دوسروں کو یہ معلوم ہو کہ میرے پاس اتنی دولت ہے، اب آپ نے کسی طرح سن گن لگا کر پتہ لگا لیا کہ اس کے پاس اتنی دولت ہے۔ اب آپ ہر شخص سے کہتے پھر رہے ہیں کہ اس کے پاس اتنی دولت ہے۔ یہ جو اس کا راز آپ نے افشاء کر دیا، یہ بھی چغلی کے اندر داخل ہے اور حرام ہے۔

یا مثلاً ایک شخص نے اپنے گھریلو معاملات کے اندر کوئی پلان یا منصوبہ بنا رکھا ہے۔ آپ نے کسی طرح پتہ چلا کر دوسروں کے سامنے بیان کرنا شروع کر دیا۔ یہ چغلی ہے۔ اسی طرح کسی کا کسی قسم کا راز ہو، اس کی اجازت کے بغیر دوسروں پر افشا کرنا چغلی کے اندر داخل ہے۔ ایک حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمَجَالِسُ بِالْأَمَانَةِ))(۲)

---

(۱) کنز العمال، رقم: ۲۶۳۶۵ (۹/۳۴۵)، جامع الأحادیث، رقم: ۱۱۰۰۴ (۱۱/۳۷۳)، سنن الدارقطنی، رقم: ۴۶۹ (۲/۲۱)، الترغیب والترھیب، رقم: ۲۵۸ (۱/۸۴)

(۲) سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی نقل الحدیث، رقم: ۴۲۲۶، مسند أحمد، رقم: ۱۴۱۶۶

مجلسوں کے اندر جو بات کی جاتی ہے، وہ بھی امانت ہے۔ مثلاً کسی شخص نے آپ کو محرمِ راز سمجھ کر راز دار سمجھ کر مجلس میں آپ سے ایک بات کہی۔ اب وہ بات جا کر آپ دوسروں سے نقل کر رہے ہیں، تو یہ امانت میں خیانت ہے۔ اور یہ بھی چغلی کے اندر داخل ہے۔

زبان کے دو اہم گناہ

بہرحال زبان کے گناہوں میں سے آج دو اہم گناہوں کا بیان کرنا مقصود تھا۔ یہ دونوں گناہ بڑے عظیم اور سنگین ہیں۔ ان کی سنگینی آپ نے احادیث کے اندر سنی، لیکن جتنے یہ سنگین ہیں آج ان کی طرف سے اتنی ہی بے پروائی اور غفلت ہے۔ مجلسیں ان سے بھری ہوئی ہیں، گھر ان سے بھرے ہیں، زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے۔ رکنے کا نام نہیں لیتی۔ خدا کے لئے اس کو لگام دو اور اس کو قابو کرو، اور اس کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق اس کو چلانے کی فکر کرو، ورنہ اس کا انجام یہ ہے کہ اس کی وجہ سے گھر کے گھر تباہ ہو رہے ہیں۔ آپس میں ناچاقیاں ہو رہی ہیں۔ فتنے ہیں، عداوتیں ہیں، دشمنیاں ہیں، خدا جانے کتنے گناہوں اور فتنوں کا ذریعہ ہے، اور آخرت میں تو اس کی وجہ سے جو عذاب ہونے والا ہے، وہ اپنی جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور رحمت سے اس کی شناعت اور قباحت سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

غیبت اور اس کا علاج ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِیْنَ. أَمَّا بَعْدُ!

اب تک ''بدنظری'' سے متعلق بیان چل رہا تھا اور اس سے بچنے کی تدبیریں بتائی گئی تھیں، آگے ایک اور باطنی بیماری کا تذکرہ ہے، وہ ہے ''غیبت''، یہ بیماری ایسی ہے کہ شاید ہی کوئی اللہ کا بندہ اللہ کی توفیق سے بچا ہوا ہو، ورنہ سب لوگ کسی نہ کسی درجے میں اس بیماری میں مبتلا ہیں، اور یہ بیماری اتنی سنگین ہے کہ قرآن کریم نے اس کے لئے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں کہ کسی اور بیماری کے لئے ایسے الفاظ استعمال نہیں کیے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَعْضُکُمْ بَعْضًا، أَیُحِبُّ أَحَدُکُمْ أَنْ یَأْکُلَ لَحْمَ أَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ﴾(۱)

''تجسس نہ کرو اور تم میں سے بعض لوگ دوسرے بعض کی غیبت نہ کریں، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے، پس تم اس کو ناپسند کرتے ہو''

اس آیت میں غیبت کو مردار بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا۔ ایک تو انسان کا گوشت، اور انسان بھی بھائی، اور بھائی بھی مردہ، کوئی بھی انسان جس کے اندر انسانیت کا ذرّہ بھی موجود ہوگا، وہ اس کام کا نہ تو ارتکاب کرسکتا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں سوچ سکتا ہے، لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ غیبت کرنا بھی ایسا ہے جیسے مردار بھائی کا گوشت کھانا۔ اور یہ ''غیبت'' گناہِ کبیرہ ہے، معمولی گناہ نہیں ہے۔

غیبت کے گناہ کی شدت

یہ غیبت کرنا ایسا ہی گناہ ہے جیسے شراب پینا گناہ ہے، جیسے خنزیر کھانا گناہ ہے، جیسے چوری کرنا

☆ اصلاحی مجالس (۱/۱۲۱ تا ۲۱۲)، رمضان المبارک، جامع مسجد دارالعلوم، کراچی

(۱) الحجرات: ۱۲

اور ڈاکہ ڈالنا گناہ ہے۔ بلکہ غیبت کرنا ان گناہوں سے زیادہ سنگین ہے، کیونکہ شراب پینے اور خنزیر کھانے کا تعلق خالصۃً حقوق اللہ سے ہے، اگر کوئی شخص شراب نوشی کرتا ہے، یا خنزیر کھاتا ہے تو وہ اپنی ذات کا گناہ کرتا ہے، اس کا حقوق العباد سے کوئی تعلق نہیں، لہٰذا اگر کبھی اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق عطا فرمادیں گے تو شراب کا گناہ بھی معاف ہوجائے گا اور خنزیر کھانے کا گناہ بھی معاف ہوجائے گا۔ لیکن غیبت کا گناہ ایسا ہے کہ اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اور حقوق العباد کا اصول یہ ہے کہ یہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک صاحبِ حق معاف نہ کردے، ہزار توبہ استغفار کرتے رہو، نماز روزے کرتے رہو، لیکن یہ معاف نہیں ہوں گے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنا حق تو معاف کردوں گا، لیکن اگر تم نے کسی بندے کی جان کو نقصان پہنچایا، یا مال کو نقصان پہنچایا، یا اس کی آبرو کو نقصان پہنچایا، یا تم نے اس کی کوئی بھی حق تلفی کی، تو جب تک وہ معاف نہیں کرے گا یا جب تک اس کا حق ادا نہیں کردو گے، میں معاف نہیں کروں گا۔ حقوق العباد کا معاملہ اتنا خطرناک ہے، لیکن ہم نے اس کو اتنا معمولی سمجھ رکھا ہے جیسے ناک پر مکھی آبیٹھی اور اس کو اُڑا دیا۔ اور ''غیبت'' بھی حقوق العباد میں سے ہے۔

غیبت کی تعریف

''غیبت'' کسے کہتے ہیں؟ غیبت یہ ہے کہ کسی مسلمان کا تذکرہ اس کی پیٹھ پیچھے اور اس کی غیر موجودگی میں اس انداز سے کیا جائے کہ اگر اس کو پتہ چلے کہ میرا تذکرہ اس انداز سے کیا گیا ہے تو اس کو ناگوار گزرے، تو یہ غیبت ہے اور گناہ ہے۔ اب ہم اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ہم لوگ صبح سے لے کر شام تک آپس میں جو گفتگو کرتے ہیں، اس میں غیبت ہوتی ہے یا نہیں؟ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ میں اس کے بارے میں یہ بات جو کہہ رہا ہوں، میں اس کے منہ پر کہہ دوں، اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ غیبت تو اس وقت ہوگی جب منہ پر نہ کہہ سکیں، میں تو اس کے منہ پر کہنے کو تیار ہوں۔ ارے بھائی! تم اس کے منہ پر کہنے کو تیار ہو یا نہ ہو، اگر وہ بات اس کی ناگواری کا سبب ہے تو بس غیبت کی تعریف اس پر صادق آگئی اور وہ گناہ ہوگیا، اور تم نے مردار بھائی کا گوشت کھالیا۔ العیاذ باللہ۔

غیبت اور بہتان میں فرق

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضورِ اقدس ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! میں جس شخص کی غیبت کررہا ہوں، اس میں وہ بات واقعی موجود ہو، جو میں کہہ رہا ہوں، کیا پھر بھی گناہ ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو بات تم اس کے بارے میں کہہ رہے ہو، وہ بات اس کے اندر موجود

ہے اور تم اس کی سچی برائی بیان کر رہے ہو تو یہ غیبت ہے، اور اگر تم جھوٹی بات بیان کر رہے ہو، اور وہ بات اس کے اندر موجود نہیں ہے تو پھر غیبت کے ساتھ ''بہتان'' لگانے کا گناہ بھی ہوگا۔ (۱)

ایک شخص کے اندر ایک برائی موجود ہے، تم نے ایک مجلس کے اندر اس کی وہ خرابی بیان کر دی، مثلاً تم نے یہ کہہ دیا کہ فلاں آدمی تو بڑا جھوٹا ہے، اور حقیقت میں بھی وہ جھوٹا ہے، تو تمہارا اس کے پیٹھ پیچھے اس کے جھوٹا ہونے کا تذکرہ کرنا غیبت ہے اور گناہ ہے، بشرطیکہ اس کو اپنا جھوٹا کہلوانا ناگوار ہو۔ اور اگر وہ جھوٹا نہیں ہے، پھر بھی تم نے اس کو جھوٹا کہہ دیا، تو اس صورت میں تم نے دو گناہ کیے۔ ایک غیبت کرنے کا گناہ کیا اور ایک بہتان لگانے کا گناہ کیا۔ لہٰذا غیبت بڑا سنگین گناہ ہے، آدمی اپنی زبان کو سنبھال کر رکھے، اور اللہ تعالیٰ سے حفاظت کی توفیق مانگتا رہے تب تو اس گناہ سے بچ سکتا ہے، ورنہ اس گناہ کے اندر مبتلا ہو جائے گا۔

ایک پروفیسر صاحب کا غیبت پر تبصرہ

میں نے ایک مرتبہ غیبت کے بارے میں ایک مضمون لکھا، ایک یونیورسٹی کے پروفیسر صاحب نے وہ مضمون پڑھ کر مجھے ایک خط لکھا کہ آپ نے اس مضمون میں غیبت کی بہت برائی بیان کی کہ یہ غیبت گناہِ کبیرہ ہے، حرام اور ناجائز ہے، اس کو چھوڑنا چاہئے۔ میں نے اس غیبت پر بہت غور کیا، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر ''غیبت'' کو زندگی سے نکال دیں تو یہ زندگی پھیکی ہے، اس میں پھر کوئی مزہ ہی نہیں ہے، اس لئے کہ جب ہم دو چار آدمی مل کر بیٹھتے ہیں اور کوئی بات چیت چلتی ہے تو اس بات چیت میں غیبت شامل نہ ہو تو ہم پھر کس موضوع پر بات چیت کریں؟ بس پھر تو ''اللہ اللہ'' ہی کریں، اور کوئی ہنسی مذاق کی بات، کوئی تفریح کی بات، کوئی دل لگی کی گفتگو تو ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ نے اتنا لمبا چوڑا مضمون لکھا اور اس کی اتنی برائیاں بیان کیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ سب لوگ اپنی تفریح وغیرہ سے دست بردار ہو جائیں اور زندگی کا لطف ہی ختم کر دیں۔ چونکہ وہ پروفیسر صاحب تھے، اس لئے اپنی ذہنی سوچ کے مطابق آخر میں یہ کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ اسلام ایسی چیز کو منع کرے گا جس کو انسان ہر وقت کرتا ہی ہے، اور اگر نہ کرے تو مزہ ہی نہ رہے یہ خط لکھ کر بھیجا۔

میں نے اس خط کے جواب میں لکھا کہ یہ جو آپ فرما رہے ہیں کہ اگر ''غیبت کو زندگی سے

(۱) صحیح مسلم، کتاب البرّ والصلة والآداب، باب تحریم الغیبة، رقم: ٤٦٩٠، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء فی الغیبة، رقم: ۱۸۵۷، سنن أبی داود، کتاب الأدب، باب فی الغیبة، رقم: ٤٢٣١، مسند أحمد، رقم: ٨٦٢٥، سنن الدارمی، کتاب الرقاق، باب فی الغیبة، رقم: ۲۵۹۸

نکال دیا جائے تو زندگی کا مزہ ہی ختم ہو جائے، تو آپ کی زندگی کا مزہ تو ''غیبت'' نہ کرنے کی وجہ سے ختم ہو جائے گا، لیکن جب دوسرا شخص آپ کی غیبت کر رہا ہو، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ جب آپ کو پتہ چلے کہ پروفیسر صاحب کے بارے میں فلاں شخص نے فلاں مجلس میں یہ بات کہی، فلاں شخص نے فلاں مجلس میں یہ بات کہی تو اس وقت آپ کو زندگی کا لطف آئے گا یا کیا حال ہوگا؟

اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک معیار رکھو

بات دراصل یہ ہے کہ ہر انسان اپنے لطف اور مزہ کو تو دیکھتا ہے، لیکن یہ نہیں دیکھتا کہ جو کام میں دوسرے کے ساتھ کر رہا ہوں، اگر دوسرا میرے ساتھ کرے تو مجھ پر کیا گزرے؟ مجھ پر کیا بیتے؟ حدیث شریف میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسا کیمیا کا نسخہ بیان فرمادیا کہ ایک پیغمبر ہی ایسا نسخہ بیان کرسکتا ہے، کسی اور کے بس کا کام نہیں۔ اگر اس نسخے پر عمل کرلیا جائے تو معاشرے کے سارے مسائل حل ہو جائیں اور معاشرے کے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں، ساری خرابی اس نسخے کو فراموش کرنے کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے، وہ نسخہ یہ ہے:

((اَنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَتَكْرَهُ لَهُمْ مَا تَكْرَهُ لِنَفْسِكَ))(۱)

''اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو، اور دوسروں کے لئے وہی بات ناگوار سمجھو جس کو تم اپنے لئے ناگوار سمجھتے ہو''

یہ جو ہم نے دوہرے پیمانے بنا رکھے ہیں کہ اپنے لئے پیمانہ کچھ اور ہے اور دوسرے کے لئے کچھ اور ہے، اپنے لئے ترازو اور ہے اور دوسرے کے لئے اور ہے، اس کی وجہ سے معاشرے میں ساری خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ لہٰذا ہر معاملے میں یہ دیکھو کہ میں جو معاملہ دوسرے کے ساتھ کر رہا ہوں، اگر میں اس کی جگہ پر ہوتا اور وہ میری جگہ پر ہوتا تو میرے اُوپر کیا گزرتی۔ ہر کام کرنے سے پہلے یہ سوچ لے تو کبھی بھی اس سے دوسرے کی حق تلفی نہ ہو اور ناانصافی نہ ہو اور دوسرے کا حق پامال نہ ہو۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب من الإیمان أن یحب لأخیه ما یحب لنفسه، رقم:۱۲، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الدلیل علی أن من خصال الفطرة أن یحب لأخیه، رقم:٦٤، سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله صلی الله علیه وسلم،باب من اتقی المحارم فهو أعبد الناس، رقم:۲۲۲۷، سنن النسائی، کتاب الإیمان وشرائعه، باب علامة الإیمان، رقم:٤۹۳۰، سنن ابن ماجه، کتاب المقدمة، باب فی الإیمان، رقم:٦٥، مسند أحمد، رقم:۲۱۱۱۳، حدیث معاذ بن جبل رضی الله عنه، سنن الدارمی، رقم:۲٦۲۳

لہٰذا غیبت کرتے وقت ذرا یہ سوچو کہ اگر اس کی جگہ میں ہوتا، مجلس کے اندر میرا اس انداز سے ذکر ہورہا ہوتا، اور میرے بارے میں یہ باتیں کہی جارہی ہوتیں جو میں دوسروں کے بارے میں کہہ رہا ہوں، تو مجھے یہ چیز پسند ہوتی یا نہیں؟ اگر پسند نہیں ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ "غیبت" ہے اور اس سے بچنا ہے۔

لوگ یہ کہتے ہیں کہ غیبت سے بچا نہیں جاتا۔ میں کہتا ہوں کہ غیبت اختیار سے ہوتی ہے، غیر اختیاری نہیں ہوتی، اور جب غیبت کرنا اختیار میں ہے تو بچنا بھی اختیار میں ہے، لہٰذا اس سے بچنا ضروری ہے۔

غیبت کی اجازت کے مواقع

البتہ جس موقع پر کسی مسلمان کو نقصان سے بچانا منظور ہو تو اس وقت غیبت جائز ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص آپ کے پاس آیا، اس نے کہا کہ فلاں شخص نے میری بیٹی کے لئے رشتہ بھیجا ہے، آپ کی نظر میں یہ آدمی کیسا ہے؟ اب اگر آپ کی نظر میں اس شخص کی ایسی برائی ہے جو شادی بیاہ کے معاملے میں قابلِ غور ہوا کرتی ہے، تو اس صورت میں اگر آپ وہ برائی اس کو بتادیں تاکہ وہ اور اس کی بیٹی نقصان سے بچ جائے تو یہ غیبت میں داخل نہیں۔ یا مثلاً ایک شخص دھوکہ باز ہے اور دھوکہ دے کر لوگوں سے پیسے حاصل کرلیتا ہے۔ اگر آپ کسی کو یہ بتادیں کہ اس شخص سے ذرا سوچ سمجھ کر معاملہ کرنا، یہ آدمی معاملے کا ٹھیک نہیں ہے، تو یہ غیبت نہیں، اس لئے کہ دوسرے شخص کو نقصان سے بچانا منظور ہے۔

لہٰذا جہاں دوسرے کو تنبّہ کرنے کی ضرورت ہو، اور دوسرے کو دنیا یا آخرت کے نقصان سے بچانے کی ضرورت ہو، وہاں کسی کی واقعی برائی بیان کرنا غیبت میں داخل نہیں، یہ جائز ہے

فاسق اور گناہ گار کی غیبت کرنا

عام طور پر لوگوں میں مشہور ہے کہ جو فاسق و فاجر ہو، اس کی غیبت جائز ہے۔ مطلقاً اس طرح سے یہ بات درست نہیں، بلکہ جس طرح نیک آدمی کی غیبت جائز نہیں اسی طرح سے فاسق و فاجر کی غیبت بھی جائز نہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص کسی گناہ کو اس طرح علانیہ کرتا ہے کہ اس گناہ کی اپنی طرف نسبت سے نہیں شرماتا، اور نہ اس کو وہ برا سمجھتا ہے کہ یہ گناہ اس کی طرف منسوب ہو، تو اگر اس گناہ کا ذکر اس کی غیر موجودگی میں کر کے اس کی طرف منسوب کریں تو یہ جائز ہے۔ مثلاً ایک آدمی علانیہ شراب پیتا ہے اور سب کو بتا کر پیتا ہے، اب اگر آپ اس کے پیٹھ پیچھے یہ ذکر کریں کہ فلاں شخص شراب

پیتا ہے، ظاہر ہے کہ آپ کے اس ذکر کرنے سے اس کو کوئی تکلیف اس لئے نہیں ہوگی کہ وہ خود دوسروں کو بتاتا ہے کہ میں شراب پیتا ہوں، لہٰذا یہ غیبت ناجائز نہیں ہے۔ لیکن جس گناہ کو وہ چھپانا چاہتا ہے، اور اس گناہ کا اپنی طرف منسوب ہونے کو برا سمجھتا ہے، اور اس کے ذکر سے اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے پیٹھ پیچھے اس گناہ کا تذکرہ کرنا ناجائز ہے، چاہے وہ سچی بات ہو، وہ غیبت ہے، اور حرام ہے۔ لہٰذا اگر زبان پر لگام نہ ڈالی جائے تو یہ انسان کو گناہ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اور غیبت جس طرح کرنا جائز نہیں، اسی طرح سننا بھی جائز نہیں۔

دوسروں کا تذکرہ ہی نہ کریں

اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ احتیاط اس میں ہے کہ دوسروں کا تذکرہ ہی مت کرو، نہ اچھائی سے اور نہ برائی سے، کیونکہ جب دوسرے کا ذکر اچھائی سے بھی کرو گے تو شیطان آخر میں برائی کے تذکرے میں مبتلا کر ہی دے گا کہ بھائی! فلاں آدمی تو بڑا اچھا ہے لیکن اس میں ذرا یہ برائی بھی ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ انسان دوسرے کا ذکر ہی نہ کرے۔

اپنی فکر کریں

پھر دوسرے کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، بس اپنی فکر کرو۔ بقول کسی کے ع

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

جس کو اپنے عیوب کی فکر ہو وہ دوسروں کے عیوب کہاں تلاش کرے گا۔ جو خود بیمار ہو اور اس کے پیٹ میں درد ہو رہا ہو، وہ دوسروں کی بیماریوں کی کہاں فکر کرے گا۔ جب انسان اپنی فکر میں پڑ جاتا ہے کہ میں کس عیب کے اندر مبتلا ہوں، میرے اندر کیا خرابی ہے، اس کی کس طرح اصلاح کروں اور کس طرح اس کا تدارک کروں تو پھر اس سے دوسرے کی غیبت نہیں ہوتی۔ بہادر شاہ ظفر نے بڑے اچھے اشعار کہے۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہے ڈھونڈتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

جب اپنی برائی پر نظر پڑی تو پتہ چلا کہ کوئی برا نہیں ہے، سب سے برا میں ہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اپنے نفس کے عیوب پر نگاہ ڈالنے کی اور ان کے ادراک کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

غیبت کا ایک عملی علاج

بہر حال، غیبت کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات کی تشریح عرض کرتا ہوں۔ حضرت والا نے فرمایا:

"سالک کے سامنے کوئی غیبت یا لایعنی کلام کرے اور اس کو منع کرنے پر قدرت نہ ہو تو خود اُٹھ جانا چاہئے اور اس کی دل شکنی کا خیال نہ کرے، کیونکہ دوسرے کی دل شکنی سے اپنی دین شکنی زیادہ قابلِ احتراز ہے، یوں اگر نہ اُٹھ سکے تو کسی بہانہ سے اُٹھ جائے یا قصداً فی الفور مباح تذکرہ شروع کر دیا جائے تا کہ وہ قطع ہو جائے۔"(۱)

جیسا کہ ابھی بتایا کہ غیبت جس طرح کرنا ناجائز ہے، اسی طرح سننا بھی ناجائز ہے۔ لہٰذا اگر مجلس میں غیبت شروع ہو گئی تو اب کیا کیا جائے؟ حضرت فرماتے ہیں کہ اگر منع کرنے پر قدرت ہے تو روک دے، روکنے کے دو طریقے ہیں: ایک طریقہ تو یہ ہے کہ صاف صاف کہہ دے کہ دیکھو اس طرح تذکرہ کرنے سے غیبت ہو جائے گی، چھوڑو اس تذکرے کو۔ اور اگر اس طرح نہیں کہہ سکتے تو دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خود موضوعِ کلام بدل دے اور کوئی اور بات چھیڑ دے تا کہ وہ قصہ ختم ہو جائے۔ اور اگر ان دونوں طریقوں پر قدرت نہ ہو تو وہاں سے اُٹھ جائے، اس مجلس میں نہ بیٹھے۔

دل شکنی کی پرواہ نہ کرے

آگے ایک اصول بیان فرما دیا کہ اس کی دل شکنی کا خیال نہ کرے، کیونکہ دوسرے کی دل شکنی سے اپنی دین شکنی زیادہ قابلِ احتراز ہے۔ ہمارے ہاں افراط اور تفریط حد درجے کی ہے۔ ایک طرف تو یہ عالم ہے کہ حقوق العباد کی پرواہ ہی نہیں، جس کا جو حق چاہا مار لیا، چاہے وہ جانی حق ہو یا مالی حق ہو۔ اور دوسری طرف یہ ہے کہ اگر کسی کو حقوق العباد کا خیال ہے تو وہ اس درجہ اس کے اندر آگے بڑھ جاتا ہے کہ اس کے نتیجے میں اپنے فرائضِ شرعیہ کے اندر کوتاہی کرنا شروع کر دیتا ہے۔

وقت پر نماز پڑھنا فرض ہے

چنانچہ ایک ڈاکٹر صاحب تھے، ان کی بیوی نے مجھ سے بتایا کہ میرے شوہر ویسے تو بہت اچھے ہیں، لیکن مطب کے اوقات میں نماز نہیں پڑھتے۔ میں ان سے کہتی ہوں کہ مطلب کے اوقات کے

(۱) انفاس عیسیٰ: ص ۱۴۹

دوران جب نماز کا وقت آئے تو نماز پڑھ لیا کرو، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ میں تو لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں اور یہ حقوق العباد میں سے ہے، مطب میں مریض بیٹھے ہوں اور میں اپنی نماز شروع کر دوں؟ چنانچہ وہ مطلب بند کر کے رات کو جب گھر آتے ہیں تو عصر، مغرب اور عشاء تینوں نمازیں اکٹھی پڑھ لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں تو خدمتِ خلق کرتا ہوں، اور خدمتِ خلق کے دوران نمازیں قضا ہو جائیں تو اس میں کچھ حرج نہیں۔

بھائی! خدمتِ خلق تم پر اس طرح فرضِ عین نہیں جس طرح نماز فرضِ عین ہے۔ دوسرے اس خدمتِ خلق کے ساتھ نماز کا کوئی تعارض بھی نہیں ہے۔ اگر تم عصر کی چار رکعت پڑھ کر دوبارہ مریضوں کو دیکھنا شروع کر دو تو اس میں کیا تکلیف ہوگی؟ لہٰذا نفس نے نمازیں قضا کرنے کا ایک بہانہ تلاش کر لیا کہ خدمتِ خلق ہو رہی ہے۔ یہ سب افراط اور تفریط ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دین کی صحیح فہم اور سمجھ نہیں۔ اسی لئے حضرت فرماتے ہیں کہ دوسرے کی دل شکنی سے بچنے کی خاطر اپنے دین کو توڑ دینا ٹھیک نہیں۔ لہٰذا یہ خیال کرنا کہ میں اگر اس کو غیبت سے روکوں گا تو اس کا دل برا ہوگا، یا میں اُٹھ کر چلا جاؤں گا تو اس کا دل برا ہوگا، یاد رکھئے! اگر معصیت سے بچنے کے نتیجے میں دوسرے کا دل برا ہوتا ہے تو ہونے دو، اس کی پرواہ ہی مت کرو۔ تم اس حد تک مکلّف ہو کہ جائز حدود میں رہ کر اس کی دل شکنی سے بچو، لیکن جہاں دل شکنی سے بچنے کے لئے کسی گناہ کا ارتکاب کرنا پڑے تو پھر دل ٹوٹتا ہے تو ٹوٹنے دو، اس کی پرواہ نہ کرو۔

دوسروں کی دنیا بنانے والا

ایک حدیث شریف میں جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دوسرے کو دنیا کا فائدہ پہنچانے کے لئے اپنی آخرت خراب کرے تو اللہ تعالیٰ اس دوسرے شخص کو دنیا ہی میں اس پر مسلط کر دیتے ہیں کہ تو نے اس کی دنیا کی خاطر اپنی آخرت خراب کی تھی، اب یہ تیری دنیا کو بھی خراب کرے گا۔ جو لوگ بیوی بچوں کو آرام اور راحت پہنچانے کی خاطر حرام آمدنی میں مبتلا ہوتے ہیں تو تجربہ یہ ہے کہ وہی بچے اس باپ کے سر پر جوتے بجاتے ہیں، اس لئے کہ اس نے بیوی بچوں کو راضی کرنے کی خاطر اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا، اور ان کی دنیا بنانے کے لئے اپنی آخرت خراب کی، تو پھر دنیا کے اندر ہی ان کو مسلط کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے دوسرے کی دل شکنی سے بچنے کے لئے اپنی دین شکنی مت کرو۔

غیبت سے بچنے کے لئے ہمت کی ضرورت ہے

ایک اور حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ))(۱)

''کسی مخلوق کی ایسی اطاعت نہیں کرنی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی نوبت آجائے''

اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے نہ کسی کی بات ماننے کی ضرورت ہے اور نہ مخلوق کی دلداری کی اجازت ہے۔ یاد رکھئے! کوئی کام محنت کے بغیر نہیں ہوتا، ہر کام میں کچھ نہ کچھ محنت اور مشقت اُٹھانی پڑتی ہے، تب جاکر وہ کام انجام پاتا ہے، لہٰذا اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ غیبت کرنا برا کام ہے اور گناہ کا کام ہے، اور تم یہ سمجھتے ہو کہ اس سے آخرت تباہ ہو رہی ہے تو پھر محنت اور مشقت اور اپنی ہمت کو استعمال کرنا پڑے گا۔ جب اپنی ہمت کو استعمال کرو گے تو اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں گے اور پھر اس گناہ سے بچنا آسان ہو جائے گا۔

ناجائز غیبت کی شرط ناگواری ہے

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا:

''اگر کسی کو بنا بر بے تکلفی ایسی بات کہی جائے جو بنظرِ الفاظ تو ناگواری کی بات ہے، مگر بنظرِ بے تکلفی یا تعلق یا بطور مزاح ہونے کے ناگواری کا خیال نہیں۔ (تو آیا یہ بھی ناجائز اور غیبت میں داخل ہے یا نہیں؟)''(۲)

مطلب ان سوال کرنے والے کا یہ تھا کہ کچھ لوگوں سے بے تکلف تعلقات ہوتے ہیں، دوستی ہے، آپس میں ہنسی مذاق ہے، اور ایک دوسرے کو کچھ باتیں ہنسی مذاق میں کہہ دیتے ہیں، اب اگر اس کی غیر موجودگی میں بے تکلفی کے انداز کا اس کا اس طرح ذکر کر دیا جائے کہ اس کے الفاظ تو بظاہر ایسے ہیں کہ جب دوسرا سنے تو اس کو ناگوار ہو کہ میرے بارے میں ایسے الفاظ کہے، لیکن تعلقات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس کے ساتھ بے تکلف دوستی ہے، رشتہ داری ہے، تو آیا ایسے الفاظ کہنا جائز ہیں یا نہیں، یہ الفاظ غیبت میں داخل ہیں یا نہیں؟ جواب میں حضرت والا نے فرمایا:

''جب وہ ناگواری ہے، خواہ کسی بھی حیثیت سے ہو، وہ مانعیت کے لئے کافی ہے، اور اگر خود ناگواری میں تردّد ہے تب بھی واجب الکف ہے، البتہ اگر عدم ناگواری یقینی ہو تو غیبت کی حد سے خارج ہو گیا''

(۱) مسند أحمد، رقم: ۱۰۴۱ (۲) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۴۹

حضرت والا کے اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اس بات کا مکمل سو فیصد یقین ہو کہ جس کے بارے میں میں یہ بات کہہ رہا ہوں وہ اگر یہ سنے گا تو اس کو میرا یہ جملہ اور فقرہ اور یہ الفاظ ناگوار نہیں ہوں گے، وہ ان کو برا نہیں سمجھے گا، کیونکہ تعلق کی نوعیت ایسی ہے تو اس صورت میں وہ الفاظ غیبت میں داخل نہیں۔ مثلاً اپنے کسی دوست سے کہا کہ تو بڑا بے وفا ہے، پھر بعد میں کسی مجلس میں اس دوست کا تذکرہ آیا تو اس نے کہا کہ اس بے وفا کا کیا اعتبار۔ اب لفظ ''بے وفا'' ایسا لفظ ہے کہ کسی اجنبی کو کہیں گے تو اس کو ناگواری بھی ہو سکتی ہے، لیکن دوستی میں جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو عموماً ناگوار نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر اس بات کا یقین ہے کہ جب میرا دوست یہ سنے گا کہ میں نے اس کے بارے میں یہ بات کہی تھی تو اس کو ناگوار نہیں ہوگا تو یہ غیبت میں داخل نہیں۔ لیکن اگر ناگوار ہونے کا شبہ ہو، یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ ناگوار ہوگا اور یہ بھی احتمال ہے کہ ناگوار نہیں ہوگا تو اس کو ناجائز ہی سمجھیں گے۔

ایسا ہنسی مذاق جائز نہیں

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بعض اوقات دوستوں میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک دوست تو بے تکلفی میں دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہا ہے، اور اس کا مقصد دوسرے کو ستانا اور تکلیف پہنچانا نہیں ہے، لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہنسی مذاق کو پوری طرح برداشت نہیں کر پاتے اور اس پر وہ چڑتے ہیں اور ان کو ناگواری ہوتی ہے۔ لیکن دوست احباب ایسے شخص کو چڑانے کے لئے اس سے اور زیادہ ہنسی مذاق کرتے ہیں اور اس سے مزہ لیتے ہیں، تو اگرچہ دوست احباب اس کو بے تکلفی میں وہ الفاظ کہہ رہے ہیں، لیکن چونکہ اس کو تمہاری یہ بے تکلفی ناگوار ہو رہی ہے تو یہ ہنسی مذاق بھی جائز نہیں، کیونکہ کسی مسلمان کو ناگواری پہنچانا جائز نہیں۔ لہٰذا ایسے آدمی سے اس طرح گفتگو کرنا جو اس کی دل شکنی کا باعث ہو، یہ کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔

لیکن اگر یہ یقین ہے کہ فلاں سے ایسی بے تکلفی کی دوستی ہے کہ وہ برا نہیں مانے گا بلکہ اس کو اچھا لگے گا، اور اس کو اس سے تکلیف نہ ہوگی، تو ایسے موقع پر اس کے سامنے بھی ایسے الفاظ کہنا جائز ہے اور پیٹھ پیچھے کہنا بھی جائز ہے۔ خلاصہ یہ کہ تین صورتیں ہوئیں:

(۱) اگر ناگواری کا یقین ہو تو ایسے الفاظ کہنا ناجائز ہے۔

(۲) اگر ناگواری کا شبہ ہو تو بھی ناجائز ہے۔

(۳) اگر یہ یقین ہو کہ اس کو ناگوار نہیں ہوگا تو جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں غیبت سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔

غیبت سے بچنے کا طریقہ

حضرت والا نے غیبت سے بچنے کے لئے ایک اصول ارشاد فرمایا، وہ یہ ہے:

''بے سوچے ہرگز کوئی کلام نہ کیا جائے، اگرچہ بعض اوقات یہ بھی نہ یاد رہے گا کہ سوچ کر بولوں، مگر خیال رکھنے سے اکثر اوقات یاد رہے گا کہ سوچ کر بولوں، پھر انشاء اللہ زھول نہ ہوگا، پس جب سوچ کر بولا جائے تو ہر کلام سے پہلے یہ سوچ لینا چاہئے کہ اس کلام سے گناہ تو نہ ہوگا، انشاء اللہ تعالیٰ اس سے بہت کچھ اصلاح ہوجائے گی''(۱)

یعنی بے سوچے سمجھے بولنے کی جو عادت پڑی ہوئی ہے، اس کو ختم کرو، بولو تو سوچ کر بولو، اور یہ سوچو کہ جو کلمہ میں زبان سے نکالنا چاہتا ہوں، وہ کہیں مجھے گناہ میں اور اللہ کی نافرمانی میں مبتلا نہ کردے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''قُلْ خَيْرًا وَإِلَّا فَاصْمُتْ''

''یا تو بھلائی کی بات کہو ورنہ خاموش رہو''

خاموش رہنا ہزار درجہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ آدمی فضول باتیں کرتا پھرے جو اس کے لئے عذابِ جہنم کا باعث ہوں۔

جہنم میں اوندھے منہ ڈالنے والی

حدیث شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((هَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلَى وُجُوهِهِمْ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ))(۲)

یعنی لوگوں کو جہنم میں اوندھے منہ گرانے والی چیز ان کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات ہوں گے، العیاذ باللہ۔

یہ زبان سرکاری مشین ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے عطا فرمادی ہے، جب سے پیدا ہوئے اس وقت سے یہ مشین چل رہی ہے اور مرتے دم تک چلتی رہے گی، نہ اس میں تیل ڈالنے کی ضرورت، نہ اس کی سروس کرانے کی ضرورت، نہ اس کی مرمت کرانے کی ضرورت، مگر یہ کام کر رہی

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۴۹

(۲) سنن الترمذی، کتاب الإیمان عن رسول اللہ، باب ما جاء فی حرمة الصلاة، رقم: ۲٥٤١، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب کف اللسان فی الفتنة، رقم: ۳۹٦۳، مسند أحمد، رقم: ۲۱۰۰۸

ہے، اور اس طرح کام کررہی ہے کہ جیسے ہی ذہن میں ایک بات آئی کہ یہ بات زبان سے ادا کروں، بس فوراً وہ بات زبان کے ذریعہ باہر آجاتی ہے، گویا کہ آٹومیٹک مشین ہے۔ اس نعمت کی ہمیں قدر اس لئے نہیں ہے کہ یہ نعمت بچپن سے ہمارے ساتھ ہے اور کام دے رہی ہے، اور اس کے حصول کے لئے کوئی روپیہ پیسہ خرچ نہیں کرنا پڑا، اور کوئی محنت نہیں اُٹھانی پڑی، اس لئے اس کی قدر نہیں۔

زبان کی قدر کریں

اس کی قدر ان لوگوں سے پوچھئے جن کی گویائی کی قوت سلب ہوچکی ہے کہ وہ کس عذاب کے اندر مبتلا ہیں؟ جن لوگوں کی فالج کی وجہ سے زبان بند ہوجاتی ہے، وہ بات کہنا چاہتے ہیں، اپنی بیوی بچوں سے، اپنے ماں باپ سے، اپنے بھائی سے، اپنے دوست سے کچھ کہنا چاہتے ہیں، لیکن قوتِ گویائی نہیں ہے، بول نہیں سکتے۔ بعض اوقات اپنا سر پیٹ لیتے ہیں کہ میں کہنا چاہتا ہوں، میں اپنے دل کی بات اس کو کیسے سمجھاؤں، اس وقت پتہ چلتا ہے کہ اس زبان کی گویائی کی کیا قیمت ہے۔ خدانہ کرے، اگر ہم میں سے کسی کی گویائی دومنٹ کے لئے بند ہوجائے، اور بولنے کی طاقت نہ رہے، اور دوسرا شخص کہے کہ تمہارے بولنے کی طاقت تمہیں واپس نہیں مل سکتی، پہلے اس کے لئے تمہیں خرچ کرنا پڑے گا تو لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے لئے تیار ہوجائے گا تاکہ مجھے یہ قوتِ گویائی واپس مل جائے۔ اب اس وقت یہ گویائی مفت ملی ہوئی ہے، اور یہ زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے، اور انسان اس کو جابجا استعمال کررہا ہے، اور اس کے ذریعہ حلال اور حرام ایک کررکھے ہیں، کوئی فکر نہیں۔

دو عظیم کلمے

شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ یہ سرکاری مشین تمہیں مفت ملی ہوئی ہے اور کام دینے والی مفید چیز ہے تو اس کو فائدے کے کاموں میں استعمال کرو اور حرام کاموں سے اس کو بچاؤ۔ اگر انسان اس سے فائدہ اُٹھانا چاہے تو اس کا فائدہ بھی بڑا عظیم ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر ایک مرتبہ زبان سے ''سبحان اللہ'' کہہ دیا یا ''الحمدللہ'' کہہ دیا تو میزانِ عمل کا آدھا پلہ بھر جاتا ہے۔ بخاری شریف کے ختم کے موقع پر آپ یہ حدیث سنتے ہیں:

((كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِى الْمِيْزَانِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ))(۱)

''دو کلمے ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو بڑے محبوب ہیں۔ جن کا زبان سے ادا کرنا بہت

(۱) صحيح البخارى، كتاب الدعوات، باب فضل التسبيح، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

آسان ہے، ایک لمحے میں ادا ہو جاتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی یہاں میزانِ عمل میں بڑے بھاری ہیں، وہ دو کلمے یہ ہیں:

((سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ))

لہٰذا اگر انسان اس زبان کو صحیح استعمال کر لیں، تو جنت کی نعمتوں کے ڈھیر لگا سکتا ہے۔ چلتے چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے انسان اس زبان کو اللہ کے ذکر سے تر رکھے۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابی نے حضور اقدس ﷺ سے سوال کیا کہ سب سے افضل عمل کونسا ہے؟ آپ نے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ سب سے افضل عمل یہ ہے کہ تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے۔ (۱)

چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے اللہ کا ذکر کرتے رہو گے تو تمہارے نامۂ اعمال میں اضافہ ہوتا رہے گا، نیکیوں کے ڈھیر لگتے رہیں گے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر وثواب کا خزانہ اکٹھا ہوتا رہے گا۔

اسلام میں داخل کرنے والی چیز

یہی زبان ہے جو انسان کو کفر سے نکال کر اسلام میں داخل کر دیتی ہے، ایک ستر برس کے کافر کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق دے دی اور اس نے زبان سے "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کہہ دیا تو وہ ستر برس کا کافر جہنم کے ساتویں طبقے سے نکل کر ایک لمحے میں جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گیا۔ یہ کس کی بدولت ہوا؟ اس زبان کی بدولت ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس زبان میں یہ تاثیر رکھی ہے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک شخص کی ساری عمر کفر میں، فسق و فجور میں اور بداعمالیوں میں گزری، آخر میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق دے دی اور اس نے کلمہ شہادت پڑھ لیا۔ کلمہ شہادت پڑھنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اب اگر کلمہ شہادت پڑھنے سے ذرا دیر پہلے انتقال ہو جاتا تو سیدھا جہنم میں جاتا، لیکن جب اس کلمہ کے پڑھنے کے بعد انتقال ہوا تو سیدھا جنت میں چلا گیا۔ اس کلمہ نے اس کو جہنم کے ساتویں طبقے سے نکال کر جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) رقم: ٥٩٢٧، صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والإستغفار، باب فضل التهليل والتسبيح والدعاء، رقم: ٤٨٦٠، سنن الترمذى، كتاب الدعوات عن رسول الله، باب ما جاء فى فضل التسبيح والتكبير والتهليل والتحميد، رقم: ٣٣٨٩، سنن ابن ماجه، كتاب الأدب، باب فضل التسبيح، رقم: ٣٧٩٦، مسند أحمد، رقم: ٦٨٧٠

(١) سنن الترمذى، باب ما جاء فى فضل الذكر، رقم: ٣٧٢٠ (٢٦٨/١٢)

زبان کا فائدہ اور نقصان دونوں عظیم ہیں

لہٰذا اگر چاہو تو اس زبان کے ذریعہ آخرت کا ذخیرہ جمع کرلو۔ تلاوت کے ذریعہ، ذکر و تسبیح کے ذریعہ، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے ذریعہ، شکر کے ذریعہ اور کسی مسلمان بھائی کا دل خوش کرنے کے ذریعہ آخرت کے لئے ذخیرہ جمع کرلو۔ کیونکہ زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکالنا جس سے دوسرے مسلمان بھائی کا دل خوش ہو جائے، یہ بھی صدقہ ہے۔ اور اگر زبان کو غلط استعمال کیا جائے تو اس کا نقصان بھی بہت ہے، جیسا کہ پہلے یہ حدیث سنائی کہ لوگوں کو جہنم میں اوندھے منہ گرانے والی چیز اس زبان کے کرتوت ہوں گے، کیونکہ جھوٹ یہ بول رہی ہے، غیبت یہ کر رہی ہے، دل آزاری یہ کر رہی ہے، فحش کلامی یہ کر رہی ہے، اور یہ سب کام انسان کو جہنم کے اندر اوندھے منہ گرانے والے ہیں۔ لہٰذا جب اس زبان کا فائدہ بھی عظیم ہے اور نقصان بھی عظیم ہے تو عافیت اور نجات کا راستہ یہی ہے کہ آدمی سوچ سمجھ کر زبان کو استعمال کرے۔ اسی لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب کوئی کلمہ بولو، تو بولنے سے پہلے سوچو کہ یہ کلمہ مجھے جنت میں لے جا رہا ہے یا جہنم میں لے جا رہا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب سے پہلے خاموش رہنا

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ جب کوئی شخص آکر ان سے سوال کرتا تو بعض اوقات امام صاحب دیر تک خاموش رہتے، کوئی جواب نہ دیتے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت! اتنی دیر ہوگئی، آپ کچھ بول ہی نہیں رہے، کوئی جواب نہیں دے رہے ہیں! جواب میں فرمایا:

"حَتّٰى أَعْرِفَ أَنَّ الْفَضْلَ فِي السُّكُوْتِ أَوْ فِي الْكَلَامِ"

"میں اس لئے خاموش ہوں کہ پہلے یہ دیکھ لوں کہ خاموش رہنا زیادہ بہتر ہے یا بولنا زیادہ بہتر ہے"

لہٰذا پہلے تول رہے ہیں کہ اب جو کلمہ بولوں گا، یہ میرے لئے فائدہ مند ہوگا یا نقصان دہ ہوگا۔ پہلے تولو پھر بولو۔ جو کلمہ زبان سے نکالو، تول کر نکالو کہ یہ کلمہ کیسا ہے اور کتنا ہے؟ اور اس سے مجھے فائدہ پہنچے گا یا نقصان پہنچے گا؟

زبان کی حفاظت پر جنت کی ضمانت

اسی لئے حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ یَضْمَنُ لِیْ مَا بَیْنَ لِحْیَیْهِ وَمَا بَیْنَ رِجْلَیْهِ أَضْمَنُ لَهُ الْجَنَّةَ))(۱)

جو شخص مجھے دو چیزوں کی ضمانت دیدے، میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔کونسی دو چیزیں؟ ایک وہ چیز جو جبڑوں کے درمیان ہے یعنی زبان، اس کی ضمانت دیدے کہ وہ اس کو غلط استعمال نہیں کرے گا۔اور ایک وہ چیز جو ٹانگوں کے درمیان ہے یعنی شرمگاہ، کہ اس کو غلط استعمال نہیں کرے گا، میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

لہٰذا یہ نہ ہو کہ یہ سرکاری مشین مفت میں مل گئی ہے تو اب صبح سے شام تک قینچی کی طرح چل رہی ہے اور رکنے کا نام نہیں لیتی، جو منہ میں آرہا ہے بک رہے ہیں، کوئی سوچ وفکر نہیں۔ یہ حالت ٹھیک نہیں، بلکہ بولنے سے پہلے سوچو کہ جو بات میں منہ سے نکالنے والا ہوں وہ فائدہ پہنچائے گی یا نقصان پہنچائے گی؟ اس کے بعد زبان سے بات نکالو۔

فضول گوئی پر دو طالب علموں کا واقعہ

دہلی میں حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے۔ان کی نازک مزاجی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ایک مرتبہ دو طالب علم ان سے بیعت ہونے کے لئے بلخ سے آئے۔ بلخ افغانستان کا ایک شہر ہے۔وہاں انہوں نے یہ سنا کہ دہلی میں یہ بڑے بزرگ اور اللہ والے ہیں، تو دل میں خیال آیا کہ ان سے بیعت ہونا چاہئے۔چنانچہ بلخ سے طویل سفر کرکے دہلی پہنچے، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کی مسجد میں پہنچے، نماز کا وقت قریب تھا اس لئے حوض پر بیٹھ کر دونوں وضو کرنے لگے، وضو کرتے وقت آپس میں باتیں کرنے لگے کہ یہ حوض بڑا ہے یا ہمارے بلخ کی مسجد کا حوض بڑا ہے؟ ایک نے کہا کہ یہ حوض بڑا ہے، دوسرے نے کہا: وہ بڑا ہے، اور آپس میں بحث ہونے لگی۔حضرت مرزا صاحب نے وہاں سے گزرتے ہوئے ان کی گفتگو سن لی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ ہم بلخ سے آئے ہیں۔ حضرت والا نے پوچھا کہ کیسے آنا ہوا؟ کہا کہ ہم آپ کے دستِ مبارک پر بیعت ہونے آئے ہیں۔ حضرت مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بیعت ہونے تو آپ آئے ہیں، لیکن کیا اس کا فیصلہ ہوگیا کہ یہ حوض بڑا ہے یا بلخ کا حوض بڑا ہے؟ اب دونوں خاموش، شرمندہ ہو رہے تھے کہ حضرت والا نے ہماری گفتگو سن لی۔حضرت والا نے فرمایا کہ ابھی فیصلہ نہیں ہوا تو ایسا کرو کہ بیعت تو تم بعد میں ہونا، پہلے بلخ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان، رقم: ۵۹۹۳، سنن الترمذی، کتاب الزهد عن رسول الله، باب ما جاء فی حفظ اللسان، رقم: ۲۳۳۲، مسند أحمد، رقم: ۲۱۷۵۷، مؤطا مالك، الکتاب الجامع، باب ما جاء فیما یخاف من اللسان، رقم: ۱۵۶۶

جاؤ اور اس حوض کو ناپ کر آؤ، اور واپس آ کر پھر اس حوض کو ناپو، اور پھر فیصلہ کرو کہ کونسا حوض بڑا ہے اور کونسا حوض چھوٹا ہے، اس کے بعد بیعت ہونا۔

کیونکہ تمہاری بحث اور گفتگو سے پتہ چلا کہ تمہاری گفتگو میں اوّل تو تحقیق نہیں، احتیاط نہیں، ایک نے ناپے تولے بغیر یہ دعویٰ کر دیا کہ یہ حوض بڑا ہے، اور دوسرے نے یہ دعویٰ کر دیا کہ وہ حوض بڑا ہے، اور آپس میں بحث شروع کر دی، اس سے معلوم ہوا کہ طبیعت میں احتیاط نہیں۔ دوسرے یہ کہ بیکار اور بے فائدہ گفتگو کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ اگر یہ پتہ چل جاتا کہ یہ بڑا ہے یا وہ بڑا ہے تو اس سے دنیا یا آخرت کا کیا فائدہ حاصل ہوتا؟ لہٰذا واپس بلخ جاؤ اور وہ حوض ناپ کر آؤ۔ اس کے بغیر بیعت نہیں کروں گا۔

علاج کا فائدہ

پہلے زمانے میں ایسے ہی علاج ہوا کرتے تھے۔ اب یہ علاج تو بڑا سخت اور کڑوا ہوا، لیکن ساری زندگی کے لئے یہ علاج کافی ہوگیا ہوگا۔ پھر اس کے بعد ساری عمر بلا تحقیق اور بے فائدہ بات زبان سے نہیں نکلی ہوگی۔ بہر حال، اس طرح کے علاج ہوتے تھے۔ یہ نہیں کہ ذکر و تسبیحات بتا دیں اور اب بیٹھے ہوئے وظیفے کر رہے ہیں، بس وظیفہ گھونٹنے سے ہی کامل بن گئے، بلکہ اس طرح رگڑے دیے جاتے تھے، تب جا کر اصلاح ہوتی تھی۔

علاج سخت ہونے پر اشکال اور جواب

یہ واقعہ سنا کر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ ان طلبہ نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ ایک غلط کام کیا، اگر غلط کام نہ کر رہے ہوتے تو پھر آنے کی ضرورت ہی کیا تھی، یہ طلبہ اسی لئے تو آئے تھے کہ اپنی اصلاح کرائیں، اگر پہلے سے کامل ہوتے اور زبان قابو میں ہوتی، خیالات قابو میں ہوتے، تو شیخ کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟ لہٰذا اس غلطی پر شیخ نے بیعت کرنے سے کیوں انکار کر دیا؟ پہلے بیعت کر لیتے اور پھر علاج کرتے۔

پھر خود ہی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس اشکال کا جواب دیا کہ یہاں دو باتیں ہیں: پہلی بات یہ ہے کہ اس انکار سے یہ بتلانا منظور ہے کہ کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ طالب، سالک اور مرید کو پہلے سے ان کا دھیان اور ان کی فکر ہونی چاہئے۔ شیخ سے فائدہ اسی وقت ہوتا ہے کہ جب مرید نے پہلے سے بڑے بڑے امور کا دھیان اور خیال کیا ہوا ہے، البتہ جو دقائق اور باریک باتیں ہیں، ان کی اصلاح شیخ سے کرانی ہے، اس وجہ سے شیخ بیعت کرنے سے انکار کر دیتا ہے کہ تمہیں ابھی بیعت نہیں کرنا ہے۔

ہر شخص کا علاج علیحدہ ہوتا ہے

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی شیخ کے قلب پر وارد فرماتے ہیں کہ اس شخص کے ساتھ اس وقت کیا معاملہ کرنا ہے۔ ہر آدمی کا علاج الگ ہوتا ہے۔ کسی کا علاج تھپڑ مارنے سے ہوجاتا ہے، کسی کا علاج ڈانٹ دینے سے ہوجاتا ہے، کسی کا علاج پیار کرنے سے ہوتا ہے، کسی کا علاج چمکارنے سے ہوجاتا ہے، اور کسی کا علاج صرف ایک نظر دیکھ لینے سے ہوجاتا ہے۔ اب اللہ جل جلالہ شیخ کے دل پر یہ وارد فرماتے ہیں کہ اس کے لئے اس وقت کیا چیز فائدہ مند ہے۔ دوسرا آدمی دیکھ کر یہ محسوس کرتا ہے کہ شیخ صاحب نے کچھ زیادتی کردی، لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح اسی میں رکھی ہے۔

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل

ہم نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے طرزِ عمل میں یہ چیز بارہا مشاہدہ کی، حالانکہ وہ انتہائی نرم خو آدمی تھے، غصہ تو نہ ہونے کے برابر تھا، ہر ایک کے ساتھ نرمی اور تحمل سے پیش آتے تھے، تواضع اور انکساری کے ساتھ ملتے، لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ اچانک کسی شخص پر چھوٹی سی بات پر شدید غصہ ہوجاتے، اب ظاہر بین کو یہ دیکھ کر شبہ ہوتا کہ انہوں نے اس شخص پر زیادتی کی ہے، مگر اللہ تعالیٰ نیک بندوں کے قلب پر وارد فرماتے ہیں کہ کس شخص کے ساتھ کس وقت کیا معاملہ کرنا ہے۔

ایک صاحب کو ڈانٹنے کا واقعہ

چنانچہ ان کا ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک مرتبہ ایک بڑے صاحبِ حیثیت، پڑھے لکھے مشہور آدمی، والد صاحب سے ملاقات کے لئے آگئے۔ بات چیت کرنی شروع کی، ابھی دو تین جملے ہی کہے تھے کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو شدید ڈانٹنا شروع کردیا، میں بھی حیران ہوگیا کہ آج تک کبھی کسی کو اس طرح نہیں ڈانٹا، یہاں تک کہ ان سے یہ کہہ دیا کہ یہاں سے نکل جاؤ۔ چنانچہ ان کو دفتر سے نکال دیا۔ آج تک میں نے ایسا منظر نہیں دیکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ یا اللہ! یہ شخص تو کام سے گیا، اس لئے کہ تو تعلیم یافتہ آدمی ہے، کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہے، ڈاڑھی بھی برائے نام ہے، اور حضرت والد صاحبؒ نے اس کو ڈانٹ دیا، اب ہمیشہ کے لئے یہ شخص متنفر ہوکر جائے گا۔ اسی آدمی نے بعد میں خود اپنی زبان سے مجھے کہا کہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس دن کی ڈانٹ نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی اور میرے اوپر اس ڈانٹ نے ایسا اثر کیا کہ میرا مرکزِ توجہ ہی بدل گیا۔

بہر حال، اللہ تعالیٰ ہی اپنے نیک بندوں کے دلوں پر یہ القاء فرماتے ہیں کہ کس کے ساتھ کس وقت کیا معاملہ کرنا چاہئے۔ کسی اللہ والے کے طرزِ عمل پر شبہ مت کرو کہ کسی شخص کو ڈانٹ رہے ہیں، کسی کو پھٹکار رہے ہیں، اور کسی سے محبت سے پیش آرہے ہیں۔ کیونکہ معطی حقیقی اور مبدأ فیاض تو اللہ تعالیٰ ہیں، شیخ تو ایک واسطہ ہوتا ہے، وہی شیخ کے دل میں ڈالتے ہیں کہ اس کی اصلاح کا کیا طریقہ مناسب ہوگا، ہر ایک کو ایک ہی نسخہ نہیں پلایا جاتا۔ اس لئے کبھی ان اللہ والوں پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔

لہٰذا حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ نے ان دو طالب علموں کو یہ سزا دی کہ واپس بلخ جاؤ اور وہاں کا حوض ناپ کر آؤ۔ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ ان کا علاج یہی ہے۔ ایک مرتبہ جب چوٹ لگ جائے گی تو ساری عمر کے لئے کارآمد ہو جائے گی، چنانچہ کارآمد ہوگئی۔ اور اس سے حضرت مرزا صاحب نے ان کو یہ سبق دیا کہ تم زبان کو احتیاط سے استعمال نہیں کرتے اور احتیاط ضروری ہے۔

پہلے سوچو پھر بولو

اور اس احتیاط کرنے کا طریقہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بتا دیا کہ پہلے سوچو کہ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں یہ صحیح ہے یا نہیں؟ اور اس میں حدود سے تجاوز تو نہیں ہے؟ اس میں جھوٹ تو شامل نہیں ہے؟ اس میں مبالغہ تو نہیں ہے؟ بے احتیاطی تو نہیں ہے؟

آج بہت سے فسادات اور جھگڑے صرف اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ ایک شخص نے بے سوچے سمجھے اِدھر کی بات اُدھر کہہ دی، تحقیق کی نہیں اور صحیح طور پر یاد رکھا نہیں، بس اس ایک بات کی وجہ سے خاندان میں فسادات کھڑے ہوگئے۔ لہٰذا پہلے سوچو کہ کیا بات کہی گئی ہے؟ کتنی مقدار میں کہی گئی ہے؟ اگر آگے نقل کرنی ہے تو بس اتنی ہی نقل کرو، اپنی طرف سے اس میں اضافہ نہ کرو۔

حضرت فرماتے ہیں کہ چونکہ زبان کو تو ہر وقت چلنے کی عادت پڑی ہوئی ہے، وہ رکنے کا تو نام نہیں لیتی، تو انسان ہر وقت کس طرح سوچے؟ حضرت فرماتے ہیں کہ ہر کام مشق کرنے سے ہوتا ہے، لہٰذا مشق کرو، اور شروع میں تو سوچنے کا خیال ہی نہیں آئے گا، لیکن سوچنے کا تھوڑا سا اہتمام کرو تو رفتہ رفتہ عادت پڑ جائے گی۔ اگر شروع میں سوچنا بھول جاؤ، تو جب یاد آئے اس وقت سوچو، پھر یاد آئے، پھر سوچو، اس طرح کرتے کرتے سوچنے کی عادت پڑ جائے گی، پھر بے تکلف سوچنا آئے گا، اور سوچنے کے لئے کسی خاص اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، بلکہ پھر جو بات نکالو گے بالکل درست نکلے گی۔ غیبت، جھوٹ اور دل آزاری سب سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے۔

غیبت کو جائز کرنے کے لئے نفس کی تاویل

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا:

''میرا نفس مجھے یہ تاویل سکھاتا ہے کہ تیری بھی تو لوگ غیبت کرتے ہیں، قیامت میں جب پکڑ ہوگی تو اپنے مغتابین (غیبت کرنے والوں) سے جو اجر ملے گا وہ اجر جن کی تو نے غیبت کی، ان کو دے دیا جائے گا''(۱)

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو آدمی کسی کی غیبت کرے تو اس کا اجر اس کو دے دیا جاتا ہے۔ ایک حدیث شریف ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس کی غیبت کی گئی۔ اس لئے میرے دماغ میں یہ بات آتی ہے کہ میری بھی لوگ غیبت کرتے ہیں اور میں بھی کرتا ہوں۔ جو لوگ میری غیبت کرتے ہیں ان کا اجر مجھے ملتا ہے، میں دوسروں کی غیبت کرتا ہوں تو میرا اجر ان کو مل جاتا ہے، لہٰذا معاملہ برابر سرابر ہوگیا، اس لئے زیادہ پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

اس تاویل کا جواب

جواب میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''اوّل تو یہ کسی دلیل سے ثابت نہیں کہ وہ اجر جو دوسروں سے ملا ہوا ہے اس کے تدارک کے لئے کافی ہے، ممکن ہے کہ یہ دوسروں سے ملا ہوا اجر تمہارے ہی پاس رہے، اور خاص تمہارے اعمال کا اجر اہلِ حقوق کو ملے اور نجات کے لئے دوسروں کا اجر کافی نہ ہو۔ دوسرے اس سے قطع نظر کرکے مساوات کی کوئی دلیل نہیں، ممکن ہے کہ تم کو کم ملے اور تم سے زیادہ لے لیا جائے تو تدارک کے لئے کیسے کافی ہو جائے گا؟''(۲)

یعنی تمہارے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ تمہیں جو اجر مغتابین سے حاصل ہوا ہے، وہی دوسروں کے پاس جائے گا، یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ تمہاری نمازیں، تمہارے روزے، تمہاری تلاوت، تمہارا ذکر وغیرہ وہ سب تمہاری غیبت کے بدولت دوسروں کے پاس چلے جائیں اور دوسروں کا اجر تمہارے پاس آجائے۔ دوسرے تمہارے پاس مساوات کی بھی کوئی دلیل نہیں کہ جتنا اجر تمہیں ملا ہے، اتنا ہی اجر دوسروں کے پاس جائے گا، ممکن ہے کہ تمہیں کم اجر ملے اور تم سے زیادہ لے لیا جائے۔

---

(۱) انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۰ (۲) انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۰

یہ سب شیطانی تاویلات ہیں

یہ سب شیطان کی تاویلیں ہیں، جو انسان کو غلط کاموں میں مبتلا کرنے کے لئے دل میں ڈالتا ہے کہ ایسا کرلو، اور اس طرح معاملہ سیدھا ہو جائے گا۔

جب آخرت میں اجر و ثواب کا معاملہ ہوگا اور اپنا اجر و ثواب دوسروں کے پاس جائے گا تو اس وقت پتہ چلے گا کہ یہ کتنی زبردست دھوکے کی تاویل تھی، اچھے خاصے نیک اعمال کیے، نمازیں پڑھیں، روزے اور تلاوت کے ساتھ رمضان المبارک گزارا، اعتکاف کرنے کی توفیق ہوئی، رات بھر جاگ جاگ کر عبادات اور نوافل ادا کرتے رہے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ سارے اعمال دوسروں کے قبضے میں جارہے ہیں اور جو کچھ کیا کرایا تھا وہ سب دوسروں کے پاس چلا گیا۔ اس وقت جو حسرت اور تکلیف ہوگی، اس کا کوئی علاج نہیں۔ لہٰذا یہ سوچنا کہ آخرت میں حساب برابر ہو جائے گا، یہ خیال اور سوچ درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے، آمین۔

غیبت کا علاج ہمت اور استحضار ہے

آگے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"غیبت" ایک اختیاری امر ہے، اس کا طریق علاج ہمت و استحضار ہے اور معین طریق یہ ہے کہ جب ایک بار ایسا ہو جائے ایک وقت فاقہ کرے"(۱)

سب سے پہلے یہ فرمایا کہ غیبت اپنے اختیار سے ہوتی ہے، کبھی بے اختیار نہیں ہوتی، اگر غیبت بے اختیار ہوتی تو حرام نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا کام حرام نہیں کیا جس سے بچنا انسان کے اختیار میں نہ ہو۔

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾(۲)

لہٰذا غیبت سے بچنا اختیار میں تو ہے، البتہ اس سے بچنے کے لئے ہمت اور استحضار کی ضرورت ہے۔ یہ ہمت کرلے کہ میں یہ گناہ نہیں کروں گا، زبان سے غلط بات نہیں نکالوں گا۔ اور اس بات کا استحضار کرے کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے، کتنا بڑا گناہ ہے اور اس کے نتیجے میں اپنے اچھے اعمال دوسروں کے قبضے میں چلے جاتے ہیں۔ ان چیزوں کا استحضار کرے۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۰ (۲) البقرة: ۲۸۶

غیبت پر اپنے نفس کو سزا دینا

آگے فرمایا کہ اس سے بچنے میں یہ چیز معاون ہو جاتی ہے کہ آدمی یہ طے کر لے کہ اگر آئندہ غیبت ہوگی تو اپنے آپ کو یہ سزا دوں گا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ وہ سزا نہ تو اتنی معمولی ہو کہ آدمی کو اس کی پرواہ ہی نہ ہو، جیسے میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ جب ''علی گڑھ کالج'' قائم ہوا تو اس وقت یہ قانون تھا کہ تمام طلبہ کو نماز پڑھنا لازم ہے، اور نماز چھوڑنے پر جرمانہ مقرر تھا کہ جو طالب علم نماز چھوڑے فی نماز دو آنے ادا کرے۔ اب ہوتا یہ تھا کہ بہت سے طالب علم ایسے بھی تھے جو مہینہ بھر کا جرمانہ اکٹھا شروع میں جمع کرادیا کرتے تھے۔ چونکہ جرمانہ ایسا تھا کہ اس کو ادا کرنے میں کوئی خاص مشقت نہیں تھی، اس لئے اس جرمانہ لگانے سے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ جرمانہ ایسا ہونا چاہئے جس سے کچھ مشقت ہو اور وہ جرمانہ اتنا بھی سخت نہ ہو کہ آدمی اس کو برداشت نہ کر پائے اور پھر آدمی اصل عمل سے بھی جائے اور جرمانہ سے بھی جائے، لہٰذا جرمانہ درمیانہ درجے کا ہونا چاہئے۔

غیبت کرنے پر نفس کو فاقہ کرانا

لہٰذا کسی کے حق میں مالی جرمانہ فائدہ مند ہوتا ہے کہ جب کبھی مجھ سے یہ فعل سرزد ہوگا تو میں اتنے پیسے صدقہ کروں گا۔ یہ ان لوگوں کے لئے ہے جن پر صدقہ کرنا بڑا شاق ہوتا ہے، کیونکہ اس سے بھی انسان کے نفس کو سزا ملتی ہے۔ اور جن لوگوں کو پیسوں کی پرواہ نہیں ہوتی، انہیں چاہئے کہ وہ اپنے اوپر ایسا جرمانہ عائد کریں جس سے ان پر تھوڑی مشقت ہو۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں یہ جرمانہ بیان فرمایا کہ آدمی یہ طے کر لے کہ اگر مجھ سے غیبت ہوگی تو ایک وقت کا فاقہ کروں گا، کھانا نہیں کھاؤں گا، بلکہ بھوک ہڑتال کروں گا۔ آج کل لوگوں نے بھوک ہڑتال کا اُلٹا طریقہ نکالا ہے کہ جب دوسرے پر دباؤ ڈالنا مقصود ہوتا ہے تو لوگ بھوک ہڑتال کرتے ہیں۔ اگر دوسرا شخص دباؤ قبول نہ کرے تو بھوک کی وجہ سے مر جائے۔ یہ طریقہ تو درست نہیں۔ حضرت والا نے جو طریقہ بیان فرمایا ہے وہ انسان کے اپنے اوپر دباؤ ڈالنے کے لئے بیان فرمایا کہ میں اس لئے فاقہ کر رہا ہوں تا کہ مجھ سے آئندہ غیبت سرزد نہ ہو، اور جب کبھی غیبت ہوگی تو اپنے نفس کو فاقے کی سزا دوں گا۔ اور یہ فاقہ ایسی چیز ہے کہ اگر انسان اس پر عمل کرے تو چند دن میں علاج ہو جائے گا اور غیبت چھوٹ جائے گی۔

دوسروں کے عیوب ظاہر کرنے کا حکم

ایک صاحب نے حضرت والا سے سوال کیا:

''بعض لوگ جو گناہِ کبیرہ میں مبتلا ہیں، ان کے عیوب اور گناہ کو ظاہر کرنا غیبت ہے یا نہیں؟ نفس اس تاویل پر ہمیشہ آمادہ رہتا ہے کہ ایسوں کے عیوب اگر لوگوں پر ظاہر نہ کیے جائیں تو لوگوں کو دھوکا ہوگا اور مسلمانوں کو دھوکہ سے بچانا ضروری ہے''(۱)

یعنی دوسروں کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ فلاں فلاں عیب میں مبتلا ہیں، اس عیب کی خبر لوگوں کو ہونی چاہئے تاکہ وہ اس سے دھوکہ نہ کھائیں، تو آیا ایسے آدمی کی غیبت کریں یا نہ کریں؟

مبتدی جائز غیبت بھی نہ کرے

جن صاحب نے یہ سوال کیا تھا وہ ابھی نئے نئے اس طریق میں داخل ہوئے تھے اور اپنی اصلاح کے لئے حاضر ہوئے تھے اور ابتداء ہی تھی کہ انہوں نے یہ سوال کرلیا۔ چنانچہ حضرت نے جواب تحریر فرمایا:

''یہ سوال منتہی کے قابل ہے، مبتدی کو جائز غیبت بھی نہ کرنی چاہئے''(۲)

یعنی جو مبتدی ابھی اپنی اصلاح کرانے کے لئے چلا ہے اور ابھی اس نے اصلاح کے لئے قدم بڑھایا ہے، ابھی تو اس کے نفس کی تہذیب ہونی ہے، اس کو چاہئے کہ وہ جائز غیبت بھی نہ کرے۔

یہ وہی بات ہے جس کو حضرت مولانا یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مثال سے سمجھایا تھا کہ جیسے ایک کاغذ کو ایک طرف موڑ دیا جائے، پھر اس کو اگر سیدھا کرنا چاہو گے تو یہ سیدھا نہیں ہوگا، اس کے سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اُلٹی طرف موڑو، جب اُلٹی طرف موڑو گے تو یہ سیدھا ہو جائے گا۔ اسی طرح انسان کا نفس بھی اُلٹی طرف مڑا ہوا ہے، اس کو ناجائز غیبت کرنے کی عادت پڑی ہوئی ہے، اس عادت کو چھڑانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ شروع میں جائز غیبت بھی چھوڑے، پھر یہ نفس سیدھا ہو جائے گا، اور آئندہ صرف جائز غیبت ہی سرزد ہوگی، ناجائز غیبت سرزد نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

انفعالی کیفیت کے تقاضے پر عمل

ایک صاحب نے حضرت والا کو لکھا:

''اگر کوئی شخص میری بے جا غیبت کرتا ہے تو بشرطِ اطلاع اس شخص سے دل میں کدورت بلکہ حرارت پیدا ہو جاتی ہے''(۳)

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۰ (۲) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۰ (۳) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۰

یعنی جب مجھے پتہ چل جائے کہ فلاں شخص نے پیٹھ پیچھے میری برائی کی تھی تو اس شخص سے دل میں تکدر پیدا ہوجاتا ہے بلکہ حرارت پیدا ہوجاتی ہے، یعنی طبیعت میں اس کے خلاف غصہ سا پیدا ہوجاتا ہے۔ ان صاحب کا حضرت والا کو یہ حال لکھنے کا منشا یہ تھا کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو ٹھیک، اور اگر یہ غلط اور قابلِ اصلاح بات ہے تو پھر اس کا علاج ہوجائے۔

جواب میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''یہ دونوں کیفیتیں اِنفعال ہیں، اور انفعالات غیر اختیاری ہوتے ہیں، اور غیر اختیاری پر ذم واثم نہیں (یعنی مذمت اور گناہ نہیں) البتہ ان کے مقتضیات کہ اس کی غیبت کرنے لگے اور اس کو ایذاء پہنچانے لگے ومثل ذالک، یہ افعال ہیں، اور افعال اختیاری ہوتے ہیں، اور ان میں سے بعض پر ذم واثم بھی ہوتا ہے، پس جب یہ کیفیات انفعالیہ حادث ہوں (یعنی پیدا ہوں) ان کے مقتضیات فعلیہ پر عمل نہ کیا جائے اور ان کے ازالے کی دعا کی جائے، یا اللہ! میرے یہ خیالات میرے دل سے نکل جائیں تا کہ مفضی الی الافعال نہ ہوجائیں، اور اپنے عیوب و ذنوب کا استحضار کیا جائے تا کہ اس کا جزم ہوجائے کہ میں تو اس شخص کی بدگوئی سے بھی زیادہ کا مستحق ہوں، اور افعال پر عقوبت کا بھی استحضار کیا جائے تا کہ داعیہ افعال کا مضمحل ہوجائے، اور ایک ہفتہ کے بعد پھر اطلاع دی جائے''(۱)

برائی کا خیال دل میں آنا

اس ملفوظ میں حضرت والا نے ایک اصول بھی بیان فرمادیا اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ بھی بیان فرمادیا، اور مختصر لفظوں میں معاملے کی حقیقت پوری طرح واضح فرمادی۔ یہ بڑی کام کی بات ہے جو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں بیان فرمائی ہے۔

وہ یہ کہ کسی برائی کا خیال خود بخود دل میں آجانا یہ ایک غیر اختیاری معاملہ ہے، انسان کے اختیار کو اس میں دخل نہیں، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر گرفت بھی نہیں ہے، گناہ بھی نہیں، یہاں تک کہ اگر شدید گناہ بلکہ (العیاذ باللہ) کفر و شرک کا خیال بھی دل میں آجائے، لیکن یہ خیال خود بخود آئے، تو محض اس خیال کا آجانا نہ تو موجبِ ملامت ہے یعنی وہ آدمی اس پر ملامت کا مستحق نہیں، نہ وہ سزا کا مستحق ہے، اور نہ ہی اس کا فعل گناہ ہے، کیونکہ غیر اختیاری طور پر یہ خیال اس کے دل میں آیا ہے۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۰

کیفیت انفعالیہ گناہ نہیں

اسی طرح کسی شخص کے کوئی عمل کرنے کے نتیجے میں دل کے اندر اگر کوئی تغیر پیدا ہوا جس کو ''انفعال'' کہا جاتا ہے۔ ''انفعال'' کا مطلب ہے کسی دوسرے کا اثر قبول کرنے کے نتیجے میں دل میں ایک حالت کا پیدا ہونا۔ مثلاً دوسرے نے گالی دی، اس کے نتیجے میں طبیعت کے اندر ایک جوش پیدا ہوا، اور غصہ آیا کہ اس نے مجھے گالی دی اور میرے خاندان کو برا کہا، اس غصہ اور جوش کے پیدا ہونے کو ''انفعال'' کہا جاتا ہے۔ یہ ''انفعال'' غیر اختیاری کیفیت ہے اور انسان کی فطرت میں داخل ہے، اس لئے گناہ بھی نہیں۔

اس کے مقتضیات پر عمل گناہ ہے

بعض اللہ والے ایسے ہوتے ہیں جو اپنے نفس کو اتنا کچل چکے ہوتے ہیں کہ ان کو غصہ آتا ہی نہیں، دوسرے شخص نے برا بھلا کہہ دیا، لیکن اس سے طبیعت میں کوئی تغیر اور تأثر نہیں ہوا۔ یہ خاص بندے ہوتے ہیں، ریاضتوں اور مجاہدوں کے نتیجے میں ان کا نفس کچلا جا چکا ہوتا ہے۔

لیکن یہاں عام انسان کی بات ہو رہی ہے۔ جب ایک عام انسان کو برا بھلا کہا جائے گا، یا گالی دی جائے گی، تو اس کے نتیجے میں اس کے اندر تأثر پیدا ہوگا، یہ تأثر کوئی گناہ نہیں، اور نہ ہی اس پر سزا ہے، نہ اس پر ملامت ہے، نہ اس پر مؤاخذہ ہے۔ لیکن جو تأثر پیدا ہوا، اگر تأثر کا مظاہرہ کر دیا، مثلاً کسی نے گالی دیتے ہوئے کہا کہ تو خبیث ہے، آپ نے جواب دیا کہ ''تو خبیث تیرا باپ خبیث'' اس جواب دینے میں غصہ پر عمل کرتے ہوئے حد سے تجاوز کر گئے، تو صرف غصہ آنے پر کوئی مؤاخذہ نہیں تھا، کدورت پیدا ہونے پر کوئی مؤاخذہ نہیں تھا، بلکہ اس کدورت اور غصے کے نتیجے میں اگر برابر کا بدلہ لے لیتے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا، انشاء اللہ، لیکن جب بدلہ لینے میں ایک انچ آگے بڑھ گئے، تو بس اب پکڑ ہو گئی۔ کیونکہ جب آدمی اپنے غصے کے تقاضے پر عمل کرتا ہے تو اکثر و بیشتر حدود پر نہیں رہتا، بلکہ حدود سے متجاوز ہو جاتا ہے، یہ حد سے تجاوز کرنا بڑا خطرناک ہے، کیونکہ یہ اختیاری ہے اور اس پر آخرت میں پکڑ ہو جائے گی۔

معاف کرنے میں عافیت ہے

مثلاً اگر کسی نے آپ کو ایک مُکّا مار دیا، اب بدلہ لیتے ہوئے تول کر مُکّا مارنا کہ جتنی زور سے اس نے مُکّا مارا تھا، اتنا ہی زور کا مُکّا میں بھی ماروں، اس میں زیادتی نہ ہو جائے، اگر ترازو لے کر

مارے گا تبھی ایسا کر سکے گا، ورنہ انسان کے بس میں نہیں کہ برابری کر سکے۔ اسی لئے اللہ کے نیک بندے کو جب کوئی مارتا ہے تو وہ بدلہ نہیں لیتے، اور وہ معاف کرنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں، کیونکہ اگر ذرا بھی حد سے تجاوز کر گئے تو پکڑے جائیں گے۔

بزرگوں کے مختلف رنگ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''ارواحِ ثلاثہ'' میں ایک قصہ لکھا ہے کہ کسی شخص نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ حضرت! یہ جو اللہ والے ہوتے ہیں ان کے الوان (رنگ) مختلف ہوتے ہیں، کسی کا کوئی رنگ ہے، کسی کا کوئی رنگ ہے، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ بزرگوں کے کیا کیا رنگ ہوتے ہیں۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ ارے بھائی چھوڑو، کس چکر میں پڑ گئے، مگر وہ صاحب ان بزرگ کے پیچھے ہی پڑ گئے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا ایسا کرو کہ فلاں گاؤں کی مسجد میں جاؤ، اس مسجد میں تمہیں تین بزرگ عبادت کرتے ہوئے نظر آئیں گے، تم پیچھے سے جا کر تینوں کو ایک ایک مُکّا مار دینا اور پھر مجھے آکر بتانا کہ کیا ہوا۔ چنانچہ وہ صاحب اس گاؤں کی مسجد میں پہنچے تو دیکھا کہ واقعۃً تین بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے جا کر پہلے ایک کو مُکّا مارا، پھر دوسرے کو مارا، پھر تیسرے کو مارا۔ اور جب واپس آئے تو ان بزرگ نے پوچھا کہ ہاں بھائی، کیا معاملہ پیش آیا؟

ان صاحب نے جواب دیا کہ واقعۃً بڑا عجیب معاملہ ہوا، وہ یہ کہ جب میں نے پہلے بزرگ کے مُکّا مارا تو انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا، بلکہ اپنے ذکر و اذکار میں لگے رہے۔ جب دوسرے کو مارا تو انہوں نے مڑ کر ایک مُکّا مجھے بھی مار دیا۔ جب تیسرے کو مُکّا مارا تو وہ مڑ کر میرا ہاتھ دبانے لگے کہ تمہارے ہاتھ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ پھر ان بزرگ نے فرمایا کہ تم جو یہ کہہ رہے تھے کہ مجھے اولیاء اللہ کے رنگ دکھائیں تو یہ مختلف رنگ تھے جو تم نے دیکھے۔

منزل کھوٹی ہوگی

پہلے بزرگ کا یہ رنگ تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی یاد میں لگے ہوئے ہیں، اگر اس دوران ایک شخص آکر مُکّا مار گیا تو کونسی قیامت آگئی؟ اب اگر میں منہ موڑ کر دیکھوں کہ کون مارنے والا ہے اور کیوں مارا؟ اور پھر اس سے بدلہ لینے کی فکر کروں تو اس سے میری یہ منزل کھوٹی ہوگی، اور جس کام میں میں لگا ہوا ہوں اس میں خلل واقع ہوگا، اس لئے انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کون مار رہا ہے۔ یہ ایک رنگ تھا۔

شفقت کی بنیاد پر بدلہ

اور جن بزرگ نے پلٹ کر مُکّا مارا اور بدلہ لے لیا، تو یہ بتاؤ کہ انہوں نے جو مُکّا مارا وہ اتنا ہی زور کا مُکّا مارا جتنا زور کا تم نے مارا تھا یا زیادہ زور سے مارا؟ ان صاحب نے جواب دیا کہ اتنا ہی زور کا مارا تھا۔ فرمایا کہ یہ دوسرا رنگ ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ نے بدلہ لینے کی اجازت دی ہے، اس لئے بدلہ لے لیا۔ اور بعض اوقات بدلہ لینا بھی اللہ والوں کی طرف سے شفقت کی وجہ سے ہوتا ہے، اس لئے کہ بعض اوقات کسی اللہ والے کو ستایا جائے اور اس ستانے کے نتیجے میں وہ صبر کرے، تو اس صبر کا نتیجہ بعض اوقات اس تکلیف دینے والے کے حق میں بہت برا ہوتا ہے۔ (العیاذ باللہ) کیونکہ حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ))(۱)

''جو شخص میرے کسی ولی کو ستائے تو اس کو میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے''

بہر حال، اس لئے ان بزرگ نے بدلہ لے لیا۔ یہ دوسرا رنگ تھا۔

تیسرا رنگ

تیسرے بزرگ کا یہ رنگ تھا کہ بھائی! ہمیں کیا چوٹ لگی، جس نے ہمیں مارا ہے، کہیں اس کو ہماری کمر سے تکلیف نہ پہنچ گئی ہو، اس لئے اس مارنے والے کا ہاتھ سہلانے لگے۔ بہر حال، بزرگوں کے یہ مختلف الوان تھے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کسی دوسرے کے فعل پر تمہیں جو غصہ آیا، اور تمہارے دل میں کدورت پیدا ہوئی، یہ کوئی گناہ نہیں۔ لیکن اگر اس غصے کے تقاضے پر عمل کرتے ہوئے حد سے تجاوز ہو گیا تو یہ قابلِ مؤاخذہ ہے، اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ بدلہ ہی نہ لو، بلکہ معاف کر دو۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ تمہیں اجر بھی ملے گا اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔

اس خیال کو جمنے مت دو

لہٰذا دل میں جو انفعال کی کیفیت اور اثر پیدا ہوا اس پر کچھ مؤاخذہ تو نہیں ہے، لیکن اگر یہ تأثر زیادہ دیر تک دل میں بیٹھ جائے اور جم جائے، تو بالآخر یہ تأثر انسان کو کبھی نہ کبھی گناہ کے اندر مبتلا کر ہی

(۱) جامع العلوم والحکم، ابن رجب الحنبلی (۱/۳۵۷)، معارج القبول، حافظ بن احمد حکمی (۳/۱۰۰۱)

دیتا ہے۔ بالکل یہی معاملہ ''حسد'' کا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کو آپ نے بڑھتا چڑھتا دیکھا، اب آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ تو مجھ سے آگے بڑھ گیا، میں آگے بڑھتا تو اچھا تھا، اس کے پاس پیسہ زیادہ آگیا، اس کا مکان میرے مکان سے زیادہ بڑا، اس کی گاڑی زیادہ خوبصورت، اس کی شہرت مجھ سے زیادہ ہے، اس کی تعریف کرنے والے مجھ سے زیادہ، اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو زیادہ مناسب تھا۔ اور اس کے ساتھ غیر اختیاری طور پر دل میں یہ خیال بھی آگیا کہ یہ نعمت اس سے چھن جائے اور مجھے مل جائے۔ اس حد تک بھی یہ عمل حرام نہیں۔

ورنہ یہ خیال گناہ میں مبتلا کردے گا

لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب یہ خیال دل میں بیٹھ جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں کوئی نہ کوئی ایسا فعل سرزد ہو جاتا ہے جو اس شخص کی بدخواہی پر مشتمل ہوتا ہے جس سے وہ حسد کرتا ہے، مثلاً اس کے لئے بددعا کردی کہ یا اللہ! اس کی یہ دولت چھن جائے، یا کوئی ایسی تدبیر کرلی جس کے نتیجے میں اس کو نقصان پہنچے، یا لوگوں کے سامنے اس کا ذکر اس انداز سے کردیا جس سے لوگوں کے دلوں میں اس کی بے عزتی ہو، یا کوئی بھی ایسا کام کرلیا جس سے اپنے دل کے اس جذبے کو تسکین دینا مقصود ہو، تو یہ سب کام بالاتفاق حرام ہیں۔ لہٰذا صرف خیال کا آجانا بذاتِ خود حرام نہیں تھا، لیکن جب وہ خیال دل میں جم گیا اور اس خیال کے مطابق عمل کرلیا تو اب یہ حرام ہوگیا۔

غیر اختیاری خیال کا علاج

لہٰذا یہ غیر اختیاری خیال جو دل میں آیا ہے، چاہے وہ خیال ''حسد'' کا ہو یا ''تکدر'' کا ہو یا ''غصہ'' کا ہو، اس کا بھی علاج کرنا ضروری ہے، کیونکہ اگر تم نے اس غیر اختیاری خیال کا علاج نہیں کیا تو یہ تمہیں ماردے گا، گرادے گا۔ اب اس کا علاج کیا ہے؟ اس کا علاج یہ ہے کہ پہلے اس خیال کو دل سے برا سمجھو کہ جو خیال میرے دل میں آرہا ہے یہ بہت غلط خیال ہے، میرے دل میں یہ خیال نہیں آنا چاہئے۔ مثلاً میرے دل میں یہ جو خیال آرہا ہے کہ فلاں شخص سے یہ نعمت چھن جائے اور مجھے مل جائے، یہ برا خیال ہے۔ یا مثلاً میرے دل میں فلاں کی طرف سے تکدر پیدا ہو رہا ہے کہ فلاں شخص بہت برا آدمی ہے، یہ اچھی بات نہیں۔ اور اس وقت اپنے اندر جو عیوب ہیں، ان کا استحضار کرو کہ میرے اندر کیا عیب ہیں؟ اس نے تو غیبت کرتے ہوئے میرے بارے میں ایک کلمہ کہا تھا، حقیقت میں تو میں اس سے زیادہ کا مستحق تھا۔

پہلا علاج دعا کرنا

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ! میرے دل میں جو خیال پیدا ہو رہا ہے، کہیں میرا یہ خیال کسی ایسے فعل پر آمادہ نہ کر دے جو حرام ہو، اور اس کے نتیجے میں میں ہلاک ہو جاؤں۔ یا اللہ! میرے دل سے اس خیال کو نکال دیجئے۔ اس خیال کا اس طریقے سے علاج کرنا ضروری ہے اور اگر تم اس خیال کا اس طرح سے علاج نہیں کرو گے، بلکہ اس خیال کو اسی طرح چھوڑ دو گے تو وہ خیال دل میں جمتا چلا جائے گا اور کسی نہ کسی وقت وہ تمہیں گناہ میں مبتلا کر دے گا۔ لہٰذا اس خیال کو برا سمجھو اور اس کو ختم کرنے کی فکر کرو۔ اور اگر دوسرے کی طرف سے حسد پیدا ہو رہا ہے تو ایسی تدبیریں اختیار کرو جو تقاضۂ حسد کے اُلٹ ہوں۔ مثلاً دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ فلاں شخص ذلیل ہو جائے، لیکن تم دل پر پتھر رکھ کر یہ دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو عزت عطا فرما۔ یا مثلاً دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ لوگ اس کی برائی کریں اور لوگوں کی نظروں میں یہ حقیر ہو جائے، لیکن تم اس کے لئے یہ دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو لوگوں کی نظروں میں مقبول بنا دے۔ دعا کے یہ الفاظ زبان سے ادا کرتے وقت حاسد کے دل پر آرے چل جائیں گے، لیکن اس بیماری کا علاج یہ آرے چلانا ہی ہے۔ اسی طرح اگر دوسرے کی طرف سے دل میں تکدر پیدا ہو رہا ہے تو اس کا بھی یہی علاج ہے کہ اپنے اس تکدر کو برا سمجھے۔

دوسرا علاج، عذاب کا استحضار

آخر میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''افعال پر عقوبت کا استحضار کیا جائے'' یعنی میرے دل میں جو تکدر پیدا ہو رہا ہے اگر اس تکدر نے آگے بڑھ کر مجھ سے کوئی گناہ کا کام کرالیا، مثلاً غیبت کرالی یا دوسرے کی بدخواہی کا کام کرالیا تو اس گناہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب ہوگا وہ عذاب کتنا سخت ہے۔ یہ عقوبت کا استحضار کیوں کرے؟ ''تاکہ داعیہ افعال کا مضمحل ہو جائے'' یعنی دل میں جو یہ خیال آرہا ہے کہ میں اس کے خلاف کوئی کام کر گزروں، یہ خیال کمزور ہو جائے۔

ایک ہفتہ کے بعد اطلاع دو

پھر آخر میں حضرت نے فرمایا کہ ''ایک ہفتہ کے بعد پھر اطلاع دی جائے'' کیونکہ معالج تو یہ دیکھتا ہے کہ اس دوا سے کتنا فائدہ ہوا، اگر فائدہ ہوا تو ٹھیک، ورنہ بدل کر دوسری دوا دی جائے، اس لئے کہ بعض اوقات پہلے سے زیادہ کڑوی دوا دینی پڑتی ہے، اس لئے صرف ایک مرتبہ شیخ سے رہنمائی لینا کافی نہیں۔ لہٰذا حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے جو بیان فرمایا وہ اصول کے درجے میں تو درست ہے، لیکن

مختلف حضرات کے لحاظ سے یہ علاج کسی کے لئے کار آمد ہو جائے گا اور دوسرے کے لئے مزید کسی علاج معالجے کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا کوئی شخص یہ اصولی علاج پڑھ کر یہ نہ سمجھے کہ میں نے یہ اصول پڑھ لیا اور علم حاصل ہو گیا، اور اب میں خود ہی اس پر عمل کرلوں گا اور اپنے آپ کو اس گناہ سے بچالوں گا، شیخ کی ضرورت ہی نہیں۔

حضرت نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ شیخ کی پھر بھی ضرورت ہے، اگرچہ تمہیں علم حاصل ہو گیا، لیکن ایک ہفتہ کے بعد شیخ کو اطلاع دینا کہ اس علاج سے کتنا فائدہ ہوا، اس کے بعد شیخ فیصلہ کرے گا کہ یہ علاج کافی ہے یا نہیں؟ اور مزید دوا کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

غیبت کی معافی کا طریقہ

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

> ''اگر کسی کی غیبت ہوگئی تو استغفار کے ساتھ مغتاب سے بھی معافی مانگنے کی ضرورت ہے۔ لیکن تفصیل غیبت کی اس کو بتلانا اس کو ایذاء دینا ہے، اس لئے اجمالاً یوں کہنا کہ ''میرا کہا سنا معاف کردو'' کافی ہے''(۱)

حضرت والا نے اس ملفوظ میں غیبت کی معافی کا طریقہ بیان فرمایا ہے کہ اگر کسی کی غیبت ہو جائے تو اس کی معافی کا کیا طریقہ ہے؟ غیبت کا تعلق حقوق العباد سے ہے، کیونکہ غیبت میں دوسرے مسلمان بھائی کا حق پامال ہوتا ہے اور حقوق العباد کی معافی اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک صاحبِ حق معاف نہ کرے۔ لہٰذا اگر آپ نے کسی کو جسمانی یا ذہنی یا کسی اور قسم کی تکلیف پہنائی ہے تو محض توبہ استغفار کر لینے سے اس کی معافی نہیں ہوگی بلکہ صاحب حق کا معاف کرنا ضروری ہے۔

حقوق العباد کی سنگینی

جو گناہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے شراب نوشی اور زنا کاری وغیرہ، ان کی معافی کا راستہ یہ ہے کہ اگر انسان ایک مرتبہ بیٹھ کر صدق دل سے یہ عزم کرلے کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا۔ اور پچھلے گناہ پر نادم اور شرمندہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا کر توبہ کرلے تو انشاء اللہ یہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔ لیکن حقوق العباد اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک وہ شخص معاف نہ کرے جس کا حق پامال کیا گیا۔ غیبت بھی اسی میں داخل ہے۔ لہٰذا اگر خالی بیٹھ کر توبہ کرلی کہ یا اللہ! جو غیبت

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ۱۵۱

کرلی ہے اس سے میں توبہ استغفار کرتا ہوں مجھے معاف فرما، صرف اتنا کرلینے سے غیبت کا گناہ معاف نہیں ہوگا جب تک اس شخص سے معافی نہ مانگی جائے جس کی غیبت کی گئی ہے اور وہ معاف نہ کردے۔ اس وقت تک غیبت کا گناہ معاف نہ ہوگا۔ اس لئے حضرت والا نے اس ملفوظ میں فرمایا کہ اگر کسی کی غیبت ہوگئی تو استغفار کے ساتھ ''مغتاب'' سے یعنی جس کی غیبت کی گئی تھی اس سے بھی معافی مانگنے کی ضرورت ہے۔

غیبت کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں

پھر فرمایا:

''لیکن تفصیل غیبت کی اس کو بتلانا اس کی ایذاء دینا ہے''

مثلاً اس سے یہ کہنا کہ میں نے فلاں وقت میں فلاں غیبت کی تھی اور تمہیں یہ یہ کہا تھا اور تمہاری یہ برائی بیان کی تھی، اب تم مجھے معاف کردو۔

کیونکہ اندیشہ یہ ہے کہ اس تفصیل کے بیان سے اس کو تکلیف پہنچے گی۔ اس لئے ساری تفصیل بیان کرکے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اجمالاً یوں کہنا کہ میرا کہا سنا معاف کردو، یہ بھی کافی ہے۔ دیکھئے، اللہ تعالیٰ نے کتنی آسانی کے راستے پیدا فرمادیئے ہیں۔

کہا سنا معاف کردینا

یہ جملہ کہ ''کہا سنا معاف کردینا'' یہ ہمارے بزرگوں کا چلایا ہوا کتنا حکیمانہ جملہ ہے۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا اس وقت سے بڑوں سے یہ سنتے چلے آرہے ہیں کہ جب دو چار آدمی کچھ دن ساتھ رہنے کے بعد جدا ہونے لگتے ہیں تو اس وقت ایک دوسرے سے یہ جملہ کہتے ہیں کہ بھائی ہمارا کہاسنا معاف کردینا۔ اس لئے کہ جب سفر یا حضر میں دو چار آدمی ساتھ رہتے ہیں تو کچھ نہ کچھ ایک دوسرے کی حق تلفی ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ لہٰذا جدا ہونے سے پہلے ان حقوق کو معاف کرالو، اگر یہ معاف نہ کرایا اور بعد میں کچھ عرصہ کے بعد خیال آیا کہ ہم نے تو فلاں کی حق تلفی کی تھی، تو اس وقت کہاں ڈھونڈتے پھروگے؟ بعد میں معلوم نہیں کہ ملاقات ہو یا نہ ہو، مافی مانگنے کا موقع ملے یا نہ ملے، لہٰذا جدا ہوتے وقت ہی یہ کام کرلینا چاہئے۔ اس جملہ میں غیبت بھی خود بخود داخل ہوجائے گی اور غیبت سے بھی معافی ہوجائے گی۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل

میں نے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی شخص مجھ سے یہ کہتا ہے کہ میں نے آپ کی غیبت کی ہے، مجھے معاف کردو۔ تو میں اس سے کہتا ہوں کہ میں معاف تو ضرور کردوں گا، لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کیا غیبت کی تھی؟ ظاہر ہے کہ صاحبِ حق کو یہ پوچھنے کا حق ہے کہ کیا غیبت کی تھی۔ فرماتے تھے کہ اس سوال سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات غیبت سچی ہوتی ہے، اس لئے کہ غیبت کے اندر یہ ضروری نہیں ہے کہ غلط ہی ہو، تو اس کے بتانے سے اپنی غلطی کا پتہ لگ جاتا ہے۔

کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا!

دوسرے اس کے ذریعہ یہ پتہ چل جاتا ہے کہ تمہارے بارے میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کا غیر جانب دارانہ تبصرہ کیا ہے؟

کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

کیونکہ جو لوگ تمہارے اردگرد رہتے ہیں وہ تو تمہاری تعریف ہی کریں گے، تمہیں اچھا ہی کہیں گے، لیکن پیٹھ پیچھے تمہیں لوگ کیا کہتے ہیں اور تمہارے بارے میں کیا خیال کرتے ہیں، کیا تصور رکھتے ہیں، اس کا علم ہو جانا بھی مفید ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر سب لوگ تمہاری تعریف کرتے رہیں تو اس کے نتیجے میں بعض اوقات آدمی کے دل میں عجب پیدا ہو جاتا ہے، اور یہ سوچتا ہے کہ یہ ساری مخلوق جو میری تعریف کررہی ہے، تو ضرور میرے اندر کمال ہے جس کی وجہ سے یہ ساری مخلوق میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اس طرح دل میں عُجب پیدا ہو جاتا ہے۔

اس عُجب کا علاج یہ ہے کہ تم یہ دیکھو کہ جو لوگ تمہارے پیچھے رہنے والے ہیں، وہ تمہیں کیا کہتے ہیں؟ اور تمہارے بارے میں ان کی کیا رائے ہے؟ اس کے ذریعہ انسان کے عُجب کا علاج ہوتا ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب میرے پاس کوئی معافی مانگنے آتا تو میں اس سے کہتا کہ میں معاف تو کردوں گا، لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کیا غیبت کی تھی؟ جب بتاؤ گے تو میں معاف کردوں گا۔

اجمالی معافی تمام متعلقین سے مانگ لو

اب سوال یہ ہے کہ کس کس سے معافی مانگے؟ پہلے تو دھیان اور فکر نہیں تھی، نہ جانے کس کس

کی غیبت ہوگئی، تو کیا ان آدمیوں کی پہلے فہرست بنائے، اور پھر ان سے معافی مانگے؟ حضرت والد ماجدؒ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! اگر جنت لینی ہے تو جنت اس قدر سستی نہیں ہے، یہ کام تو کرنا پڑے گا۔ لہٰذا جو اپنے متعلقین ہیں، اپنے دوست احباب ہیں، ملنے جلنے والے ہیں، عزیز رشتہ دار ہیں، ان کی ایک فہرست بناؤ، اور پھر جا کر ان سے معافی مانگو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ سے معافی مانگنا

ہم اور آپ تو کس شمار و قطار میں ہیں، ہم سب کے سردار جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع میں کھڑے ہو کر معافی مانگ رہے ہیں، کہ کسی کا مجھ پر کوئی حق رہ گیا ہو تو وہ یا تو مجھ سے وصول کر لے، اور اگر جسمانی حق ہو تو مجھ سے بدلہ لے لے، یا معاف کر دے۔ چنانچہ ایک صحابی کھڑے ہوگئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے ایک دن میری کمر پر مارا تھا، وہ میرا حق آپ کے ذمے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں نے تمہاری کمر پر مارا تھا تو تمہیں حق ہے کہ تم میری کمر پر آکر مارلو۔ اور وہ صحابی قریب آئے تو انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جس وقت آپ نے میری کمر پر مارا تھا، اس وقت میری کمر پر کپڑا نہیں تھا، جبکہ آپ کی کمر مبارک پر کپڑا ہے۔ چنانچہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے کمر مبارک سے کپڑا اٹھالیا۔ ان صحابی کا اصل مقصد یہ تھا کہ میں مہر نبوت کو بوسہ دوں۔ چنانچہ وہ صحابی آگے بڑھے اور مہر نبوت کو بوسہ دیا۔ (۱)

لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے لئے تیار تھے کہ کوئی چھوٹا بھی مجھ سے آکر بدلہ لینا چاہے تو بدلہ لے لے۔ جب اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں ہو، آخرت کی فکر ہو، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس ہو، تو پھر دنیاوی طور پر لوگوں کے سامنے ذلیل ہونے کے سارے تصورات ہیچ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے نفس و شیطان نے ہمارے دلوں میں ان تصورات کے بت بنا رکھے ہیں کہ معافی مانگنے سے ہماری ذلّت ہو جائے گی، ہماری ناک کٹ جائے گی، ہماری بے عزتی ہو جائے گی۔ ارے ایسی ہزار بے عزتیاں ہو جائیں، اس کے لئے ہم تیار ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ اپنی ناراضگی سے بچالے اور اپنے غضب سے بچالے۔

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا معافی نامہ شائع کرانا

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جب دل کا دورہ پڑا، اسپتال میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے، جب ہوش آیا تو پہلا کام جو مجھ سے فرمایا، وہ یہ تھا:

(۱) مجمع الزوائد، باب فی وداعہ صلی اللہ علیہ وسلم (۹/۲۷)

''میری طرف سے میرے تمام متعلقین کو ایک تحریر لکھ کر بھیج دو کہ جس کسی کا کوئی حق مجھ سے فوت ہوا ہو، یا کسی کی غیبت کی ہو، یا برائی کی ہو تو وہ مجھ سے بدلہ لے لے یا مجھے معاف کر دے''

چنانچہ میں نے وہ تحریر لکھی اور ''کچھ تلافی مافات'' کے نام سے پہلے ''البلاغ'' میں شائع کی، اور پھر اس کو ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کر کے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جتنے متعلقین تھے، ان سب کے پاس بھیجا۔

بہر حال، حقوق العباد کی معافی کے لئے صرف زبانی توبہ کافی نہیں، بلکہ صاحبِ حق سے معاف کرانا ضروری ہے، اور غیبت کرنا حق العبد کو ضائع کرنا ہے، لہٰذا جس کی غیبت کی ہے اس سے معافی مانگنا ضروری ہے۔

جس کی غیبت کی اس کی تعریف کرو

آگے فرمایا:

''اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جن لوگوں کے سامنے غیبت کی تھی ان کے سامنے اس کی مدح و ثنا بھی کرو اور پہلی بات کا غلط ہونا ثابت کر دو''(۱)

کیونکہ تم نے اس سے تو معافی مانگ لی، اور اللہ تعالیٰ سے بھی توبہ استغفار کر کے معاملہ صاف کر لیا، لیکن مخلوق کے دل میں تم نے اس شخص کی جو برائی پیدا کی ہے اس کی تلافی بھی ضروری ہے، تلافی کے لئے اب اس کی مدح و ثنا اور تعریف کرو، اور پہلی بات کا غلط ہونا ثابت کر دو اور ان سے یہ کہو کہ جو بات میں نے کہی تھی وہ غلط تھی۔ آگے فرمایا:

''اور اگر وہ بات غلط نہ ہو، بلکہ سچی ہو تو یوں کہہ دو کہ بھائی! اس بات پر اعتماد کر کے تم فلاں شخص سے بدگمان نہ ہونا، کیونکہ مجھے خود اس پر اعتماد نہیں رہا۔ یہ تو ریہ ہو جائے گا، کیونکہ سچی بات پر بھی اعتماد قطعی بدون وحی کے ہو نہیں سکتا''(۲)

یعنی اگر تم نے غیبت کے دوران سچی برائی بیان کر دی تھی، کیونکہ غیبت سچی بھی ہوتی ہے، تو اب اس کے بارے میں یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ غلط تھی، لہٰذا اب یہ کہہ دو کہ میری اس بات پر اعتماد کر کے تم فلاں شخص سے بدگمان نہ ہونا، کیونکہ مجھے خود اس بات پر اعتماد نہیں رہا۔ اس لئے کہ سچی بات پر مکمل بھروسہ وحی کے بغیر نہیں ہو سکتا، مکمل بھروسہ کے لئے یا تو مشاہدہ ہو، یا وحی ہو، اس کے علاوہ سو فیصد اعتماد کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اب مجھے اس بات پر اعتماد

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ۱۵۱ (۲) انفاسِ عیسیٰ: ۱۵۱

نہیں۔انشاء اللہ اس کے ذریعہ اس غیبت کی تلافی ہو جائے گی جو آپ نے اس کی برائی بیان کر کے کی ہے۔

جس کی غیبت کی تھی اگر وہ مر چکا ہو تو؟

آگے ارشاد فرمایا:

''اگر وہ شخص مر گیا ہو جس کی غیبت کی ہے، تو اب معاف کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے لئے دعا و استغفار کرتے رہو، یہاں تک کہ دل گواہی دیدے کہ اب وہ تم سے راضی ہو گیا ہوگا''

یعنی جس شخص کی آپ نے غیبت کی تھی، اب اس کا انتقال ہو چکا ہے، تو اب اس سے کیسے معافی مانگی جائے؟ تو اس سے معاف کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے لئے دعاء و استغفار کرتے رہو، یہاں تک کہ تمہارا دل یہ گواہی دیدے کہ اب وہ شخص تم سے راضی ہو گیا ہوگا۔

لہٰذا حقوق العباد کا معاملہ اگرچہ بڑا سنگین ہے کہ جب تک صاحبِ حق معاف نہ کرے، اس وقت تک معاف نہیں ہوگا۔اور اگر صاحبِ حق کا انتقال ہو گیا تو اور زیادہ مشکل، لیکن کسی صورت میں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، کسی بھی حالت میں اللہ تعالیٰ نے مایوسی کا راستہ نہیں رکھا کہ اب تیرے لئے معافی کا راستہ بند ہے۔

ننانوے قتل کرنے والے کا راستہ

بخاری شریف میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے ننانوے قتل کر دیئے، پھر اس کو توبہ اور استغفار کا خیال آیا تو وہ ایک راہب کے پاس گیا، اور اس سے جا کر کہا کہ میں نے ننانوے قتل کیے ہیں، کیا میرے لئے توبہ اور معافی کا کوئی راستہ ہے؟ اس راہب نے کہا کہ تیری معافی کا کوئی راستہ نہیں، تو سیدھا جہنم میں جائے گا، اس لئے کہ تو نے ننانوے آدمیوں کو قتل کر دیا ہے۔اور صرف توبہ کرنے سے یہ گناہ معاف نہیں ہوگا۔جب تک کہ تو ان سب مقتولین کے ورثاء سے معافی نہ مانگ لے، اور ان سب کے ورثاء سے کیسے تو معافی مانگے گا؟ اس لئے تیری معافی کا کوئی راستہ نہیں، تو جہنمی ہے۔اس نے کہا کہ اچھا میری معافی کا کوئی راستہ نہیں تو ننانوے قتل تو ہو گئے، سوواں ایک اور سہی، اور یہ کہہ کر اس نے اس راہب کو بھی قتل کر دیا۔اس طرح اس نے سو کی تعداد پوری کر لی۔

اس کے بعد پھر ایک اور راہب کے پاس گیا، اس سے جا کر اس نے سارا واقعہ بتایا کہ ننانوے تو پہلے قتل کر دیئے تھے، ایک اور قتل کر دیا، اب بتائیے کہ میرے لئے توبہ اور استغفار کا کوئی

راستہ ہے؟ اس راہب نے کہا کہ ہاں! تیرے لئے توبہ کا راستہ ہے، وہ یہ کہ تو پہلے توبہ اور استغفار کر، اور پھر فلاں مقام پر ایک بستی ہے، وہاں نیک لوگ رہتے ہیں، وہاں جا کر ان کی صحبت اختیار کر۔ اس راہب نے نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے کا مشورہ اس لئے دیا تھا کہ جب برے لوگوں کی صحبت سے نکل کر نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرے گا تو اس گناہ سے بچنا اس کے لئے آسان ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ قاتل توبہ اور استغفار کر کے یہ ارادہ کر کے اپنی بستی سے چل پڑا کہ میں اب اپنی زندگی میں انقلاب لاؤں گا اور آئندہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کروں گا، کوئی نافرمانی نہیں کروں گا، نیک لوگوں کی صحبت اختیار کروں گا، جو میرے ذمے فرائض و واجبات ہیں ان کو ادا کروں گا۔ یہ سب ارادے لے کر چلا۔

ابھی وہ راستے میں تھا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم آگیا کہ اس کی روح قبض کر لو، چنانچہ اس کی روح قبض کر لی گئی اور اس کا انتقال ہو گیا، اب انتقال کے بعد ملائکہ کا آپس میں جھگڑا ہو گیا، ملائکہ رحمت نے کہا کہ یہ شخص توبہ کر کے پاک صاف ہو کر دوسری بستی کی طرف جا رہا تھا، اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے جا رہا تھا، لہٰذا ہم اس کو لے کر جائیں گے۔ جو ملائکہ عذاب تھے، انہوں نے کہا کہ اس شخص کی ساری زندگی گناہوں کے اندر گزری، اس نے سو آدمیوں کو قتل کیا ہے، لہٰذا ہم اس کو عذاب کے لئے لے جائیں گے۔ یہ جھگڑا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اچھا یہ دیکھو کہ جس بستی سے یہ نکلا تھا اور جس بستی کی طرف یہ جا رہا تھا، انتقال کے وقت یہ کس بستی سے زیادہ قریب تھا؟ جب ناپا گیا تو جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس سے چند گز زیادہ قریب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب یہ شخص توبہ کر کے نیک لوگوں کی بستی کی طرف چل پڑا تھا اور اس سے زیادہ قریب ہو گیا تھا تو اب ہم بھی اس کے ساتھ مغفرت کا معاملہ کرتے ہیں۔ (۱)

مایوس ہونے کی ضرورت نہیں

بہر حال، مایوسی کا کوئی راستہ نہیں کہ چونکہ ہم سے حقوق العباد ضائع ہو گئے ہیں، اور جن کے حقوق ضائع کیے ہیں ان کا انتقال ہو گیا ہے، لہٰذا اب ہماری مغفرت نہیں ہو سکتی، ایسا نہیں ہے۔ ابتداء میں تو حقوق العباد کا بہت اہتمام کرو، اور ان کے ضائع ہونے کو سنگین سمجھو، اور کسی اللہ کے بندے کے حق کو پامال نہ کرو، لیکن اگر کسی کا کوئی حق ضائع ہو جائے تو فوراً معاف کرالو اور اگر معاف کرانے کا

(۱) صحيح البخارى، كتاب أحاديث الأنبياء، باب حديث الغار، رقم: ۳۲۱۱، صحيح مسلم، كتاب التوبة، باب قبول توبة القاتل وان كثر قتله، رقم: ٤٩٦٧، سنن ابن ماجه، كتاب الديات، باب هل لقاتل مؤمن توبة، رقم: ۲٦۱۲، مسند أحمد، رقم: ۱۰۷۲۷

کوئی راستہ نہ ہو تو مایوس نہ ہو، بلکہ اس کے لئے استغفار کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو کہ یا اللہ! اپنے فضل و کرم سے مجھ سے ان بندوں کو راضی کر دیجئے جن کے حقوق میں نے پامال کیے اور یہ دعا کرتے رہو کہ یا اللہ! ان کے درجات بلند فرمائیے، ان کی مغفرت فرمائیے، ان کو رضاء کاملہ عطا فرمائیے۔ یہ دعا کرتے رہو یہاں تک کہ یہ گمانِ غالب ہو جائے کہ وہ راضی ہو گئے ہوں گے۔

ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات میں مایوسی کا کوئی راستہ نہیں، ساری تعلیم یہ ہے کہ۔

سوئے ناامیدی مرو امید ہا است
سوئے تاریکی مرو خورشید ہا است

حضرت والا نا اُمیدی اور تاریکی کی طرف جانے ہی نہیں دیتے، بلکہ راستہ بتا دیتے ہیں کہ اب اس طرح کر لو، اب اس طرح کر لو، اللہ تعالیٰ نے ہر صورتِ حال کا علاج رکھا ہے۔

کفر و شرک سے توبہ

دیکھئے! کفر و شرک سے زیادہ خراب چیز دنیا میں کوئی اور نہیں، کفر اور شرک کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کو معاف نہیں کروں گا، اس کے علاوہ ہر چیز معاف کر دوں گا۔ لیکن اس کفر و شرک سے بھی توبہ کرنے کا راستہ کھول دیا، اگر ستر برس کا کافر بھی کفر و شرک سے توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ قبول کر لیتے ہیں اور اس کو معاف فرما دیتے ہیں۔

شیطان کا بہکاوا

لہٰذا حقوق العباد کا معاملہ اگرچہ مشکل ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے آدمی نا اُمید ہو کر بیٹھ جائے۔ اسی لئے شیطان انسان کے اندر مایوسی پیدا کر کے بہکاتا ہے اور وہ انسان سے یہ کہتا ہے کہ اس گناہ کے نتیجے میں تو مردود ہو گیا، اب تیرا ٹھکانہ جہنم ہے، تیری معافی کا کوئی راستہ نہیں، لہٰذا جو تیری مرضی میں آئے وہ کام کر، اس لئے کہ جب جہنم میں جانا ہی ٹھہرا تو پھر دنیا میں خوب مزے اُڑا کر اور خوب گناہ کر کے جا۔ یہ شیطان اس طرح دھوکہ دیتا ہے اور زیادہ گناہوں کے اندر مبتلا کر دیتا ہے۔ جبکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا اُمیدی مؤمن کا کام نہیں، کتنے ہی بڑے سے بڑے گناہ کر لیے ہوں پھر بھی وہ گناہ اللہ کی رحمت سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔

''ابونواس'' کی مغفرت کا واقعہ

عرب کے ایک شاعر گزرے ہیں، جس کی کنیت ''ابونواس'' تھی، یہ آزاد منش قسم کا شاعر تھا،

ان شعراء میں اس کا شمار تھا جو ہر قسم کے گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں، چنانچہ ساری عمر گناہوں میں اور پینے پلانے میں گزری۔ ایک شخص نے مرنے کے بعد ان کو خواب میں دیکھا، اس سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ اس نے کہا کہ میں کیا بتاؤں! جب میں مر رہا تھا، اس وقت میں بہت ڈر رہا تھا کہ جب اللہ میاں کے سامنے جاؤں گا تو وہاں میری ایسی پٹائی ہوگی کہ ساری زندگی کے مزے دھرے رہ جائیں گے، اس لئے مجھے بہت فکر اور تشویش تھی کہ کیا ہوگا؟ اسی فکر اور تشویش کے عالم میں میں نے تین شعر کہے، بس اللہ تعالیٰ نے ان شعروں کی وجہ سے مجھے بخش دیا۔ اب خواب میں اس نے وہ شعر سنائے کہ وہ شعر یہ تھے، وہ شعر بھی بڑے عجیب تھے، جب اللہ تعالیٰ شاعر کو توفیق دیدے تو شعر کے اندر اچھی بات بھی خوب بیان کرتا ہے۔ وہ شعر یہ ہیں۔

يَا رَبِّ إِنْ عَظُمَتْ ذُنُوبِي كَثْرَةً
فَلَقَدْ عَلِمْتُ بِأَنَّ عَفْوَكَ أَعْظَمُ
إِنْ كَانَ لَا يَرْجُوكَ إِلَّا مُحْسِنٌ
فَبِمَنْ يَلُوذُ وَ يَسْتَجِيرُ الْمُجْرِمُ

''اے پروردگار! اگرچہ میرے گناہ بہت زیادہ ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کی مغفرت اور آپ کی معاف کرنے کی صفت میرے گناہوں سے کہیں زیادہ عظیم ہے۔ اگر آپ کی رحمت کی اُمید صرف نیک لوگ ہی کرسکتے ہیں تو یہ مجرم بیچارہ کہاں جائے گا؟ یہ کس کی پناہ حاصل کرے گا؟ یہ کس کا دروازہ کھٹکھٹائے گا''

وَمَدَدْتُ يَدِي إِلَيْكَ تَضَرُّعًا
فَلَئِنْ رَدَدْتُ يَدِي فَمَنْ ذَا يَرْحَمُ (۱)

''میں آج آپ کے سامنے عاجزی کے ساتھ ہاتھ پھیلا رہا ہوں، اگر آپ نے یہ ہاتھ واپس کردیے تو پھر کون ہے جو ان پر رحم کرے''

جاتے جاتے یہ شعر کہے، پتہ نہیں کس دل سے یہ اشعار کہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ جا، میں تیری ان شعروں پر بخشش کرتا ہوں۔ اور یہ وہ اشعار ہیں جو ''ابونواس'' کے بیاض میں موجود نہیں تھے، اس لئے کہ بالکل آخر وقت میں دنیا سے جاتے جاتے کہے تھے، اس لئے بیاض میں لکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی، اس لئے خواب ہی میں خواب دیکھنے والے کو بتایا کہ میں نے یہ شعر کہے تھے۔ جس شخص نے خواب دیکھا تھا، اس نے اس خواب ہی کے حوالے سے یہ اشعار ابونواس کے دیوان میں تحریر کردیئے۔

(۱) مختصر تاريخ دمشق (٢/٤٢٢)، بهجة المجالس وأنس المجالس (١/٢٥٥)

ظاہری حالت پر فیصلہ مت کرو

اسی لئے بزرگ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کی ظاہری حالت دیکھ کر اس کے بارے میں کبھی جنتی یا جہنمی ہونے کا فیصلہ نہ کرو، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی کونسی ادا پسند آجائے، کیا پتہ آخر میں اس کا خاتمہ کیسے عمل پر ہو، اور اللہ تعالیٰ اس کو نواز دے، اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''میں ہر مسلمان کو اپنے آپ سے حالاً اور ہر کافر کو احتمالاً افضل سمجھتا ہوں۔ ''احتمالاً'' کا مطلب یہ ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی توفیق دیدے اور مجھ سے آگے نکل جائے۔ اس لئے ظاہری حالت میں کوئی شخص کیسا بھی ہو، تم اس کے فعل سے نفرت کرو کہ یہ شراب پینا بری بات ہے، لیکن اس کی ذات سے نفرت مت کرو۔ کیا پتہ اللہ تعالیٰ اس کو توبہ کی توفیق دیدے اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین پر صحیح طور پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

غیبت مباح کی صورت میں

آگے حضرت والا نے فرمایا:

> ''اگر دینی ضرورت ہو تو پھر غیبت بھی مباح ہے، جیسے محدثین نے رواۃ حدیث پر جرح کی ہے۔ اگر دینی ضرورت نہیں بلکہ محض نفسانیت ہی نفسانیت ہے تو اس صورت میں امر محقق کا بیان کرنا بھی غیبت محرمہ ہے اور بلا تحقیق کوئی بات کہی جائے تو بہتان ہے۔ کِذب کا مدار تحقیق کذب پر نہیں بلکہ عدم تحقیق صدق پر ہے''

یعنی دینی ضرورت سے کسی کا عیب یا برائی بیان کرنا جائز ہے۔ چنانچہ تمام محدثین حضرات کا تو کام ہی لوگوں کے حالات کی تحقیق کرنا تھی کہ فلاں راوی کیسا ہے اور فلاں راوی کیسا ہے؟ چنانچہ جب کوئی شخص ان سے راوی کے بارے میں سوال کرتا تو وہ بتادیتے کہ یہ راوی ضعیف ہے، اور یہ راوی جھوٹا ہے، یہ راوی کذاب ہے، یہ راوی شتام ہے۔ لیکن یہ بیان کرنا ان کے ذمے واجب تھا۔ اگر بیان نہ کرتے تو گناہ گار ہوتے، کیونکہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی حفاظت کا یہی طریقہ تھا کہ یہ معلوم کیا جائے کہ کونسا راوی کیسا ہے؟ لہٰذا یہ غیبت چونکہ دینی ضرورت کے لئے تھی اس لئے یہ جائز تھی۔

علی بن مدینی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت علی بن مدینی رحمۃ اللہ علیہ بڑے اونچے درجے کے محدثین میں سے ہیں اور جرح و تعدیل

کے امام ہیں۔ البتہ ان کے والد حدیث کے معاملے میں پوری طرح قابلِ اعتماد نہیں تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ اپنے والد کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ وہ حدیث میں قوی ہیں یا ضعیف ہیں؟ پہلے تو فرمایا کہ میرے والد کے بارے میں یہ بات دوسرے محدثین سے پوچھ لو۔ سوال کرنے والے نے کہا کہ ان کے بارے میں مجھے آپ کی رائے معلوم کرنی ہے۔ جب سوال کرنے والے نے اصرار کیا تو آپ نے سر جھکایا اور پھر فرمایا:

"هُوَ الدِّيْنُ، إِنَّهُ ضَعِيفٌ"(۱)

یہ دین کی بات ہے، اسلئے یہ بتارہا ہوں کہ میرے والد حدیث کے معاملے میں ضعیف ہیں"

چونکہ دین کی بات ہے اور دین کی بات کو چھپانا نہیں ہے، چاہے وہ باپ کے خلاف ہو یا بیٹے کے خلاف ہو، وہ دین کی ضرورت کے تحت کہنی ہوگی۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

امام ابوداؤد سجستانی رحمۃ اللہ علیہ جو "سنن ابوداؤد" کے مصنف ہیں، اتنے بڑے جلیل القدر محدث اور اتنے بڑے امام ہیں۔ ان کا بیٹا "ابن ابی داؤد" حدیث کے بارے میں ضعیف تھا۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ اپنے بیٹے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا:

"لَا تَحِلُّ عَنْهُ الرِّوَايَةُ"(۲)

"اس سے روایت کرنا حلال نہیں"

دیکھئے! حضرات محدثین نے عیب کا اظہار کرنے میں نہ باپ کی پرواہ کی، نہ بیٹے کی پرواہ کی، اور نہ عزیز و اقارب کی پرواہ کی، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا معاملہ تھا اور راوی کی خامی کا اظہار کرنا دینی ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ محدثین کا گروہ پیدا ہی اسی مقصد کے لئے کیا تھا کہ ان کے ذریعہ احادیث کی حفاظت کا کام کرایا جائے۔ اس لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ جہاں دین کی ضرورت ہو، وہاں نہ صرف یہ کہ غیبت کرنا جائز ہے بلکہ بعض اوقات غیبت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

نفسانیت کی غیبت حرام ہے

"لیکن اگر دینی ضرورت نہیں بلکہ محض نفسانیت ہی نفسانیت ہے تو اس صورت میں امر محقق کا بیان کرنا بھی غیبت محرمہ ہے"

(۱) ميزان الاعتدال (۲/۴۰۱)، لسان الميزان (۸/۴۳۰)، كتابات أعداء الإسلام ومناقشتها (۱/۵۰۳)

(۲) ميزان الاعتدال (۲/۴۳۳)، لسان الميزان (۴/۳۱)، كتابات أعداء الإسلام ومناقشتها (۱/۵۰۴)

اب یہ فرق کرنا ہے کہ جو بات میں کہہ رہا ہوں، یہ واقعی دینی ضرورت سے کہہ رہا ہوں یا اپنے نفس کی لذت لینے کے لئے نفسانیت کے طور پر کہہ رہا ہوں، جائزہ لینے پر پتہ چلے گا کہ غیبت کے شوق میں اب نفس نے یہ حیلہ تراش لیا کہ جو بات تم کہہ رہے ہو یہ دینی ضرورت کے تحت کہہ رہے ہو۔ لیکن جب اپنے باطن کے اندر کرید کر دیکھو گے تو پتہ چلے گا کہ حقیقت میں دینی ضرورت نہیں تھی بلکہ نفسانیت تھی، لہٰذا وہ غیبت محرمہ ہے، چاہے وہ ایسی بات ہو جو حقیقت میں صحیح اور درست ہو اور تحقیق سے ثابت ہو چکی ہو، تب بھی وہ حرام اور ناجائز ہے۔

بلا تحقیق بات کہنا بہتان ہے

''اور بلا تحقیق کوئی بات کہی جائے تو بہتان ہے۔ کذب کا مدار تحقیرِ کذب پر نہیں بلکہ عدمِ تحقیقِ صدق پر ہے''

یعنی جھوٹ کا مدار صرف اس بات پر نہیں کہ جب کسی چیز کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے تب جھوٹ ہوگا، بلکہ اگر کسی چیز کا سچا ہونا ثابت نہیں ہوا پھر بھی تم اس کو بیان کر رہے ہو تو تمہارے حق میں وہ کذب ہے، کیونکہ حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے صاف صاف ارشاد فرمادیا:

((كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ))(۱)

''انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ ہر سنی سنائی بات کو آگے بیان کردے''

لہٰذا جب ہم دوسرے کی غیبت کرتے ہیں تو شیطان آکر یہ سبق پڑھاتا ہے کہ تم جو برائی بیان کر رہے ہو، یہ کوئی گناہ کا کام نہیں ہے کیونکہ یہ دینی ضرورت ہے، حالانکہ حقیقت میں وہاں کوئی دینی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اپنی نفسانیت ہوتی ہے۔ دونوں میں فرق کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ایک محقق اور شیخ ہی اس کا فرق بتاتا ہے کہ یہ جو کام کیا ہے یہ دینی ضرورت سے کیا ہے یا نفسانیت کی وجہ سے کیا ہے۔ شیطان دینی ضرورت کو آڑ بنا کر غیبت میں مبتلا کرادیتا ہے۔ یہ غیبت کھلی ہوئی غیبت سے زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتا ہے کہ یا اللہ! میں جو غیبت کر رہا ہوں، تیرے دین کی ضرورت سے کر رہا ہوں، لہٰذا اس میں غیبت کے گناہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کا گناہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل وکرم سے غیبت کے گناہ سے ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

---

(۱) صحیح مسلم، المقدمة، باب النهي عن الحديث بكل ما سمع، رقم: ٦، سنن ابن داود، كتاب الأدب، باب التشديد في الكذب، رقم: ٤٣٤٠

غیبت سے حسی تکلیف ہوتی ہے

حضرت والا نے فرمایا:

''غیبت میں نہ معلوم لوگوں کو کیا مزا آتا ہے، تھوڑی دیر کے لئے اپنا جی خوش کر لیتے ہیں، پھر اگر اس کو خبر ہوگئی اور اس سے دشمنی پڑگئی تو عمر بھر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے، اور اگر ذرا دل میں حس ہو تو غیبت کرنے کے ساتھ ہی قلب میں ایسی ظلمت پیدا ہوتی ہے جس سے سخت تکلیف ہوتی ہے جیسے کسی نے گلا گھونٹ دیا ہو''(۱)

چونکہ ہم لوگوں کے مزاج خراب ہو گئے ہیں اور حس جاتی رہی ہے، اس لئے ہم گناہ کرتے رہتے ہیں لیکن ہمیں گناہوں کی ظلمت کا احساس نہیں ہوتا، جن لوگوں کے قلوب کو اللہ تعالیٰ مجلّٰی اور مصفّٰی فرماتے ہیں ان کے قلب پر معمولی سے گناہ کی بھی ایسی ظلمت ہوتی ہے جیسے کسی نے ان پر پہاڑ رکھ دیا ہو۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود
گر ز باغِ دل خلالے کم بود

''اگر دل کے باغ سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے تو سالک کے دل پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں''

مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ ایک مرتبہ آپ بہت غمگین بیٹھے ہوئے تھے، اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے غم کا پہاڑ ٹوٹ گیا ہو۔ ایک شاگرد نے حضرت سے جا کر پوچھا کہ حضرت! آپ کے چہرے پر غم کے آثار نظر آرہے ہیں، خیریت تو ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں کچھ غم ہے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ حضرت! کیا غم ہے؟ اس وقت دار العلوم دیوبند میں دستار بندی کا جلسہ ہو رہا تھا۔ فرمایا کہ جلسہ میں کچھ ایسی مصروفیت ہوگئی کہ آج جب ہم مسجد میں نماز پڑھنے گئے تو ہماری تکبیرِ اولیٰ چھوٹ گئی، امام سے نہیں سن سکے۔ پھر فرمایا کہ ۳۵ سال میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ نماز میں تکبیرِ اولیٰ چھوٹ گئی۔ اب آپ اندازہ لگائیں، کیونکہ صرف تکبیرِ اولیٰ چھوٹ جانے کا مطلب یہ ہے کہ قراءت سنی، رکوع میں شریک ہوئے، رکعت مل گئی، اور صحیح قول کے مطابق تکبیرِ اولیٰ میں بھی شرکت ہوگئی، لیکن اس کے باوجود

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ۱۵۲

تکبیرِ اولیٰ کے چھوٹنے پر اتنے غمگین تھے۔

ہماری بے حسی کا حال

دوسری طرف ہمارا یہ حال ہے کہ ہماری جماعتیں نکل جاتی ہیں، اور اکثر نمازی حضرات مسبوق ہو کر اپنی نمازیں پوری کرتے ہیں، لیکن اس کا احساس نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے اندر بے حسی ہے۔ العیاذ باللہ! اللہ تعالیٰ اپنی رحمت فرما کر اسے دور فرما دے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک مشکوک لقمہ پیٹ میں چلا گیا، اس لقمہ کے حلال اور حرام ہونے میں شک تھا، فرمایا کہ ایک مہینے تک اس لقمہ کی ظلمت اپنے دل کے اندر محسوس کرتا رہا۔ ہماری تو حس خراب ہے، مزاج بگڑا ہوا ہے، اس لئے گناہ کی برائی کا احساس ہی نہیں ہوتا، بس ایسا سمجھتے ہیں جیسے ایک مکھی آ کر بیٹھی اور اس کو اُڑا دیا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہماری حس کو درست فرمائے اور مزاج درست فرمائے۔ آمین۔

غیبت سے کیا حاصل ہوا؟

بہر حال، غیبت کو چھوڑنے کے لئے یہ سوچنا چاہئے کہ اگر تم نے تھوڑا بہت وقت غیبت کے اندر خرچ کر بھی لیا اور غیبت سے تھوڑا مزہ بھی آ گیا، لیکن اس غیبت کا حاصل کیا ہوا؟ نتیجہ کیا ہوا؟ کیا فائدہ حاصل ہوا؟ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں، بلکہ اس کے نتیجے میں آخرت کا اتنا بڑا گناہ کما لیا۔ اور دنیا کے اندر یہ صورتِ حال ہے کہ اگر اس شخص کو خبر ہو گئی جس کی تم نے غیبت کی ہے کہ فلاں نے میری یہ غیبت کی ہے تو اس کی طبیعت میں تمہاری طرف سے جو کدورت اور عداوت پیدا ہوگی وہ نہ جانے کیا خمیازہ لے کر آئے گی۔

غیبت کے نتیجے میں کئی گناہ ہو جاتے ہیں

اور حقوق العباد کے گناہوں کا قاعدہ یہ ہے کہ جب آدمی ایک گناہ کرتا ہے تو اس کی بیچ میں اس کو دس غلط کام کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً جس کی غیبت کی تھی اس کو پتہ چل گیا، اس نے آ کر اس سے پوچھ لیا کہ تم نے یہ غلط بات کہی تھی؟ اب یا تو اعتراف کرے کہ ہاں! میں نے یہ بات کہی تھی، اب اگر اعتراف کرے تو مجرم بنے، یا اعتراف نہ کرے تو پھر یا تو تاویل کرے گا کہ میں نے تو یوں کہا تھا، یا

جھوٹ بولے گا کہ میں نے تو یہ بات نہیں کہی۔ اب اگر اس دوسرے شخص کو پتہ چل گیا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے تو اس کے دل میں اس کی طرف سے اور زیادہ کدورت اور دشمنی پیدا ہوگی۔ لہٰذا انسان ایسا کام کیوں کرے جس کے نتیجے میں دشمنیاں پیدا ہوں، بغض اور عداوت پیدا ہو، ایسے کام کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ قلب میں ظلمت پیدا ہونے کا نقصان علیحدہ ہے۔

غیبت کا اصل علاج تواضع ہے

حضرت والا نے فرمایا:

''غیبت کا علاج بھی تواضع ہی ہے، مگر تواضع ایک دن میں پیدا نہیں ہوتی، اس لئے جب تک تواضع حاصل نہ ہو، غیبت سے بچنے کے لئے فوری علاج یہ کرو کہ بدون سوچے کوئی بات نہ کیا کرو، جو بات کرو سوچ کر کرو، اس سے غیبت کم ہو جائے گی، اور کچھ دنوں کے بعد بالکل نہ ہوگی، اور اگر کسی وقت بے سوچے کوئی بات نکل جائے تو اسی وقت دو رکعت نفل ''صلوٰۃ التوبہ'' کی نیت سے پڑھ لیا کرو''(۱)

اس ملفوظ میں پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ غیبت انسان سے سرزد ہی نہ ہو، اس کا اصل علاج یہ ہے کہ دل میں تواضع پیدا کرو۔ ہمیشہ یاد رکھو! غیبت تواضع کے فقدان کی وجہ سے ہوتی ہے، جب آدمی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور تکبر میں مبتلا ہوتا ہے، تب دوسرے کی غیبت کرتا ہے۔ جس شخص کو اپنے عیوب کا دھیان ہو، اس کی اصلاح کی فکر ہو، اس کو دوسروں کے عیوب بیان کرنے کی کہاں فرصت، وہ تو اپنے درد میں مبتلا ہے کہ میرے اندر یہ عیب ہے، میرے اندر یہ خرابی ہے، کس طرح ان کو دور کروں، بس اسی اُدھیڑ بُن میں مبتلا ہے، وہ دوسروں کے عیوب کو کہاں دیکھتا پھرے گا۔ ہاں! اگر دل میں تکبر اور بڑائی ہے اور دوسروں کی تحقیر ہے، اس کو اپنی فکر تو نہیں ہے، اس لئے وہ دوسروں کے عیوب کو دیکھتا پھرتا ہے کہ اس میں فلاں برائی ہے، اس میں فلاں برائی ہے، پھر ان برائیوں کو دوسروں کے سامنے بیان کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا غیبت کی اصل جڑ عجب اور تکبر ہے، جب یہ تکبر اور عجب ختم ہو جائے گا تو پھر غیبت کبھی سرزد ہی نہیں ہوگی۔ اس لئے غیبت کا اصل علاج تکبر کا ختم کرنا اور تواضع کا پیدا کرنا ہے۔

ہمارے بزرگوں کی تواضع

حضرت ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ دارالعلوم میں تشریف لائے۔ ان کی زبانی ایک واقعہ سنا کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جامعہ خیر المدارس ملتان کے بانی) نے فرمایا کہ

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۲

جب میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں جاتا تو بلا مبالغہ مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس مجلس کے اندر جتنے لوگ موجود ہیں، ان میں سب سے کمتر اور حقیر اور بدحال میں ہوں، اور یہ سب مجھ سے افضل ہیں، بلکہ یہ سب انسان ہیں اور میں بیل ہوں۔ پھر مجھے خیال پیدا ہوا کہ میری یہ حالت درست ہے یا نہیں؟ چنانچہ میں حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جامعہ اشرفیہ لاہور کے بانی) کی خدمت میں حاضر ہوا، اور جا کر عرض کیا کہ میرا یہ معاملہ ہے کہ جب میں حضرت والا کی مجلس میں آتا ہوں کہ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس مجلس میں سب سے کمتر اور حقیر میں ہوں، مجھ سے زیادہ حقیر اور کمتر کوئی اور نہیں ہے۔ حضرت مفتی صاحب فرمانے لگے کہ یہ حالت تو میری بھی ہے کہ جب میں مجلس میں جاتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ سب حاضرین سے زیادہ کمتر اور بدحال میں ہی ہوں تو حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم بھی میرے ساتھ اس حال میں شریک ہو گئے، چلیں حضرت والا سے اپنی یہ حالت بیان کرتے ہیں۔

چنانچہ یہ دونوں حضرات حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ جب ہم مجلس میں بیٹھتے ہیں تو ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ اس مجلس کے اندر جتنے حاضرین ہیں وہ سب ہم سے افضل ہیں اور ہم سب سے کمتر اور ذلیل ہیں اور حقیر ہیں۔ حضرت والا نے فرمایا کہ کچھ فکر نہ کرو، ارے بھائی! میرا بھی یہی حال ہے، جب میں مجلس میں بیٹھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ میں ان سب کے مقابلے میں کمتر ہوں، سب مجھ سے افضل ہیں۔

غیبت کو ختم کرنے والی چیز تواضع

تواضع یہ نہیں ہے کہ آدمی صرف اپنی زبان سے یہ کہہ دے کہ احقر ناکارہ ہے، ناچیز ہے، بلکہ تواضع یہ ہے کہ واقعۃً اپنے عیوب پر اتنی نگاہ ہو کہ اپنے عیوب کے مقابلے میں دوسروں کے عیوب نظر ہی نہ آئیں۔ جس دن یہ تواضع پیدا ہو گئی تو پھر ان شاء اللہ غیبت پاس بھی نہیں پھٹکے گی۔ اس لئے کہ جب انسان اپنے کو دوسروں سے کمتر سمجھ رہا ہے اور اس کو اپنے عیوب کا استحضار ہے تو وہ دوسروں کے عیوب کو کیسے دیکھے گا؟ لہٰذا اگر "غیبت" کا جڑ سے بالکلیہ خاتمہ کرنا ہے تو اپنے اندر تواضع پیدا کرو۔

اپنے عیوب کا استحضار کریں

اب تواضع کیسے پیدا کریں؟ تواضع پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے عیوب کا استحضار کرو۔ یہ جو ہر وقت اپنی بڑائی کا خیال دل میں جما رہتا ہے کہ "ہم چوں ما دیگرے نیست" (ہم جیسا کوئی دوسرا نہیں) اور یہ جو ہمیں کبھی اپنے علم پر گھمنڈ، کبھی اپنے تقویٰ پر گھمنڈ، کبھی اپنے مال و دولت پر گھمنڈ، کبھی

اپنی صحت پر گھمنڈ، کبھی اپنی شکل وصورت پر گھمنڈ رہتا ہے، یہ گھمنڈ ہی انسان کو تباہ کر دیتا ہے۔

انسان کی حقیقت یہ ہے

ایک بزرگ سے ایک نوجوان نے کہا کہ جانتے نہیں، میں کون ہوں؟ ان بزرگ نے فرمایا: ہاں! میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو، کہو تو بتا دوں؟ چنانچہ ان بزرگ نے فرمایا:

"أَوَّلُكَ نُطْفَةٌ قَذِرَةٌ وَآخِرُكَ جِيْفَةٌ قَذِرَةٌ وَأَنْتَ فِيْمَا بَيْنَ ذٰلِكَ تَحْمِلُ الْعَذِرَةَ"

''تیرا آغاز تو یہ ہے کہ تو ایک گندے نطفے سے پیدا ہوا ہے، اور تیرا انجام یہ ہے کہ تو بدبودار مردار بن جائے گا حتیٰ کہ تیرے گھر والے بھی تجھے رکھنے کو تیار نہیں ہوں گے۔ اور ولادت سے وفات تک جو درمیان کا عرصہ ہے، اس میں تو گندگی کے ٹوکرے اُٹھائے پھر رہا ہے''

جو کھال جسم پر ہے، اس کھال کو اللہ تعالیٰ نے "ساترُ العیوب" بنا رکھا ہے، اگر یہ کھال ذرا سی چھل جائے تو اندر نجاست ہی نجاست بھری ہوئی ہے، کہیں خون ہے، کہیں پیپ ہے، کہیں پیشاب ہے، کہیں پاخانہ ہے، یہ سب نجاستیں اُٹھائے پھر رہا ہے، یہ حقیقت ہے ہماری، مگر خود کو بڑا سمجھ رہا ہے، اور تکبر کے یہ خیالات پھر انسان کو غیبت پر آمادہ کرتے ہیں۔

لہٰذا ''غیبت'' کا اصل علاج یہ ہے کہ اپنے اندر تواضع پیدا کرے، جب تواضع پیدا ہو جائے گی تو پھر انشاء اللہ کسی کی غیبت نہیں ہوگی۔ البتہ جہاں دینی ضرورت ہو وہاں ''غیبت'' جائز ہے، مثلاً کسی کو نقصان سے بچانا ہے، آپ اس کو بتا دیں کہ فلاں شخص سے ہوشیار رہنا، یہ معاملات کا صاف نہیں ہے، تو یہ غیبت میں داخل ہی نہیں۔

تواضع کے لئے صحبتِ شیخ

تجربہ یہ ہے کہ رگڑے کھائے بغیر ''تواضع'' پیدا نہیں ہوتی۔ دراصل بات یہ ہے کہ انسان کے دماغ میں خناس ہوتا ہے، اور وہ خناس یہ ہے کہ انسان اپنی رائے کو بالا سمجھتا ہے، اپنی سوچ کو بالکل صحیح سمجھتا ہے کہ جو میں سوچ رہا ہوں یہ صحیح ہے اور دوسرا جو سوچ رہا ہے وہ غلط ہے۔ جب انسان اپنی اس سوچ اور فکر کو کہیں جا کر اس طرح فنا نہیں کرے گا کہ جو میں سوچتا ہوں وہ غلط ہے اور جو آپ کہتے ہیں وہ صحیح ہے، چاہے مجھے آپ کی سوچ کتنی ہی غلط اور بری معلوم ہو رہی ہو اور دلیل کے خلاف معلوم ہو رہی ہو، بداہت کے خلاف معلوم ہو رہی ہو، لیکن میں آپ ہی کی بات مانوں گا۔ جب تک اس طرح اپنی سوچ وفکر کو نہیں مٹائے گا، اس وقت تک تواضع پیدا نہیں ہوگی اور تکبر ختم نہیں ہوگا۔

حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی نصیحت

اللہ تعالیٰ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائے۔ جب میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بہت مفصل خط مجھے اور بھائی صاحب حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم کو لکھا، اس خط میں بہت ساری نصیحتیں فرمائیں، لیکن ایک نصیحت یہ فرمائی:

''میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ یہ صاحبزادگی کا سور بہت دیر سے نکلتا ہے''

یعنی کسی بڑے آدمی کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دماغ میں ایک خناس پیدا ہو جاتا ہے، اس کو ''سور'' سے تعبیر فرمایا، اس خناس کا مطلب ''تکبر'' ہے اور یہ ''سور'' بہت دیر میں نکلتا ہے، یعنی دوسرے امراض کا علاج تو جلدی ہو جاتا ہے لیکن اس کا علاج بہت دیر سے ہوتا ہے۔ بہر حال، اس خط کے ذریعہ اس طرف ہمیں متوجہ فرمایا کہ اس کی فکر کرنی چاہئے کہ کسی طرح یہ مرض نکل جائے۔ اور پھر فرمایا:

''جب کوئی شخص اپنے آپ کو کسی کے سامنے فنا کردے اور رگڑے کھائے، جب یہ نکلے، جب تک یہ نہ نکلے اس وقت تک راستہ نہیں کھلتا''

علم کا ''سور'' دیر سے نکلتا ہے

اسی طرح ''علم کا سور'' ہے کہ ہم عالم ہیں، یہ عالم ہونے کا جو گھمنڈ ہے، یہ بھی بڑا خطرناک ہے اور یہ بھی دیر سے نکلتا ہے۔ جب تک اپنے آپ کو دوسرے کے سامنے فنا نہ کردے، اس وقت تک یہ نہیں نکلتا۔ اور اگر یہ دونوں جمع ہو جائیں کہ علم بھی ہو اور صاحبزادگی بھی ہو، پھر تو سور در سور جمع ہو گئے اس کا علاج آسان نہیں ہے، اس کا علاج صرف یہی ہے کہ کہیں رگڑے کھائے، اپنے آپ کو پامال کرے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

قال را بگزار صاحبِ حال شو
پیش مردے کاملے پامال شو

''پامال'' کے معنی یہ ہیں کہ تمہیں پاؤں سے روندا جائے۔ پاؤں سے روندے جانے کا مطلب یہ ہے کہ چاہے تمہارے دل و دماغ میں بات نہیں آرہی ہے، عقل اور بداہت کے خلاف وہ بات معلوم ہو رہی ہے، لیکن پھر بھی بڑے کی بات کے سامنے تم اپنے آپ کو اس طرح جھکا دو جیسے پاؤں میں روندا جا رہا ہے۔ جب تک اس پر عمل نہیں ہو گا، اس وقت تک یہ سور دماغ سے نہیں نکلے گا۔ لہٰذا جب تک تکبر دل میں موجود رہے گا، ''حسد'' بھی رہے گا، غیبت بھی رہے گی، بغض بھی رہے گا،

غصہ بھی رہے گا، اور جب تکبر چلا جائے گا اور تواضع پیدا ہو جائے گی، اس وقت یہ سارے امراض بھی چلے جائیں گے۔

غیبت ہونے پر جرمانہ

لیکن یہ تواضع اور انکساری ایک دو دن میں پیدا نہیں ہوگی، اس کے لئے محنت اور مشق کی ضرورت ہے، اور کسی شیخ کامل کی صحبت کی ضرورت ہے، تب جا کر تواضع پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب تک یہ بات حاصل نہ ہو یعنی تواضع نہ ہو اس وقت تک یہ کرے کہ بے سوچے بات نہ کرے، اور اگر کبھی غیبت ہو جائے تو اپنے اوپر جرمانہ مقرر کرے۔ ایک جرمانہ کا بیان پیچھے گزر چکا کہ ایک وقت کا فاقہ کرے، یہاں ایک دوسرا جرمانہ بیان فرمایا کہ دو رکعت صلوٰۃ التوبہ پڑھ لیا کرو۔ اس طرح کرنے سے رفتہ رفتہ انشاء اللہ یہ بیماری دور ہو جائے گی۔

صرف آرزو کرنا کافی نہیں

دیکھئے! دنیا میں کوئی کام محنت کے بغیر نہیں ہوتا، تھوڑی بہت محنت ضرور کرنی پڑتی ہے، محض آرزو کر لینے سے اور خواہش کر لینے سے کام نہیں بنتا ؎

آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

یعنی صرف آرزو کر لینے سے تقدیر نہیں بدلا کرتی بلکہ اس کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔

ایک دیہاتی کا قصہ

جیسے ایک دیہاتی کا قصہ حضرت والا نے لکھا ہے کہ ایک دیہاتی بیٹھا ہوا اپنی دیہاتی زبان میں یہ کہہ رہا تھا کہ یوں جی کرے ڈھیر سارا دودھ ہو، اور ڈھیر سارا گڑ ہو اور میں ڈھیر سارے دودھ میں ڈھیر سارا گڑ ڈال کر انگڑ (انگلی) سے اس کو چلاؤں اور پھر خوب پیوں، یوں جی کرے۔ کسی نے اس دیہاتی سے کہا کہ تیرا یوں جی تو کرے، لیکن تیرے پاس کچھ ہے بھی؟ اس نے کہا: میرے پاس اُنگڑ (انگلی) ہے۔ یعنی نہ دودھ ہے اور نہ گڑ ہے، بس اُنگڑ ہے۔ اب وہ اس انگڑ کے بل بوتے پر آرزو کر رہا تھا۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ "جیسے وہ بیوقوف اُنگڑ کی بنیاد پر یہ آرزو باندھ رہا تھا، حالانکہ صرف آرزو باندھنے سے کچھ نہیں ہوتا، ایسے ہی ہم بھی اصلاح کی محض آرزوئیں باندھا کرتے ہیں۔ ارے یہ دیکھو! تمہارے پاس کچھ عمل ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو اس کے حصول کے لئے کوشش اور محنت کرو تب جا کر وہ حاصل ہوگا۔

یہ عاجز بندہ ہے

لہٰذا کوئی کام محض آرزو کر لینے سے نہیں ہوتا کہ کاش میں ایسا ہو جاؤں، کاش میں نیک ہو جاؤں، کاش میں متقی بن جاؤں، کاش میں غیبت چھوڑ دوں، محض تمنائیں کرنے سے اور آرزوئیں کرنے سے بات نہیں بنتی۔ حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ))(۱)

عاجز وہ شخص ہے جس نے اپنے آپ کو خواہشاتِ نفسانی کے پیچھے چھوڑ رکھا ہو۔ خواہشات جس طرف لے جارہی ہیں وہ جارہا ہے، کوئی روک اور لگام نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ پر تمنائیں باندھ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے، معاف کر دے گا، ایسا بندہ عاجز ہے۔ لہٰذا محض تمنا اور آرزو کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ تمنا کے ساتھ ساتھ قدم آگے بڑھائے، تھوڑی سی محنت کرے، عمل کرے، اور پھر اللہ تعالیٰ سے کہے کہ یا اللہ! میرے بس میں جتنا تھا، اتنا میں نے کرلیا، اب اس کی تکمیل کرنا آپ کے قبضہ وقدرت میں ہے، آپ اس کی تکمیل فرما دیجئے۔

ذرا چلو تو سہی

کیا اللہ تعالیٰ ہمیں مشقت میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتے ہیں کہ میرا یہ بندہ ذرا سا میری طرف چلے، جب وہ چلے گا تو ہم خود اس کی رہنمائی کریں گے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾(۲)

جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کریں گے ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے چلیں گے۔ ذرا سی توجہ کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ اُٹھالیں گے

حضرت والا اس کی ایک مثال دیتے ہیں کہ جیسے ایک بچہ چلنا سیکھتا ہے، اور باپ یہ چاہتا ہے

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول اللّٰه، باب منه، رقم: ۲۳۸۳، سنن ابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر الموت والاستعداد له، رقم: ۴۲۵۰، مسند أحمد، رقم: ۱۶۵۰۱

(۲) العنکبوت: ۶۹

کہ میرا بیٹا چلنا سیکھ لے، تو اب باپ ذرا دور کھڑے ہو کر بچے کو بلاتا ہے کہ بیٹا میرے پاس آؤ، جب وہ بیٹا ذرا سا قدم بڑھاتا ہے اور گرنے لگتا ہے تو باپ جلدی سے اس کو گود میں اُٹھا لیتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف چلے گا اور قدم بڑھائے گا اور پھر وہ گرنے لگے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو گرنے نہیں دیں گے بلکہ آگے بڑھ کر اس کو تھام لیں گے۔ جب ایک باپ اور ماں اپنی اولاد کے ساتھ یہ معاملہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ جو رحمٰن الرحیم ہے، اور جو ماں اور باپ کا خالق ہے، جس نے ماں اور باپ کے دل میں شفقت اور محبت ڈالی ہے، کیا وہ اپنے بندوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دے گا؟ بس اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میرا بندہ میرے راستے پر چلا ہے، اس نے تھوڑی سی محنت کی ہے، پھر اللہ تعالیٰ خود ہی منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔

غیبت کا ایک عجیب عملی علاج

پھر حضرت والا نے آگے ایک عجیب عملی علاج بیان فرمایا۔ یہ علاج کڑوا تو ہے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ اس علاج کی توفیق دیدے تو چند دن میں غیبت چھوٹ جائے، فرمایا:

> ”غیبت کا ایک عجیب وغریب عملی علاج یہ ہے کہ جس کی غیبت کرے، اس کو اپنی اس حرکت کی اطلاع کر دیا کرے، تھوڑے دن اس پر مداومت سے انشاء اللہ یہ مرض بالکل دفع ہو جائے گا“(۱)

جب کسی شخص کی غیبت ہو جائے، جا کر اس کو بتا دو کہ آج میں نے تمہاری یہ غیبت کی ہے، جس وقت جا کر یہ بتائے گا اس وقت دل پر آرے چل جائیں گے، لیکن یہ ”آرا“ ہی اس بیماری کا آپریشن کرے گا، اگر چند مرتبہ یہ عمل کر لیا تو انشاء اللہ یہ بیماری جڑ سے نکل جائے گی، اور دوسری بات یہ ہے کہ جب آدمی دوسرے سے جا کر کہے گا کہ میں نے تمہاری غیبت کی تھی، اس دوسرے آدمی کے دل میں بھی نرمی پیدا ہوگی کہ یہ شخص چونکہ ندامت اور پشیمانی کے ساتھ میرے پاس آیا ہے، چلو اس کو معاف کر دو، چنانچہ غیبت کے نتیجے میں جو عداوت اور دشمنی اور اشتعال پیدا ہوتا ہے، وہ اشتعال پیدا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۵۳

کثرتِ کلام اور اس کا علاج ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

حضرات صوفیاء کرام اور بزرگانِ دین کے پاس جب کوئی شخص اپنی اصلاح کرانے جاتا تھا تو حضرات صوفیاء کرام اس شخص سے چار قسم کے مجاہدات، ریاضتیں اور مشقیں کرایا کرتے تھے۔ نمبر ایک "تقلیلِ طعام" یعنی کھانا کم کھانا۔ نمبر دو "تقلیلِ کلام" یعنی بات چیت کم کرنا۔ نمبر تین "تقلیلِ منام" یعنی کم سونا۔ نمبر چار "تقلیل الاختلاط مع الانام" یعنی لوگوں سے کم ملنا جلنا۔

یہ چار قسم کے مجاہدات کرانے کے نتیجے میں اس شخص کی طبیعت اعتدال پر آجاتی تھی اور اعتدال پر آجانے کے بعد یہ عادتیں قابو میں آجاتی تھیں۔ چنانچہ پھر وہ شخص کھانا حد سے زیادہ نہیں کھاتا تھا اور حد سے زیادہ بولتا نہیں تھا اور حد سے زیادہ سوتا نہیں تھا اور لوگوں سے ملنا جلنا بھی حد سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔

حلال چیزوں کو کیوں چھڑوایا جاتا ہے؟

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان مجاہدات کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ ہماری نفسانی خواہشات اعتدال سے ہٹی ہوئی ہیں اور گناہوں کی طرف مائل ہیں، لہٰذا ان خواہشات کو اعتدال پر لانے کے لئے اور سیدھا کرنے کے لئے بعض اوقات کچھ جائز چیزوں کو بھی ترک کرنا پڑتا ہے۔ ایک شخص نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایک چیز جائز اور حلال قرار دی ہے تو پھر صوفیاء کرام ان جائز اور حلال چیزوں کو کیوں چھڑواتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ نے ان کو حلال کیا ہے تو کون ان کو حرام کرسکتا ہے؟ جواب میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دراصل یہ علاج ہے۔ جب تم ڈاکٹر اور حکیم کے پاس جاتے ہو تو وہ ڈاکٹر تم سے کہتا ہے کہ تمہیں شوگر کی بیماری ہے، مٹھائی مت کھانا۔ اب دیکھئے کہ مٹھائی حلال ہے لیکن ڈاکٹر نے اس کو کھانے سے روک دیا۔ کیوں روک دیا؟ تمہاری بیماری کی وجہ سے روک دیا، کیونکہ اگر تم مٹھائی کھاؤ گے تو تمہاری

☆ اصلاحی مجالس (۵/ ۴۸ تا ۷۲)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دارالعلوم، کراچی

شوگر بڑھ جائے گی اور اس کے نتیجے میں تمہاری بیماری میں اضافہ ہوگا۔ لہٰذا ڈاکٹر یا حکیم مٹھائی کھانے سے جو منع کر رہا ہے وہ حلال کو حرام نہیں کر رہا ہے بلکہ تمہاری ضرورت کی وجہ سے اس کے کھانے سے منع کر رہا ہے۔

طبیعت کو اعتدال پر لانا مقصود ہے

اسی طرح جب کوئی شیخ اپنے کسی مرید سے یہ کہتا ہے کہ باتیں کم کرو، کھانا کم کھاؤ، کم سو، لوگوں سے ملنا جلنا کم کرو، تو اس کا مقصد کسی حلال کو حرام کرنا نہیں ہے بلکہ تمہارا علاج کرنا ہے اور تمہیں پرہیز کرانا ہے، تاکہ اس پرہیز کے نتیجے میں تمہاری طبیعت اعتدال پر آجائے۔ لہٰذا صوفیاء کرام جو مجاہدات کراتے ہیں، ان پر اس قسم کے اعتراضات نہیں کرنے چاہئیں۔

ایک خوبصورت مثال

پھر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا کہ اس کی مثال یوں ہے کہ جیسے یہ کاغذ ہے، اس کاغذ کو پہلے ایک طرف موڑو، اب اس کو سیدھا کرو، تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے ہو لیکن یہ سیدھا نہیں ہوتا، اس کو سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کاغذ کو مخالف سمت میں موڑ دو، جب مخالف سمت میں موڑ دو گے تو یہ سیدھا ہو جائے گا۔

ہمارا نفس گناہوں کی طرف مڑا ہوا ہے

اسی طرح ہمارا نفس بھی گناہوں کی طرف اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کی طرف مڑا ہوا ہے، جس کے نتیجے میں گناہوں کے خیالات آتے ہیں، گناہوں کی خواہشات دل میں پیدا ہوتی ہیں اور گناہوں کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس نفس کا علاج یہ ہے کہ اس کو مخالف سمت میں موڑا جائے اور اس سے کچھ جائز کام بھی چھڑوائے جائیں، جب اس نفس سے جائز کام چھڑاؤ گے تو یہ اعتدال پر آجائے گا۔ لہٰذا جب کوئی شخص حضرات صوفیاء کرام کے پاس جاتا تھا تو وہ اس سے یہ فرماتے تھے کہ تم کھانا کم کھایا کرو، باتیں کم کیا کرو، لوگوں سے کم ملا کرو، کم سویا کرو، یہ چار مجاہدات کرو۔

کم کھانے اور کم سونے کی حقیقت

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو اس طریق کے مجدد اور مجتہد ہیں، انہوں نے آج کل کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے فرمایا کہ کم کھانے کی فکر میں مت پڑو بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو وسعت دی ہے

اس کے اعتبار سے کھاؤ، لہٰذا میں تمہیں ''کم کھانے'' کا مجاہدہ نہیں کراتا۔ اسی طرح ''کم سونے'' کا مجاہدہ بھی نہیں کراتا، اس لئے کہ آج کل کے جسمانی قویٰ ایسے ہیں کہ اگر کھانا کم کھاؤ گے اور کم سو گے تو بیمار پڑ جاؤ گے اور جب بیمار پڑ جاؤ گے تو جو تھوڑی بہت عبادت پہلے کر سکتے تھے وہ بھی نہیں کر سکو گے۔ اس لئے میں نہ تو تقلیلِ طعام کراتا ہوں اور نہ ہی تقلیلِ منام کراتا ہوں۔

کم کھانے کی حد

البتہ ''تقلیلِ طعام'' اور ''تقلیلِ منام'' کا ایک نسخہ بتاتا ہوں، تم اس پر عمل کرلو، تقلیلِ طعام کا نسخہ یہ ہے کہ کھانا کھانے کے دوران ہر انسان کو یہ تردد پیدا ہوتا ہے کہ مزید کھاؤں یا نہ کھاؤں، جس وقت یہ تردد پیدا ہو اس وقت کھانا چھوڑ دو، اس سے آگے نہ بڑھو، اگر اس پر عمل کرلیا تو انشاء اللہ تعالیٰ تقلیلِ طعام کی برکات حاصل ہو جائیں گی اور ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق کبھی بیمار نہ ہو گے۔

کم سونے کی حد

اسی طرح کم سونے کے بارے میں آج کے لوگ اگر اس طرح کا مجاہدہ شروع کر دیں جس طرح کا مجاہدہ پہلے کے لوگ کیا کرتے تھے کہ چوبیس گھنٹے میں صرف ایک گھنٹے کے لئے سو گئے، اس طرح مجاہدہ کے نتیجے میں آدمی بیمار اور پاگل ہو جائے گا اور دماغ خراب ہو جائے گا۔ جو تھوڑا بہت پہلے کر لیتا تھا وہ بھی چھوڑ بیٹھے گا۔

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آج کل کے دور میں اس پر عمل نہیں کرنا چاہئے بلکہ یہ کرو کہ اپنی صحت کے اعتبار سے سونے کے لئے گھنٹے مقرر کرلو کہ مجھے چوبیس گھنٹے میں اتنے گھنٹے سونا چاہئے، مثلاً چھ گھنٹے یا سات گھنٹے اور زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹے، سونے کے گھنٹے مقرر کرنے کے بعد پھر اس سے زیادہ سونے سے پرہیز کرو۔ بس یہی ''تقلیلِ منام'' ہے، ان دو مجاہدات کے بارے میں تو حضرت نے یہ تفصیل بیان فرمادی ہے۔

اس طریق کا پہلا قدم ''زبان پر قابو پانا ہے''

دو مجاہدات اور ہیں۔ ایک ہے ''تقلیلِ کلام'' یعنی کم بولنا، اس پر عمل کرنا بہت ضروری ہے، جب تک انسان اس پر قابو نہیں پائے گا، اس وقت تک وہ اس طریق میں نہیں چل سکے گا۔ جب تک یہ زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے اور اس پر کوئی رکاوٹ نہیں ہے، کوئی پابندی نہیں ہے، کوئی کنٹرول نہیں ہے، اس وقت تک اس طریق پر نہیں چل سکتا۔ اس طریق کا پہلا قدم یہ ہے کہ زبان کو قابو میں کرو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو گوشت کا یہ لوتھڑا عطا فرمایا ہے، یہ اتنی عظیم نعمت ہے کہ پیدائش کے وقت سے جسم میں لگی ہوئی ہے اور مرتے دم تک یہ مشین کام کر رہی ہے، اس مشین کو نہ تیل دینا پڑتا ہے، نہ اس کی سروس کرنی پڑتی ہے، نہ اس کی اوور ہالنگ کرانی پڑتی ہے، نہ اس کے پارٹس تبدیل کرنے پڑتے ہیں، اور جس دن سے یہ مشین لگی ہوئی ہے مسلسل اپنا کام کر رہی ہے، اور مشین بالکل مفت میں ملی ہوئی ہے، اس کے حاصل کرنے کے لئے کوئی پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔

زبان کی حرکات وسکنات

یہ ایسی مشین ہے کہ جب دماغ میں یہ خیال آتا ہے کہ مجھے یہ بات اس طرح کہنی ہے، تو اسی لمحے یہ مشین اپنی حرکت اس طرح شروع کر دیتی ہے کہ وہ بات واضح طور پر لوگ سن لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دماغ اور اس زبان میں ایک عجیب کنکشن لگا دیا ہے کہ میرے دماغ میں جو مضمون آیا، وہ مضمون لفظوں کے سانچے میں ڈھل کر زبان کے ذریعے ادا ہو کر دوسرے آدمی کے دماغ میں پہنچ جاتا ہے۔ کیا زبان کی مختلف حرکتوں کا طریقہ تم نے خود ایجاد کیا تھا کہ اس زبان کو اس طرح موڑوں گا تو یہ حرف ادا ہوگا اور اس طرح موڑوں گا تو یہ حرف ادا ہوگا؟ کیا تم نے خود یہ لغت وضع کی تھی جس کے ذریعہ اظہارِ خیال کرتے ہو؟ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے اور اپنی حکمتِ بالغہ سے ذہن کو پہلے سکھایا اور پھر زبان کو اس طرح ذہن کے تابع کر دیا کہ اِدھر دماغ میں ایک بات آئی اور اُدھر زبان سے نکل گئی۔

دماغ اور زبان کے درمیان رابطہ

اگر دونوں کے درمیان وقفہ ہوتا کہ دماغ میں تو ایک بات آ گئی، لیکن اس کو زبان پر لانے کے لئے پہلے بٹن دبانا پڑتا تو درمیان کا یہ وقفہ عذاب بن جاتا اور مشکل پیش آ جاتی اور دنیا کا کوئی کام نہ ہو پاتا، لیکن اللہ جل شانہٗ نے اپنے فضل وکرم سے اور اپنی رحمت سے دونوں کے درمیان ایسا کنکشن قائم کر دیا کہ اِدھر دماغ میں بات آئی اور اُدھر زبان سے نکل گئی، اس کے لئے نہ کوئی سوچ آن کرنا پڑتا ہے اور نہ کوئی محنت کرنی پڑتی ہے۔

ایک عبرتناک واقعہ

ویسٹ انڈیز کا ایک جزیرہ جس کا نام ''بار بڈوز'' ہے۔ ایک مرتبہ وہاں جانا ہوا۔ وہاں بڑی عبرت کا معاملہ تھا۔ ایک صاحب کو دیکھا کہ ان کی زبان تھی اور زبان حرکت بھی کرتی تھی لیکن ان کے

حلق میں ایسی خرابی پیدا ہوگئی تھی کہ زبان کی حرکت کے باوجود آواز نہیں نکلتی تھی، چنانچہ ان کے لئے ایک آلہ تجویز کیا گیا، ہر وقت وہ آلہ ان کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ جب کوئی بات ان کو کرنی ہوتی تو پہلے وہ آلہ اپنے گلے میں سوراخ پر زور سے لگاتے، اس کے دبانے سے آواز نکلتی تھی، جو آواز نکلتی تھی وہ بھی کسی انسان کی آواز معلوم نہیں ہوتی تھی بلکہ کسی جانور کی آواز معلوم ہوتی تھی، جس کو سن کر بچے بے ساختہ ہنستے تھے، البتہ اس کے ذریعہ وہ اپنی بات کم از کم دوسرے کو سمجھا دیتے تھے۔

لیکن میں ان کی بیتابی کا عالم دیکھتا تھا کہ جب ان کے دماغ میں کوئی بات آتی تو فوراً نہیں کہہ سکتے تھے بلکہ وہ آلہ نکال کر لگاتے پھر آواز نکلتی، لہٰذا دماغ میں بات آنے اور زبان سے ادا کرنے کے درمیان جو وقفہ ہوتا تھا وہ وقفہ بہت بے چینی کے ساتھ گزرتا تھا۔

ہم بے شمار نعمتوں کے مالک ہیں

ہمیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر اس لئے نہیں ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں مفت میں بے مانگے بغیر کسی محنت اور مشقت کے عطا فرما رکھی ہیں، زبان بھی دے رکھی ہے، قوتِ گویائی بھی دے رکھی ہے، حلق کے اندر آواز بھی دے رکھی ہے، دماغ کے ساتھ اس زبان کا کنکشن بھی جوڑ رکھا ہے، جب اور جو کلمہ زبان سے ادا کرنا چاہتے ہیں، فوراً ادا کر لیتے ہیں، اس لئے اس زبان کی قدر نہیں، اللہ بچائے، اگر ان میں سے کوئی ایک چیز ناکارہ ہو جائے یا ان میں سے ایک چیز کے عمل میں خلل واقع ہو جائے تب پتہ چلے کہ یہ کیسی عظیم نعمت تھی جو ہم سے چھن گئی ہے۔ سر سے لے کر پاؤں تک ایک ایک ذرہ اپنے اندر نعمتوں کی ایک کائنات رکھتا ہے، ان میں ایک زبان بھی ہے۔

اس نعمت کو گناہ میں استعمال مت کرنا

قرآن کریم میں بار بار یہ حکم آتا ہے کہ غور و فکر کیا کرو، تو اس سے مراد یہی باتیں ہیں جو غور و فکر کرنے کی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا کچھ نعمتیں دے رکھی ہیں، یہ زبان جو اللہ تعالیٰ نے سرکاری مشین عطا فرما رکھی ہے جس کو ہم مسلسل استعمال کر رہے ہیں، کبھی یہ سوچنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے کیا نعمت دے رکھی ہے، اس کو ذرا سوچا کرو، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے ہماری کسی محنت کے بغیر، کسی مشقت کے بغیر، کسی طلب کے بغیر، پیسہ خرچ کیے بغیر محض اپنے فضل سے عطا فرمائی تو اس کے ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دے دیا کہ ہم تمہیں یہ مشین دے تو رہے ہیں لیکن اس مشین کو دیکھ بھال کر استعمال کرنا اور اس مشین کو گناہ میں استعمال مت کرنا۔

''زبان'' آخرت کے خزانے جمع کرنے کا ذریعہ

اگر اس مشین کو صحیح استعمال کرو گے تو یہ مشین تمہارے لئے آخرت کا خزانہ جمع کرنے کا ذریعہ بن جائے گی، اگر اس زبان سے ایک مرتبہ ''سبحان اللہ'' کہہ دو گے تو یہ کلمہ تمہارے میزانِ عمل کا پلڑا بھر دے گا، اگر اس زبان سے ایک مرتبہ ''الحمدللہ'' کہہ دو گے تو میزانِ عمل کا پلڑا بھر جائے گا، یعنی اگر اللہ جل شانہ کے کسی بھی ذکر میں اس زبان کو مشغول کرو گے تو ہم تمہارے لئے میزانِ عمل کا پلڑا بھر دیں گے اور تمہارے لئے آخرت میں نیکیوں کے خزانے جمع کر دیں گے۔ اگر اس زبان سے تم ہمارے کلام کی تلاوت کرو گے تو ایک ایک حرف پر دس دس نیکیاں تمہارے نامۂ اعمال میں لکھ دیں گے، اگر صرف ''الم'' پڑھو گے تو تمہارے نامۂ اعمال میں تیس نیکیاں لکھی جائیں گی۔

ذرا ان کی رحمت تو دیکھئے کہ یہ مشین ان کی دی ہوئی، اس مشین میں طاقت انہی کی دی ہوئی اور یہ کلمات بھی انہی کے سکھائے ہوئے اور انہی کی توفیق سے یہ کلمات زبان سے نکل رہے ہیں، یہ کلام بھی انہی کا ہے، اس کو نازل کرنا ایک مستقل عظیم الشان نعمت ہے، پھر بھی یہ کہا جا رہا ہے کہ ان کلمات پر تمہیں انعام دیں گے، جب اس کلام کو تم ہماری دی ہوئی مشین سے پڑھو گے تو اتنی نیکیاں تمہارے نامۂ اعمال میں لکھی جائیں گی۔ ان کی رحمتوں کا کچھ ٹھکانہ ہے؟

''زبان'' جہنم سے نکالنے والی ہے

لہٰذا اگر اس زبان کو تم صحیح استعمال کرو گے تو یہ زبان تمہارے لئے جنت کے محل تعمیر کر سکتی ہے، اس لئے اس زبان کو اللہ کے ذکر سے تر رکھو کیونکہ یہ زبان تمہاری آخرت کی زندگی استوار کر رہی ہے اور تمہیں جہنم سے نکال رہی ہے۔ اگر کوئی ستر برس کا کافر بھی ''أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ'' پڑھ لے تو اسی لمحے وہ جہنم سے نکل کر جنت میں پہنچ جائے گا۔

بہر حال! یہ زبان اتنا بڑا کارنامہ انجام دے رہی ہے کہ انسان کو جہنم سے نکال رہی ہے اور جنت میں داخل کر رہی ہے، جنت میں داخل کرنے کے اسباب جمع کر رہی ہے اور آخرت کے خزانے اکٹھے کر رہی ہے۔

یہ زبان جہنم میں لے جانے والی ہے

اس زبان کے خالق اور مالک کی طرف سے اتنا مطالبہ ہے کہ اس زبان کو ذرا سنبھال کر استعمال کرو اور اس کو گناہ کے کاموں میں استعمال مت کرو۔ کیونکہ اگر تم نے اس کو گناہ کے کاموں میں

استعمال کرلیا تو پھر جہنم میں لے جانے والی اس سے زیادہ خطرناک بھی کوئی چیز نہیں، اس لئے کہ حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں کو سب سے زیادہ اوندھے منہ جہنم میں ڈالنے والی چیز ان کی زبان ہے۔(۱)

یہ زبان انسان کو بہت تیزی سے جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔ مثلاً اگر جھوٹ بولا تو اس کی سزا جہنم، اگر غیبت کی تو اس کی سزا جہنم، کسی کی دل آزاری کی تو اس کی سزا جہنم، جو لفظ بھی زبان سے ایسا نکلے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف ہو، وہ لفظ انسان کو جہنم کی طرف لے جانے والا ہے، لہٰذا آپ سے مطالبہ یہ ہے کہ اس زبان کو قابو میں رکھو تاکہ کوئی غلط بات زبان سے نہ نکلے۔

زبان کے ذریعہ غیبت

ہوتا یہ ہے کہ انسان یہ بھول جاتا ہے کہ مجھے کیسی عظیم الشان نعمت ملی ہوئی ہے اور کس نے یہ نعمت دی ہے اور کس کام کے لئے دی ہے؟ یہ سب باتیں بھول جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دن رات صبح سے لے کر شام تک اس زبان کو بے دھڑک استعمال کرتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں جائز کام کر رہا ہوں۔

لیکن جب جائز کاموں کے اندر بھی اس زبان کو بے دھڑک استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں کچھ خرابی ضرور آجاتی ہے۔ مثلاً آپ کسی جاننے والے کا اچھائی کے ساتھ تذکرہ کر رہے ہیں کہ فلاں صاحب تو بڑے اچھے ہیں، نیک آدمی ہیں، نماز روزے کے پابند ہیں وغیرہ، آپ تو اس کے اوصاف بیان کر رہے ہیں لیکن شیطان درمیان میں ایک پیوند لگادے گا کہ یہ صاحب ویسے تو بڑے نیک ہیں لیکن ذرا سے بیوقوف ہیں، اب ''لیکن'' لگا کر ایک جملہ بڑھادیا، اس ایک جملے نے اس تعریف کو غیبت میں تبدیل کردیا، وہ غیبت جس کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

((اَلْغِيْبَةُ أَشَدُّ مِنَ الزِّنَا))(۲)

''غیبت زنا سے زیادہ شدید تر ہے''

شیطان نے اس کو غیبت کے اندر مبتلا کردیا۔

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الإیمان عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی حرمة الصلاة، رقم: ۲۵٤۱، سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب کف اللسان فی الفتنة، رقم: ۳۹٦۳، مسند أحمد، رقم: ۲۱۰۰۸

(۲) شعب الإیمان، رقم: ٦۷٤۱ (۳۰٦/۵)، کشف الخفاء، رقم: ۱۸۱۲ (۸۱/۲)، کنز العمال، رقم: ۸۰۲٦ (۵۸٦/۳)، مجمع الزوائد (۹۱/۸)

اس زبان کو قابو میں رکھیں

بات دراصل یہ ہے کہ جب آدمی باتیں زیادہ کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں زبان حد سے پھسل جاتی ہے اور حد پر نہیں رہتی، اس لئے صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ اس زبان کو قابو میں کرو اور باتیں ہی کم کرو، جب باتیں کم کرو گے تو زبان کے پھسلنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ زبان اس لئے پھسلتی ہے کہ وہ صبح سے لے کر شام تک قینچی کی طرح چل رہی ہے اور اس پر کوئی رکاوٹ اور پابندی نہیں ہے۔ جن لوگوں کو بزرگوں کی صحبت میسر نہیں ہوتی، ان کو زبان قابو میں کرنے کی کوئی فکر بھی نہیں ہوتی۔ جا کر بازاروں میں دیکھیں، لوگ بے دھڑک بلا سوچے زبان سے الفاظ نکالتے ہیں، کیا ان میں سے کسی کو اس بات کی فکر ہے کہ اس زبان کو بھی قابو کرنا چاہئے، بس صبح سے لے کر شام تک ان کی زبانیں چل رہی ہیں۔

بلاضرورت مت بولیں

اس صورتِ حال کو بدلنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے اوپر تھوڑی سی پابندی لگائی جائے، اسی وجہ سے حضرات صوفیا کرام فرماتے ہیں کہ کم بولو اور صرف ضرورت کے وقت بولو، بلاضرورت نہ بولو بلکہ خاموش رہو۔ اور بزرگوں نے فرمایا کہ پہلے بات کو تولو پھر بولو، اس پر عمل اس وقت ہوسکتا ہے کہ جب انسان کم بولنے کی عادت ڈالے، دل تقاضا کر رہا ہے کہ بولو، لیکن اگر بولنے کی ضرورت نہیں ہے تو خاموش ہو جاؤ، مت بولو۔

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ تھے "حضرت میاں سیّد اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ" بڑے عجیب وغریب بزرگ تھے، ہم نے ان کی عجیب عجیب باتیں سنی ہیں، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بے تکلف بھی تھے۔ حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ میں ایک مرتبہ ان سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو وہ فرمانے لگے کہ مولوی شفیع صاحب! آج ہم عربی میں باتیں کریں گے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ساری عمر تو کبھی عربی میں بات نہیں کی، نہ عربی میں بات کرنے کی عادت ہے اور نہ اس کی مشق ہے، اس لئے میں نے پوچھ لیا کہ حضرت ایسا کیوں؟ جواب میں حضرت نے فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ جب ہم اپنی زبان میں بولتے ہیں تو زبان پر قابو رہتا نہیں، جو چاہتے ہیں بولتے چلے جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں کثرتِ کلام میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور

عربی بولنے کی نہ تمہیں زیادہ مشق ہے اور نہ مجھے زیادہ مشق ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو ضرورت کی بات ہوگی وہی کریں گے اور وہ بھی ٹوٹے پھوٹے انداز میں کریں گے اور ضرورت کے بغیر کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکلے گا۔

ہماری مثال

پھر حضرت میاں سیّد اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ ہماری مثال اس شخص جیسی ہے جو بہت ساری پونجی لے کر گھر سے نکلا تھا، شروع میں وہ اس پونجی کو بے کھٹکے لٹا تا رہا کہ کبھی یہ چیز خرید لی اور کبھی وہ چیز خرید لی، کبھی یہ چیز کھالی اور کبھی وہ چیز کھالی، یہاں تک کہ اس پونجی کا بہت تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا جبکہ اس کی منزل ابھی بہت دور ہے، اب اس شخص کا یہ حال ہوگا کہ جو پونجی باقی رہ گئی ہے اس کو سوچ سوچ کر پھونک پھونک کر خرچ کرے گا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ منزل تک پہنچنے سے پہلے پہلے یہ پونجی ختم ہو جائے۔

جائز بات بھی بلاضرورت مت بولیں

ہماری مثال بھی ایسی ہی ہے کہ ہم نے اپنی عمر کے بہت بڑے حصے میں اس زبان کی نعمت کو بے تحاشا اور بے محابا خرچ کرنے میں ضائع کر دیا، یہ پتہ نہیں کہ کتنی عمر مزید باقی ہے، اس لئے اس کی کوشش کرلیں کہ آئندہ اس زبان کو صحیح مصرف میں استعمال کرلیں اور غلط مصرف سے اس کو بچالیں، ''تقلیل کلام'' کا اصل منشا یہ ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ شروع میں بہت کم بولو، جائز بات بھی بلاضرورت مت بولو اور رفتہ رفتہ جب کم بولنے کی عادت ہو جائے گی اور طبیعت اعتدال پر آجائے گی تو پھر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے منہ سے وہی بات نکلے گی جو اعتدال کے اندر ہوگی۔

جب طبیعت اعتدال کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے تو پھر جو لفظ بھی زبان سے نکلتا ہے وہ ٹکا ہوا نکلتا ہے، ایک سوت اِدھر یا اُدھر نہیں ہوتا، کہیں مبالغہ نہیں ہوتا، کہیں حد سے زیادہ تعریف نہیں ہوتی، کہیں حد سے زیادہ مذمت نہیں ہوتی۔

نئی نسل کو کوئی زبان نہیں آتی

بعض لوگ جب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت پڑھتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ حضرت والا بڑے ثقیل ثقیل لفظ استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے بعض اوقات حضرت کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ پہلی بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ حضرت والا نے جس زمانے میں یہ کتابیں لکھی ہیں اور یہ

ملفوظات ارشاد فرمائے ہیں، اس زمانے میں لوگوں کی ایسی حالت نہیں تھی جو حالت آج ہے، آج تو ایسی قوم تیار ہوگئی ہے جس کو کوئی زبان آتی ہی نہیں، نہ اُردو، نہ فارسی، نہ عربی، نہ انگریزی، کوئی زبان صحیح نہیں آتی۔ آج کا گریجویٹ اور ایم اے پاس شخص جب بات کرے گا تو یہ کہے گا کہ ''میں تشریف لایا تھا، آپ حاضر ہوئے تھے'' میں آپ کے پاس اس لئے تشریف لایا تھا کہ آپ میرے گھر پر حاضر ہو جائیں'' اور ''میں نے آپ سے فرمایا تھا کہ آپ نے جو عرض کیا تھا'' اس طرح کے الفاظ کا عام رواج ہے، میرے پاس اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کے خطوط آتے ہیں، اس میں املاء کی غلطیاں ہوتی ہیں۔

بہرحال! ایک ایسی نسل تیار ہو رہی ہے جس کو کوئی زبان صحیح نہیں آتی، اللہ تعالیٰ ہی اس پر رحم کرے۔

اُردو بولنے والوں کے چند فقرے

جس زمانے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مواعظ اور ملفوظات ارشاد فرمائے ہیں، وہ زمانہ ایسا تھا کہ اس میں عام آدمی بھی علمی اصطلاحات سے اتنا بے خبر نہیں تھا، اس زمانے کے مڈل پاس لوگوں کے خطوط آج اُٹھا کر دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ اس کے اندر عربی زبان کے لفاظ اس طرح استعمال کرتے تھے کہ آج کا ایم اے اور بی اے پاس شخص بھی ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ آج کے لوگوں کا یہ حال ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ ''میں آج ایک ضیافت میں مدعو تھا'' دوسرے شخص نے کہا کہ تم عربی بول رہے ہو یا اُردو بول رہے ہو؟ اس شخص نے دوبارہ یوں کہا کہ ''آج مجھے ایک فنکشن میں انوائٹ کیا گیا ہے'' تو دوسرے شخص نے کہا کہ ہاں! اب تم نے اُردو بولی۔ آج ہماری یہ حالت ہوگئی ہے۔ گویا ''ضیافت'' اور ''مدعو'' کے الفاظ بڑے ثقیل ہوگئے۔ اس وجہ سے آج کے لوگ کہتے ہیں کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ اور ملفوظات میں بڑے ثقیل لفظ ہوتے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام جچا تلا ہوتا ہے

دوسری بات یہ ہے کہ اگر پڑھا لکھا آدمی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں ذرا غور کر کے دیکھے تو یہ نظر آئے گا کہ حضرت کا کلام ایسا ٹکا ہوا ہوتا ہے کہ اس میں نہ تو ایک لفظ زائد ہوتا ہے نہ کم ہوتا ہے، اس لئے بعض اوقات ان کو اپنا کلام حدود کے اندر رکھنے کے لئے کوئی ایسا لفظ نہیں ملتا جو آسان ہو، اس وجہ سے وہ بعض اوقات اپنے کلام میں مشکل الفاظ لے آتے ہیں، لیکن یہ صرف اس لئے ایسا کرتے ہیں تاکہ بات حدود کے اندر رہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ سنایا کرتے تھے کہ حضرت نے فرمایا کہ خودرائی بہت بری بلا ہے، یعنی ہمیشہ صرف اپنی رائے پر بھروسہ کرنا اور صرف اپنے اوپر اعتماد کر کے ہر کام کا خود ہی فیصلہ کر لینا یہ بہت برا ہے، لہٰذا ہر کام سے پہلے مشورہ ضرور کر لیا کرو۔ اور فرمایا کہ ''جب تک ضابطے کے بڑے موجود ہوں، ان سے مشورہ کرو'' اب دیکھئے! یہ نہیں فرمایا کہ ''جب تک بڑے موجود ہوں'' بلکہ فرمایا کہ جب تک ضابطے کے بڑے موجود ہوں، پھر خود ہی اس لفظ کے بڑھانے کی وجہ بیان فرمائی کہ ''ضابطے کے بڑے'' اس لئے کہہ رہا ہوں کہ حقیقت میں کون بڑا ہے اور کون چھوٹا ہے یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾(۱)

بڑا وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نواز دیں، جس کی مغفرت فرمادیں اور جس سے خوش ہو جائیں، یہ نہیں ہے کہ جو شخص عمر میں بڑا ہے یا مرتبہ میں بڑا ہے، وہ ضرور اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی بڑا ہوگا، یہ ضروری نہیں، لیکن دنیا کے اندر ضابطے میں اللہ تعالیٰ نے کچھ مرتبے بنادیئے ہیں، مثلاً باپ بیٹے سے بڑا ہے، استاد شاگرد سے بڑا ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب تک ضابطے کے بڑے موجود ہوں، ان سے مشورہ کیا کرو اور جب ضابطے کے بڑے موجود نہ رہیں تو اپنے برابر والوں سے مشورہ کیا کرو اور جب وہ بھی نہ رہیں تو اپنے چھوٹوں سے مشورہ کیا کرو۔

جب اعتدال ہو تو ایسا ہی کلام نکلتا ہے

اگر ہم اور آپ بولتے تو صرف یہ کہتے کہ بڑوں سے مشورہ کر لیا کرو، لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے یہ لفظ اس طرح نہیں نکلا، کیونکہ دوسرے کو بڑا کہہ دینا تو ''تزکیہ علی اللہ'' ہے، اس لئے انہوں نے ایک لفظ بڑھا کر فرمایا کہ ضابطے کے بڑوں سے مشورہ کیا کرو۔ جب اللہ تعالیٰ طبیعت میں اعتدال عطا فرمادیتے ہیں تو پھر منہ سے اور قلم سے جو لفظ بھی نکلتا ہے، وہ ٹکا ہوا نکلتا ہے، نہ ایک انچ اِدھر ہوتا ہے، نہ ایک انچ اُدھر ہوتا ہے۔ یہی حال زبان کا ہوتا ہے، یہی حال قلم کا ہوتا ہے۔ لہٰذا جب آدمی تحریر لکھے تو تحریر کے اندر یہ نہ ہو کہ آدمی جوشِ کتابت میں حدود سے تجاوز کر جائے اور ضرورت سے زیادہ کلمات استعمال کر لے بلکہ جو کلمہ لکھے وہ سوچ سمجھ کر لکھے۔

---

(۱) الحجرات: ۱۳، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے''

کس مقصد سے بات کر رہے ہیں؟

اس غرض کے لئے حضرات صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ کم بولو۔ جب شروع میں انسان اس طریق میں قدم رکھتا ہے تو سب سے پہلے یہ کام کرنا ہی پڑتا ہے، چنانچہ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

> ''ہر قول اور ہر فعل اختیاری کسی نہ کسی غایت کے لئے مطلوب ہوتا ہے، پس ہر کام اور ہر بات میں یہ سوچنا چاہئے کہ اس کی غایت کیا ہے؟ جس کام اور جس بات کی کچھ غایت نہ ہو وہ فضول ہے، اور غایت معلوم ہو مگر مفید نہ ہو وہ بھی فضول ہے، اور اگر وہ غایت کوئی ضرر ہو لازم یا متعدی تو وہ کلام یا بات مضر ہے''(۱)

فرمایا کہ جب بھی کوئی بات کرو تو ایک لمحہ کے لئے تھوڑا سوچ لیا کرو کہ جو بات میں کرنے جارہا ہوں، اس کا مقصد کیا ہے؟ اگر مقصد صحیح ہے اور شریعت کے مطابق ہے تو ٹھیک ہے بات کرلو، لیکن اگر مقصد صحیح نہیں اور شریعت کے مطابق نہیں، یا اس بات کا نہ تو دنیا میں کوئی فائدہ ہے اور نہ آخرت میں کوئی فائدہ ہے تو پھر بلاوجہ زبان کو اس میں ملوث نہ کرو بلکہ اس کو چھوڑ دو اور رک جاؤ۔ اس کی عادت اور مشق کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تہیہ کرلو کہ زبان کو غلط استعمال نہیں کریں گے بلکہ اس کو قابو میں کریں گے۔ جب آدمی اللہ کے لئے تہیہ کرلیتا ہے اور ارادہ کرکے اپنا کام درست کرنا چاہتا ہے تو پھر اللہ جل شانہ کی طرف سے مدد بھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾(۲)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کا ترجمہ اس طرح فرماتے ہیں کہ جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کرتے ہیں، ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستوں پر لے جاتے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ''ہدایت'' سے مراد "اراءة الطريق" نہیں ہے بلکہ "ايصال الى المطلوب" ہے، یعنی ہاتھ پکڑ کر منزل تک لے جاتے ہیں، لیکن کوئی ارادہ تو کرے، قدم تو بڑھائے، ارادہ کرنے کے بعد پھر وہی سمجھاتے ہیں کہ کیا بولنا چاہئے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور جھوٹ سے پرہیز

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کے سفر میں مکہ مکرمہ سے

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۸۶

(۲) العنکبوت: ۶۹، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جن لوگوں نے ہماری خاطر کوشش کی ہے ہم انہیں ضرور بالضرور اپنے راستوں پر پہنچائیں گے''

مدینہ طیبہ کی طرف تشریف لے جا رہے تھے، جبکہ اہلِ مکہ نے اعلانِ عام کر رکھا تھا کہ جو شخص جناب رسول اللہ ﷺ کو پکڑ لے آئے گا۔ العیاذ باللہ۔ زندہ یا مردہ، اس کو سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے۔ آپ اندازہ کریں کہ آج بھی سو اُونٹ کی کیا قیمت ہوگی، اس زمانے میں کیا ہوگی، اتنا بڑا انعام مقرر کر رکھا تھا اور چاروں طرف ہرکارے دوڑا رکھے تھے اور چاروں طرف جاسوس بکھرے ہوئے تھے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس ﷺ کے ساتھ چھپتے چھپاتے جا رہے تھے۔

راستے میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا کوئی پرانا جاننے والا مل گیا جو کسی اور شہر کا رہنے والا تھا۔ چونکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہر دلعزیز بھی تھے اور تاجر بھی تھے، اس لئے ان کے تعلقات لوگوں سے زیادہ تھے۔ بہر حال! وہ شخص آپ سے مل کر بہت خوش ہوا اور پھر پوچھا کہ یہ آپ کے ساتھ کون ہیں؟ چونکہ وہ شخص حضور ﷺ کو جانتا نہیں تھا، اس لئے آپ کے بارے میں پوچھا۔ اب اگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سچ بولتے ہیں کہ یہ جناب رسول اللہ ﷺ ہیں تو ان حالات میں بتانا خطرناک ہے، کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس کے ذریعہ دشمنوں تک خبر پہنچ جائے اور وہ سرکارِ دو عالم ﷺ کو تکلیف پہنچا دیں، اور اگر نہ بتائیں تو یہ بھی ممکن نہیں، اس لئے کہ وہ تو براہِ راست سوال کر رہا ہے اور اگر یہ کہیں کہ یہ کوئی اور آدمی ہے تو جھوٹ ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ وہ تو ''صدیق اکبر'' تھے، جھوٹ نہیں بول سکتے تھے، جھوٹ بولنے کا تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا، لہٰذا انہوں نے اللہ تعالیٰ سے جواب مانگا ہوگا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب القاء ہوا کہ یوں کہہ دو ''هَادٍ يَهْدِيْنِي السَّبِيْلَ'' یہ میرے رہنما ہیں، مجھے راستہ دکھاتے ہیں۔

دیکھئے کہ اس وقت جبکہ جان پر بنی ہوئی ہے، موت آنکھوں کے سامنے ناچ رہی ہے، اس وقت بھی ''صدیق'' کی زبان سے کوئی کلمہ حد سے گزرا ہوا نہیں نکلا۔ جب کوئی شخص اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان بنا دیتا ہے تو پھر انہی کی طرف سے ہدایت ہوتی ہے کہ اس موقع پر کیا کہا جائے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا جھوٹ سے بچنا

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے بانی تھے، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا تھا، چنانچہ انگریزوں کی طرف سے ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوگئے، اس زمانے پر چوراہوں پر پھانسیاں لٹکی ہوئی تھیں، چنانچہ پولیس ان کو تلاش کر رہی تھی، حضرت مولانا دیوبند کی چھتہ کی مسجد میں تشریف فرما تھے، لنگی اور معمولی سا کرتہ

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب المناقب، باب هجرة النبی وأصحابه إلى المدينة، رقم: ۳٦۲۱، مسند أحمد، رقم: ۱۱٦۱۵

پہنتے تھے، کوئی شخص دیکھ کر یہ پتہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ کوئی بڑے عالم ہوں گے، پولیس والے تلاش کرتے ہوئے چھتہ کی مسجد میں پہنچ گئے، پولیس والوں نے یہ سوچا کہ جب انہوں نے اتنا بڑا کام کیا ہے تو کوئی بہت بڑے عالم ہوں گے اور بڑی شان و شوکت کے ساتھ جبہ قبہ اور دستار لگائے ہوئے ہوں گے، مگر حضرت مولانا چھتہ کی مسجد میں لنگی پہنے بیٹھے تھے، ان پولیس والوں کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ یہ مولانا قاسم صاحب ہیں، وہ سمجھے کہ یہ مسجد کا کوئی خادم ہے، چنانچہ انہی سے جا کر پوچھا کہ مولانا قاسم صاحب کہاں ہیں؟ حضرت مولانا اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور ذرا سا ہٹ کر فرمایا کہ ابھی تو یہاں تھے۔ کیونکہ اگر بتا دیں کہ میں قاسم ہوں تو پکڑے جائیں اور اگر جھوٹ بولیں تو وہ گوارا نہیں، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مدد ہوئی کہ ذہن میں جواب القاء فرمادیا۔ چنانچہ پولیس والے اِدھر اُدھر تلاش کر کے واپس چلے گئے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور جھوٹ سے پرہیز

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بھی جہادِ آزادی میں شریک تھے، وہ بھی پکڑے گئے اور مجسٹریٹ کی عدالت میں بلائے گئے، مجسٹریٹ نے کہا کہ تمہارے خلاف الزام یہ ہے کہ تمہارے پاس ہتھیار ہیں، بتاؤ تمہارے پاس ہتھیار ہیں؟

اب حضرت کے پاس ہتھیار تو تھے جو آپ نے تہہ خانے میں دفن کر دیئے تھے، اب اگر یہ کہیں کہ ہتھیار نہیں ہیں تو جھوٹ ہوتا ہے، اگر سچ بولیں کہ ہتھیار ہیں تو پھانسی کا تختہ سامنے ہے، حالانکہ ایسے موقع پر جب آدمی کی جان پر بن جائے تو بعض اوقات جھوٹ بولنے کی بھی اجازت ہو جاتی ہے۔ حضرت کے ہاتھ میں تسبیح تھی، آپ نے وہ تسبیح اُوپر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا ہتھیار تو یہ ہے۔ ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ اتنے میں ایک دیہاتی آگیا اور مجسٹریٹ سے کہنے لگا کہ ارے تم کس کو پکڑ لائے، یہ تو ہماری مسید (مسجد) کا موَجن (موَذن) ہے۔ چنانچہ مجسٹریٹ نے جب یہ دیکھا کہ یہ تو ہاتھ میں تسبیح لئے گھوم رہا ہے اور دیہاتی بھی یہ کہہ رہا ہے کہ یہ موَذن ہے، تو اس نے آپ کو چھوڑ دیا۔ اللہ جل شانہٗ کی طرف سے اس طرح مدد ہوتی ہے۔

<u>خلاصہ</u>: بہر حال! جب آدمی ارادہ کر لے کہ میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس مشین کو صحیح استعمال کروں گا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق استعمال کروں گا تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مدد بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا اپنی طرف سے ارادہ کر لو، عزم کر لو اور اس کی فکر کرو تو پھر انشاء اللہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

وساوس اور ان کا علاج ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِيْنَ. أَمَّا بَعْدُ!

چونکہ یہ کتاب ''انفاسِ عیسیٰ'' بڑی جامع کتاب ہے، اور بہت سے ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب بے شمار ملفوظات پر مشتمل ہے، اس لئے بالاستیعاب اس کو پڑھ کر اس کی تشریح کرنا تو مشکل ہے۔ لہٰذا میں صرف منتخب حصہ پڑھ کر اس کی تشریح بیان کر دیتا ہوں تاکہ ضروری ضروری باتوں کا بیان ہو جائے۔ اس لئے آج میں اس کتاب کا نیا باب شروع کر رہا ہوں، جو ''وساوس'' سے متعلق ہے۔

وساوس کا علاج ''عدم التفات''

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''وساوس کا علاج عدم التفات ہے اور بس، لیکن ''عدم التفات'' کو مقصود بالغیر سمجھ کر کام میں نہ لائے بلکہ اس کو مقصود بالذات سمجھے، خواہ اندفاع وساوس اس پر مرتب ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح ''راحت'' کو مقصود بالذات نہ سمجھا جائے، بلکہ اس پر آمادہ رہنا چاہئے کہ اگر تمام عمر اس سے بھی زیادہ کلفت ہو تو وہ بھی محبوب کا عطیہ ہے۔ ''لِأَنَّهُ لَيْسَ بِمَعْصِيَةٍ وَلَا اخْتِيَارِيٍّ وَكُلُّ مَا كَانَ كَذٰلِكَ فَهُوَ نِعْمَةٌ'' اور عبدیت یہی ہے۔

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ آنچہ ساقی ماریخت عین الطافست

اس شعر کو کبھی کبھی پڑھ لیا کرے''(۱)

☆ اصلاحی مجالس (۳۱/۴ تا ۴۸)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۹۰

کوئی شخص وساوس سے خالی نہیں

حضرت والا نے اس ملفوظ میں وسوسہ کا اور ایک کثیر الورود شبہ کا علاج فرمایا ہے۔ لوگوں کو وسوسے اور خیالاتِ فاسدہ بہت آتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات ایسے خیالات اور وساوس آتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں انسان یہ سوچتا ہے کہ اس کی وجہ سے میں کہیں کافر تو نہیں ہو گیا۔ کوئی شخص شاید ایسا نہیں ہے جس کو برے برے خیالات اور وسوسے نہ آتے ہوں، بلکہ وسوسے آتے ہیں، اور اس سے لوگ پریشان ہوتے ہیں۔ خاص کر وہ شخص جس نے دین کے راستے پر چلنے کا ابھی قصد کیا ہے اور قدم بڑھایا ہے، ایسے شخص کو بہت زیادہ وسوسے آتے ہیں، اور اس کے دل میں بہت سے خطرات گزرتے ہیں۔

دین پر چلنے والے کو وسوسے زیادہ آتے ہیں

جس شخص کا دین کی طرف اور اصلاح کی طرف دھیان ہی نہیں ہے، اور دن رات دنیاوی مشاغل میں منہمک ہے، فسق و فجور میں مبتلا ہے، ایسے شخص کو وسوسے نہیں آتے، وسوسے اس شخص کو آتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے راستے پر اور دین کے راستے پر چل پڑتا ہے، اس کو طرح طرح کے وسوسے آتے ہیں۔ ایسے وسوسے آتے ہیں کہ ان کی وجہ سے آدمی کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ میرا ایمان بھی باقی رہا یا نہیں؟ کبھی اللہ تعالیٰ کے بارے میں وسوسے آئیں گے، کبھی اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں وسوسے آئیں گے، کبھی قرآن کریم اور حدیث کے بارے میں وسوسے آئیں گے، اور کبھی شریعت کے احکام کے بارے میں وسوسے آئیں گے۔ اگر ایسے موقع پر انسان کی صحیح رہنمائی نہ ہو تو انسان گمراہی کے راستے پر پڑ جاتا ہے۔ العیاذ باللہ۔

ان کی طرف توجہ نہ کی جائے

ان ''وساوس'' کا علاج حضرت والا یہ بیان فرما رہے ہیں کہ ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کی طرف توجہ نہ کی جائے۔ وساوس آتے ہیں تو آنے دو، کوئی پروا ہی نہ کرو، اس طرف دھیان ہی نہ دو کہ دل میں کیا وسوسہ آ رہا ہے اور کیا جا رہا ہے۔

''وساوس'' ایمان کی علامت ہیں

یہ بات یاد رکھیں کہ یہ ''وساوس'' خود ایمان کی علامت ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک

صحابی نے حضورِ اقدس ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! بعض اوقات میرے دل میں ایسے وسوسے اور ایسے خیالات آتے ہیں کہ ان خیالات کو زبان پر لانے کے مقابلے میں جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے گوارا ہے، اس لئے میں کیا کروں؟ سبحان اللہ! نبی کریم ﷺ نے کیا جواب دیا، فرمایا:

((ذَاكَ صَرِيحُ الإِيمَانِ))(۱)

''یہ کھلی ایمان کی علامت ہے''

یعنی ایسے وسوسوں کا اور ایسے خیالات کا آنا تو کھلے ایمان کی علامت ہے، مؤمن ہی کے دل میں ایسے وسوسے آسکتے ہیں، اور جو کافر ہو یا جو فسق و فجور میں مبتلا ہو، اس کو ایسے وسوسے نہیں آتے۔

چور اسی گھر میں آتا ہے جہاں دولت ہو

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اسی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ چور اسی گھر میں آتا ہے جہاں کچھ مال ہو، جہاں مال ہی نہ ہو وہاں چور کیوں جائے گا۔ جس گھر کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہاں مال ہے، اس گھر میں چور داخل ہوگا۔ لہٰذا دل میں یہ چور (شیطان) اس لئے آرہا ہے کہ اس کو معلوم ہے کہ اس دل میں کچھ ہے۔ اگر اس دل میں اللہ پر اور اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان نہ ہوتا تو اس چور کو آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لہٰذا جب وسوسے اور خیالات آئیں تو پہلے اس بات پر شکر ادا کرو کہ الحمد للہ ایمان موجود ہے، ورنہ یہ خیالات آتے ہی نہیں۔

خیالات پر پریشانی ایمان کی موجودگی کی علامت

اور ایمان کے موجود ہونے کی دلیل اس طرح ہے کہ جب آپ کے دل میں یہ خیالات آتے ہیں تو آپ کو پریشانی ہوتی ہے اور ان خیالات کا آنا آپ کو برا معلوم ہوتا ہے۔ اگر دل میں ایمان نہ ہوتا تو پریشانی کیوں ہوتی۔ اگر ایمان نہ ہوتا تو دل میں ان خیالات کے آنے پر برا کیوں لگتا، ان خیالات سے تکلیف کیوں ہوتی۔ معلوم ہوا کہ دل میں ایمان ہے۔

وساوس کیوں آتے ہیں؟

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس پریشانی کے موقع کے لئے ایک تسلی کا جملہ ارشاد فرما دیا، وہ یہ ہے:

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان الوسوسة فی الإیمان، رقم: ۱۸۸، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی ردّ الوسوسة، رقم: ۴۴۴۷، مسند أحمد، رقم: ۹۳۱۷

﴿إِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ﴾(۱)

یعنی شیطان کی طرف سے جو وسوسے آتے ہیں، یہ درحقیقت شیطان کی طرف سے سرگوشی ہے، تاکہ مؤمنوں کو اس سرگوشی کے ذریعہ غم میں مبتلا کرے۔ آگے اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ یہ سرگوشی کرنا مؤمنوں کو ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچا سکتا مگر اللہ کے حکم سے۔ لہٰذا جب یہ وسوسے آکر پریشان کریں تو اس وقت یہ تصور کرو کہ یہ تو ایمان کی علامت ہیں۔ یہ شیطان اپنی سی کوشش کررہا ہے۔ اس سے کہہ دو کہ چل تو بھی اپنی سی کوشش کرلے، ہم بھی اپنی سی کوشش کررہے ہیں۔ لیکن اگر تم ان خیالات کی طرف متوجہ ہوگئے اور ان کی طرف التفات شروع کردیا کہ اس وسوسے کو دور کروں اور اس خیال کو دور کروں، تو پھر تم اس دھندے میں رہ جاؤ گے، آگے تمہاری ترقی نہیں ہو پائے گی اور شیطان کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

وساوس و خیالات کی مثال

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مثال کے ذریعے ان خیالات کے بارے میں سمجھا رہے ہیں، فرماتے ہیں کہ ان خیالات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کو بادشاہ کے دربار سے بلاوا آیا کہ آج فلاں وقت تم دربار میں آنا، ہم تم کو ملاقات کا موقع بھی دیں گے اور تمہیں انعامات سے بھی نوازیں گے۔ اب یہ شخص تیار ہوکر بادشاہ کے دربار کی طرف چل دیا۔ راستے میں ایک کتا دائیں طرف سے بھونک رہا ہے، ایک کتا بائیں طرف سے بھونک رہا ہے، اور اس کو وقت پر بادشاہ کے دربار میں پہنچنا ہے، بتائیے عقل کی بات کیا ہے؟ کیا وہ کتوں سے لڑنے بیٹھ جائے، ان کو بھونکنے سے روکے اور ان کا پیچھا کرے اور ان کو بھگائے اور ان کو گھر تک چھوڑ کر آئے؟ اگر وہ ان دھندوں میں لگ گیا تو پھر تو دربار میں پہنچنے کا وقت ہی نکل جائے گا، وقت پر نہیں پہنچ سکے گا۔ اس لئے عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کتوں کو بھونکنے دو اور تم جہاں جارہے ہو اور جس منزل پر پہنچنا چاہتے ہو، اس کی فکر کرو، ان کتوں کے بھونکنے کی فکر ہی مت کرو، اور اگر تم ان کتوں کے پیچھے پڑ گئے تو دربار میں حاضری کا شرف کھو بیٹھو گے۔

اسی طرح تم یہ جو عبادات کررہے ہو اور اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو رہے ہو، یہ عبادت اللہ تعالیٰ کے دربار میں باریابی ہے، اب باریابی کے وقت دل میں جو خیالات اور وسوسے آرہے ہیں، دراصل یہ کتے بھونک رہے ہیں، اگر تم نے ان کی طرف التفات شروع کردیا اور ان کو بھگانے کی فکر میں لگ گئے اور اپنا دھیان اس طرف لگادیا تو پھر شیطان کا مقصد حاصل ہو جائے گا اور تم دربار کی

(۱) المجادلۃ: ۱۰

باریابی سے محروم ہو جاؤ گے۔

وساوس کے وقت اپنے کام میں مشغول رہو

اس لئے ان وساوس اور خیالات کا علاج ہی یہ ہے کہ ان کی طرف التفات ہی نہ کرو۔ اور ''التفات'' نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس فکر میں مت پڑو کہ کیا وسوسہ آ رہا ہے اور کیا وسوسہ جا رہا ہے، کیا خیال آ رہا ہے اور کیا جا رہا ہے، بلکہ اپنے کام میں لگے رہو۔ مثلاً خیالات آ رہے ہیں اور تمہیں نماز پڑھنی ہے تو تم اپنی نماز میں لگ جاؤ۔ خیالات آ رہے ہیں اور تمہیں اس وقت تلاوت کرنی ہے تو تلاوت میں لگ جاؤ۔ کسی دوسرے کام کا وقت ہے تو اس دوسرے کام میں لگ جاؤ اور ان خیالات کو اپنے اعمال پر اثر انداز نہ ہونے دو۔ یہ علاج ہے ان خیالات کا، اگر ان خیالات اور وساوس کی طرف تم لٹھ لے کر دوڑو گے تو یہ اس کا علاج نہیں۔

وساوس کا ایک اور علاج

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کہیں اندھیرا ہو رہا ہو تو اس کا یہ علاج نہیں ہے کہ آدمی اس اندھیرے کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑے کہ یہ اندھیرا بھاگ جائے، اس طرح کبھی بھی اندھیرا نہیں جائے گا، اندھیرے کا علاج یہ ہے کہ ایک چراغ جلا دو، جس جگہ پر اس چراغ کی روشنی پہنچے گی وہاں سے اندھیرا خود بخود بھاگ جائے گا اور اس اندھیرے کی ظلمت خود بخود دُور ہو جائے گی۔ اسی طرح یہ شیطانی خیالات اور وساوس بھی اندھیرا ہیں، ان کے پیچھے لٹھ لے کر نہیں بھاگنا، بلکہ ان کا علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کا چراغ جلاؤ، اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کا چراغ جلاؤ اور ان کی طرف التفات نہ کرو، بس یہ وساوس اور خیالات خود دُور ہو جائیں گے۔

دوسرے خیال کی طرف متوجہ ہو جاؤ

اگر یہ خیالات بہت زیادہ آ رہے ہیں تو اس کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کو بھگانے کی فکر کرنا تو پھر بھی ٹھیک نہیں، اس لئے کہ ان کو جتنا بھگاؤ گے یہ اتنا ہی اور آئیں گے۔ ان کا علاج یہ ہے کہ اپنے آپ کو کسی اور کام میں لگا لو یا کسی اور خیال کی طرف اپنے آپ کو متوجہ کر لو۔ اس لئے کہ فلسفہ کا قاعدہ ہے:

"اَلنَّفْسُ لَا تَتَوَجَّهُ إِلٰى شَيْئَيْنِ فِيْ آنٍ وَاحِدٍ"

''یعنی انسان کا نفس ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوا کرتا''

لہٰذا اگر دل میں وسوسے آرہے ہیں اور اس وقت تم نے اس کو دوسرے خیال میں مشغول کر دیا یا دوسرے کام میں مشغول کر دیا تو پہلا خیال اور وسوسہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

وساوس دور کرنے کے لئے کوئی وظیفہ نہیں

چنانچہ اس ملفوظ میں حضرت والا نے پہلا جملہ یہی ارشاد فرمایا کہ ''وساوس کا علاج عدم التفات ہے اور بس'' یعنی اور کوئی علاج نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وساوس بہت آرہے ہیں، کوئی وظیفہ بتادو جس کے نتیجے میں وسوسے نہ آئیں۔ حضرت فرمارہے ہیں کہ اس کے لئے کوئی وظیفہ نہیں، کوئی علاج نہیں، بس یہی علاج ہے کہ ان کی طرف التفات نہ کرو۔

صحت مقصود ہوتی ہے نہ کہ دوا

پھر آگے ایک دقیق بات ارشاد فرمائی کہ ''لیکن عدم التفات کو مقصود بالغیر سمجھ کر کام میں نہ لاوے بلکہ اس کو مقصود بالذات سمجھے، خواہ اندفاع وساوس اس پر مرتب ہو یا نہ ہو'' یعنی یہ جو میں نے کہا کہ ان وساوس کا علاج ''عدم التفات'' ہے، اس عدم التفات کو یہ نہ سمجھو کہ یہ ''مقصود بالغیر'' ہے، لہٰذا علاج کرنے کے بعد اس کی فکر لگ گئی کہ اس کے ذریعہ شفا ہوئی یا نہیں؟ دیکھئے جب آدمی کسی بیماری کے لئے دوا کھاتا ہے تو کیا وہ دوا خود مقصود بالذات ہوتی ہے؟ نہیں، بلکہ اس دوا سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ صحت حاصل ہو جائے۔ چونکہ ''صحت'' دوا کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، اس لحاظ سے دوا بھی مقصود ہے، لیکن مقصود بالغیر ہے، چونکہ دوا مقصود بالغیر ہے، اس لئے آدمی دوا کھانے کے بعد اس انتظار میں رہتا ہے کہ کب مجھے صحت ہو جائے، لہٰذا اگر کسی بیماری کے لئے ایک دن دوا کھائی، دو دن دوا کھائی، تین دن دوا کھائی، لیکن اس دوا سے فائدہ حاصل نہ ہوا تو وہ اس دوا کو کھانا چھوڑ دے گا، کسی دوسرے ڈاکٹر سے رجوع کرے گا، اس لئے کہ دوا کھانا خود مقصود نہیں تھا، شفا مقصود تھی، جب دوا سے شفا حاصل نہیں ہو رہی ہے تو دوا کھانی چھوڑ دی۔

''عدم التفات کا علاج'' خود مقصود بالذات ہے

حضرت والا فرمارہے ہیں کہ وساوس کا جو علاج بتایا ہے کہ ان وساوس کی طرف التفات نہ کرو، شفا سے بے نیاز ہو کر یہ دوا اور یہ علاج استعمال کرتے رہو، کیونکہ یہ علاج ''مقصود بالغیر'' نہیں، بلکہ ''مقصود بالذات'' ہے۔ اس لئے کہ اگر آپ نے میرے اس علاج پر ایک دن عمل کیا، دو دن تک عمل کیا، تین دن تک عمل کیا اور پھر بھی وساوس آتے رہے تو تم یہ کہو گے کہ یہ علاج غلط تھا، حالانکہ یہ

علاج غلط نہیں ہے بلکہ یہ علاج ابدی اور دائمی ہے۔ اگر بالفرض علاج کرنے کے باوجود وساوس آرہے ہیں تو یہ نہ سمجھو کہ علاج بیکار ہے، اس لئے کہ یہ علاج بذاتِ خود مقصود ہے، لہٰذا اس علاج کو مت چھوڑنا بلکہ اس پر عمل کرتے رہنا، چاہے ساری عمر وسوسے آتے رہیں، لیکن اس کی طرف سے اپنا دھیان ہٹاتے رہو، پھر وسوسے آئیں، پھر دھیان ہٹاتے رہو، ساری عمر یہ عمل کرتے رہو، بس اس کا یہی علاج ہے۔

''راحت'' خود مقصود بالذات نہیں

اسی طرح آگے ایک اور دقیق بات یہ ارشاد فرمائی کہ ''راحت'' کو مقصود بالذات نہ سمجھا جائے'' یعنی تمہیں ان وساوس اور خیالات کو دفع کرنے کی فکر ہورہی ہے، اس سے تمہارا کیا مقصود ہے؟ اگر تمہارا مقصود یہ ہے کہ چونکہ ان وسوسوں کے آنے سے ہر وقت دماغ پر پریشانی رہتی ہے، اور جب یہ وسوسے آنا بند ہوجائیں گے تو ''راحت'' حاصل ہوجائے گی۔ اس کے بارے میں حضرت فرمارہے ہیں کہ اس ''راحت'' کو مقصود نہ بنانا، بلکہ بذاتِ خود مقصود ہی یہ ہے کہ ان وساوس اور خیالات سے توجہ کو ہٹایا جائے اور کسی دوسرے مفید کام میں انسان اپنے آپ کو لگائے، کیونکہ اگر تم نے ''راحت'' کو مقصود بنالیا تو پھر تو تم نے نفسانی حظ کو مقصود بنالیا۔

پھر اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر پر راضی رہو

اور اگر ان وساوس کی طرف عدم التفات کے باوجود وساوس آتے ہیں اور ان وساوس کے آنے سے تکلیف ہوتی ہے اور صدمہ ہوتا ہے اور رنج ہوتا ہے، تو پھر اس تکلیف اور صدمہ پر بھی راضی رہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر یہی ہے اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی ہے۔ اگر وہ یہی چاہتے ہیں کہ میں ساری عمر وسوسوں کے اندر مبتلا رہوں اور ہمیشہ وسوسے آتے رہیں تو پھر میں کیا کروں! جب ان کی رضا وسوسوں کے آنے میں ہے تو پھر میری بھی رضا اسی میں ہے۔

نہ تو ہے ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

وہ جس حال میں رکھ رہے ہیں وہی میرے لئے بہتر ہے۔ لہٰذا وسوسہ آنے کی تکلیف اور صدمہ پر بھی راضی رہو۔

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ آنچہ ساقی ما ریخت عین الطافست

یعنی تجھے یہ حکم نہیں ہے کہ جو شربت تجھے پینے کو مل رہا ہے، اس میں یہ دیکھے کہ وہ گدلا ہے یا صاف ہے؟ بلکہ ہمارے ساقی نے جو کچھ عطا فرمایا ہے وہ عین اس کا کرم ہے۔ تمہیں اس کی حکمت معلوم ہو یا نہ ہو، مصلحت معلوم ہو یا نہ ہو، جو کچھ اس نے تمہارے لئے تجویز کیا ہے وہ ان کا کرم ہی کرم ہے۔

تیرے لئے یہی مناسب تھا

بہت سے لوگوں کو یہ اشکال ہوتا ہے کہ فلاں شخص کو تو بالکل وسوسے نہیں آتے، وہ تو بہت اطمینان سے رہتا ہے اور اس کا تعلق فلاں شیخ سے ہے، یہ ان سے بیعت ہے، اور دوسری طرف میں ہوں کہ مجھے تو بہت وسوسے آتے ہیں، کیا میں ہی وسوسے کے لئے رہ گیا ہوں؟ مجھے ہی یہ وسوسے اور خیالات آنے ہیں؟ یاد رکھئے! یہ بے صبری ہے، ارے تیرے لئے یہی مناسب تھا جو تیرے ساتھ ہو رہا ہے، اور اس کے لئے وہی مناسب تھا جو اس کے ساتھ ہو رہا ہے۔ یہ بھی ان کا کرم ہے اور وہ بھی ان کا کرم ہے۔ اس شخص کے لحاظ سے وہ کرم ہے اور تمہارے لحاظ سے یہ کرم ہے۔ اگر تو ان وساوس پر صبر کرلے تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے نہ معلوم کیا درجات تیرے لئے رکھے ہوئے ہیں۔

میرے پیمانے میں حاصلِ میخانہ

لہٰذا دوسروں کی طرف مت دیکھو کہ ان کو کیا مل رہا ہے، تمہیں جو کچھ مل رہا ہے وہ تمہارے لئے ٹھیک ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس مفہوم کا ایک شعر پڑھا کرتے تھے، فرمایا۔

مجھ کو اس سے کیا غرض کس جام میں ہے کتنی مے
میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے

یعنی مجھے اس سے کیا غرض کہ کس کو کیا ملا ہوا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے میرے پیمانہ میں مجھے عطا فرمایا ہے، میرے لئے تو وہ سارے میخانے کا حاصل ہے۔

صبر کرنے کا ثواب علیحدہ ملے گا

بہرحال! جو کرنے کے کام ہیں وہ کیے جاؤ اور جو غیر اختیاری خیالات اور وساوس آتے ہیں، ان کی طرف التفات نہ کرو، ان وساوس کے آنے سے جو تکلیف اور صدمہ ہو رہا ہے، اس کے بارے میں یہ سوچو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، یہ ان کا فیصلہ ہے، ان کی قضا ہے، ان کی تقدیر ہے، میں اس پر راضی ہوں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ وسوسے تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے، دوسرے یہ کہ ان وسوسوں کے آنے سے جو تکلیف ہو رہی ہے، اس پر اجر ملے گا اور ثواب ملے گا اور تمہارے درجات

بلند ہوں گے، لہٰذا ان وسوسوں سے فائدہ ہی فائدہ ہے، نقصان کوئی نہیں۔ اور جب تم اس پر راضی ہو جاؤ گے اور یہ کہو گے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ میرے لئے مقرر فرمایا ہے، میں اس پر راضی ہوں تو پھر ''رضا بالقضا'' کا اجر بھی تمہارے اعمال نامہ میں لکھا جائے گا، اس کے علاوہ صبر کا اجر بھی تمہارے لئے لکھا جائے گا۔

دنیا میں تکلیف ضرور پہنچنی ہے

یاد رکھو! اس دنیا میں مکمل راحت کسی کو حاصل ہو ہی نہیں سکتی، چاہے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا لے، چاہے وہ بڑے سے بڑا بادشاہ ہو، بڑے سے بڑا امیر کبیر انسان ہو، اس لئے کہ یہ دنیا راحتِ کاملہ کی دنیا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا فرمائے ہیں، ایک عالم وہ ہے جس میں راحت ہی راحت ہے، جس میں تکلیف کا اور غم کا اور صدمہ کا نام و نشان نہیں ہوگا، وہ عالمِ جنت ہے۔ دوسرا عالم وہ ہے جس میں تکلیف ہی تکلیف ہے، غم ہی غم اور صدمہ ہی صدمہ ہے، جس میں راحت اور سکون کا نام و نشان نہیں ہے، وہ عالمِ جہنم ہے۔ اور یہ عالمِ دنیا جس میں ہم اور آپ گزر رہے ہیں، اس میں راحت بھی ہے اور تکلیف بھی ہے، اس میں غم بھی ہے اور خوشی بھی ہے، یہاں کی کوئی راحت خالص نہیں ہے، بلکہ ہر راحت کے ساتھ تکلیف کا کانٹا لگا ہوا ہے، یہاں کی کوئی خوشی خالص نہیں ہے، بلکہ ہر خوشی کے ساتھ غم کا کانٹا لگا ہوا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں یہاں اس دنیا میں صرف راحت ہی راحت حاصل کروں، مجھے کوئی صدمہ نہ پہنچے، کوئی تکلیف نہ پہنچے، تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، بڑے سے بڑا سرمایہ دار ہو، بڑے سے بڑا حاکم ہو، بڑے سے بڑا دولت مند ہو، بڑے سے بڑا دانشور ہو، بڑے سے بڑا عالم ہو، بڑے سے بڑا ہنر مند ہو، اس کو لے آؤ اور اس سے پوچھو کہ کیا تمہیں کبھی بھی تکلیف نہیں پہنچی؟ وہ شخص کبھی یہ نہیں کہے گا کہ مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی، کچھ نہ کچھ تکلیف ضرور پہنچی ہے۔

لہٰذا جب اس دنیا میں تکلیف پہنچنی ہی ہے تو اب چاہو تو اس تکلیف پر صبر کر لو، چاہو تو بے صبری کر لو، چاہو تو اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ اور یہ کہہ دو کہ جو تکلیف ان کی طرف سے پہنچ رہی ہے، میں اس پر راضی ہوں، تو اس کے نتیجے میں تم اس بشارت کے مستحق ہو جاؤ گے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے:

﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾(۱)

''بیشک صبر کرنے والوں کو بے شمار اجر ملے گا''

---

(۱) الزمر: ۱۰

لہٰذا اس دنیا میں جتنا سکون ''رضا بالقضا'' یعنی اللہ کے فیصلے پر راضی ہونے کے ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے، اتنا سکون کسی اور طریقے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔

حضرت بہلول مجذوب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت بہلول مجذوب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ کیا حال ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ بہت اچھا حال ہے، بہت مزہ آرہا ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا مزہ آرہا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ارے میاں! اس شخص کے مزہ کا کیا حال پوچھتے ہو کہ دنیا میں کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف ہوتا ہی نہیں، میرا تو حال یہ ہے کہ دنیا میں جو کام ہورہا ہے وہ میری مرضی کے مطابق ہورہا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت! آج تک دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں گزرا کہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ ہوتا ہو، حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی مرضی کے خلاف بھی کام ہوتے تھے، آپ کو ایسا مقام کہاں سے مل گیا کہ آپ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں ہوتا؟ انہوں نے فرمایا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ میں نے اپنی مرضی مٹا کر مولیٰ کی مرضی کے تابع بنادیا ہے، جو ان کی مرضی وہ میری مرضی، جو وہ چاہتے ہیں میں بھی وہی چاہتا ہوں، اور جب کائنات میں کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتا تو میری مرضی کے خلاف بھی نہیں ہوتا، سکون کی یہ حالت اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل وکرم سے عطا فرمائی ہے۔

''رضا بالقضا'' میں سکون ہے

بہرحال! ''رضا بالقضا'' سے بڑھ کر کوئی اور سکون کا راستہ نہیں، اب یا تو اس ذریعہ سے سکون حاصل کرلو یا عمر بھر راحت کے لئے تڑپتے رہو، وہ میسر نہیں آئے گی۔ خلاصہ یہ کہ اس ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا کہ اگر بالفرض وساوس کی طرف عدم التفات کے باوجود وسوسے ختم نہ ہوں، بلکہ پھر بھی مسلسل آتے رہیں تو اس سے مت گھبراؤ اور پریشان مت ہو، بلکہ ان وسوسوں کے آنے پر راضی ہو جاؤ اور یہ سوچو کہ جب میرے اللہ نے میرے لئے یہ مقدر کردیا ہے تو میں اس پر خوش ہوں۔ البتہ ان وساوس کے تقاضوں پر عمل مت کرو۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو صحیح فہم عطا فرمائے، اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

بدگمانی اور اس کا علاج ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَأَصْحَابِہٖ أَجْمَعِیْنَ.

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿یٰٓأَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا﴾(۱)

بدگمانی اور تجسس ایسے گناہ ہیں جن کو ہم نے گناہ سمجھنا ہی چھوڑ دیا ہے، حالانکہ قرآن کریم کی نصِ صریح ہے کہ دوسرے کے خلاف بدگمانی کرنا بھی حرام ہے اور تجسس کرنا یعنی دوسرے کی ٹوہ میں لگنا کہ یہ کیا غلط کام کر رہا ہے، اور دوسرے کے عیب تلاش کرنا بھی حرام ہے۔

قرآن کریم نے صاف لفظوں میں فرمادیا "وَلَا تَجَسَّسُوْا" دوسرے کی ٹوہ میں نہ لگو، بلکہ ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے کام سے کام رکھے، دوسرے کی فکر میں نہ پڑے۔ اسی طرح بدگمانی کرنا بھی حرام ہے، کسی کے بارے میں اگر کوئی بات سامنے آئی ہے تو آدمی کو چاہئے کہ اس کے بارے میں نیک گمانی کرے۔ حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((ظُنُّوْا بِالْمُؤْمِنِیْنَ خَیْرًا))(۲)

"مؤمنین کے ساتھ نیک گمان رکھو"

خواہ مخواہ بلاوجہ بدگمانی کرنا کہ اس نے یہ کیا ہوگا، اس نیت سے کیا ہوگا، یہ بدگمانی ہے، جس کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا:

﴿إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ﴾(۳)

"بعض گمان براہِ راست گناہ ہوتے ہیں"

☆ اصلاحی مجالس (۱/۲۱۵۔۲۴۶)

(۱) الحجرات:۱۲ (۲) العرف الشذی للکشمیری (۱/۳۲۲) (۳) الحجرات:۱۲

معاشرتی خرابیوں کا سبب

یہ سب کام ناجائز اور حرام ہیں اور قرآن وحدیث کی نصوص ان کے خلاف صریح ہیں، ان میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اور یہ گناہ معاشرتی خرابیاں پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ معاشرے میں آپس میں نااتفاقیاں، ناچاقیاں، ایک دوسرے سے لڑائیاں یہ سب بدگمانی اور تجسّس سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ دونوں بڑے گناہ ہیں اور بہت سے فتنوں کی جڑ ہیں۔

ہمارے معاشرے کی حالت

لیکن ہمارا معاشرہ ان دونوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہر شخص اپنی طرف سے دوسرے کے بارے میں ایک گمان قائم کر لیتا ہے اور پھر اس پر ایسا یقین کر لیتا ہے جیسے اس نے اپنی آنکھوں سے اسے وہ کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ذرا سی بات علم میں آگئی، بس اس پر اپنی طرف سے مفروضوں کا محل تعمیر کرلے گا، پھر ان مفروضوں کو دوسروں کی طرف منسوب کردے گا کہ اس نے ایسا کیا ہوگا۔ پھر بعد میں ''کیا ہوگا'' بھی نہیں رہتا بلکہ ''کیا ہے'' ہوجاتا ہے۔

آیتِ قرآنی میں عجیب ترتیب

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ قرآن کریم کی اس آیت:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا﴾(۱)

کی تفسیر کے تحت بیان فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عجیب ترتیب قائم فرمائی ہے، وہ یہ کہ پہلے تو یہ فرمایا کہ بدگمانی مت کرو، یعنی کسی شخص کے بارے میں کسی بات کا کوئی قرینہ اور شائبہ معلوم ہوا تو آپ اس کی تحقیق کیے بغیر اس کے بارے میں بدگمانی کرکے بیٹھ گئے، یہ فعل تو حرام ہے۔ اب جو شخص بدگمانی کررہا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ اچھا آپ نے بدگمانی کو تو منع کردیا کہ بلاتحقیق کے کسی کے بارے میں بدگمان مت ہوجاؤ۔ تو اچھا مجھے تحقیق کرنے کی اجازت دے دو تاکہ میں تحقیق کروں کہ آیا اس نے یہ گناہ کیا یا نہیں؟ یہ عیب اس کے اندر موجود ہے یا نہیں؟ تو اب دوسرے مرحلے پر قرآن کریم نے یہ حکم دے دیا کہ ''وَلَا تَجَسَّسُوْا'' یعنی اگر تم کسی کے گناہ کی اور عیب کی تحقیق کرنا چاہتے ہو تو تمہیں اس تحقیق کی بھی اجازت نہیں۔ اس لئے کہ تمہیں اس کے گناہوں کی کیا پڑی ہے کہ

(۱) الحجرات: ۱۲

تم اس کی فکر میں لگ گئے کہ اس نے یہ گناہ کیا ہے یا نہیں؟ ع

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

جو کچھ وہ کر رہا ہے اس کا جواب اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ دے گا، تمہیں اس کی تحقیق کی کیا ضرورت ہے۔ اس لئے تجسّس کرنا منع ہے۔

تجسّس اور تحسّس میں فرق

حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے اس کے لئے دو لفظ استعمال فرمائے، فرمایا:

((وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا تَحَسَّسُوْا))(۱)

''نہ تجسّس کرو اور نہ ہی تحسّس کرو''

''تجسّس'' کے معنی وہ ہیں جو اوپر بیان کیے یعنی انسان اس فکر میں پڑے کہ دوسرے کا عیب مجھے معلوم ہو جائے، چاہے اس کے لئے کوئی بھی طریقہ اختیار کرے۔ اور ''تحسّس'' کے معنی وہ ہیں جس کو اُردو میں ''کنسوئے لینا'' کہتے ہیں۔ یعنی کسی کی راز کی بات چپکے سے سننے کی کوشش کرنا۔ وہ چھپانا چاہتا ہے اور یہ سننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ''تجسّس اور تحسّس'' دونوں کو حرام قرار دے دیا۔

تجسّس کیوں حرام ہے؟

کیوں حرام قرار دیا؟ اس لئے کہ تجسّس کرنا یا تحسّس کرنا اس بات کی علامت ہے کہ انسان اپنے عیب سے بے خبر اور بے فکر ہے۔ اگر اسے اپنے عیب کی فکر ہوتی تو کبھی دوسرے کے عیوب کی تجسّس میں نہ پڑتا۔ جس آدمی کے خود پیٹ میں درد ہو رہا ہو اور وہ اس درد سے بیتاب اور بے چین ہو، کیا اس کو یہ فکر ہوگی کہ فلاں کو نزلہ ہے یا نہیں؟ فلاں کو کھانسی ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ اس کو اپنی فکر پڑی ہوئی ہے، وہ اپنے درد سے بے چین ہے۔ جب تک اس درد سے اس کو سکون نہ مل جائے، وہ اس وقت تک دوسرے کی طرف کیسے دیکھے!

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب لا یخطب علی خطبة أخیه حتی ینکح أو یدع، رقم: ۴۷۴۷، صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم الظن والتجسّس والتنافس والتناجش، رقم: ۴۶۴۶، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الظن، رقم: ۴۲۷۱، مسند أحمد، رقم: ۷۵۲۰

اپنے عیوب کی فکر کریں

اگر ہم لوگوں کو اپنے عیب کی فکر ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جا کر میرا کیا انجام ہونا ہے؟ آخرت میں میرا کیا حال ہوگا؟ جب یہ فکر پیدا ہو جائے تو پھر دوسرے کی طرف نگاہ پڑ ہی نہیں سکتی۔ بہادر شاہ ظفر مرحوم فرماتے ہیں۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہے ڈھونڈتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

جب تک اپنی برائیوں سے بے خبر تھے، اس وقت تک یہ حال تھا کہ کبھی اس کی طرف دیکھ رہے ہیں، کبھی اس کی طرف دیکھ رہے ہیں، اور انہی کو برا سمجھ رہے ہیں، لیکن جب اپنے عیوب پر نگاہ پڑی تو کوئی برا نہ رہا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی حالت

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے عیوب کی فکر عطا فرماتے ہیں، ان کو تو ساری دنیا اچھی نظر آتی ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو اس صدی کے مجدّد تھے، وہ فرماتے ہیں:

''میں تمام مسلمانوں کو اپنے آپ سے حالاً اور تمام کافروں کو اپنے آپ سے مآلاً افضل سمجھتا ہوں''

یعنی مسلمان تو سارے کے سارے اس وقت بھی مجھ سے افضل ہیں اور کافروں کو بھی آئندہ کے اعتبار سے افضل سمجھتا ہوں کہ شاید اللہ تعالیٰ ان کو کسی وقت ایمان کی توفیق دیدے اور مآل اور انجام کے اعتبار سے وہ بھی مجھ سے آگے نکل جائیں، اس لئے میں ان کو بھی افضل سمجھتا ہوں۔ جب اتنے بڑے آدمی کا یہ حال ہے تو ہما شما کس شمار قطار میں ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ اپنے عیوب کی فکر عطا فرماتے ہیں وہ ساری دنیا کو اپنے سے افضل سمجھتا ہے، وہ دوسروں کے عیوب کی فکر میں نہیں رہتا ہے۔

لہٰذا اپنی فکر کرو کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ کیا عمل کر رہے ہو؟ کیا کیا عیب تمہارے اندر موجود ہیں؟ کیا کیا خرابیاں تمہارے اندر پائی جاتی ہیں؟ ان کو دور کرنے کی فکر کرو۔ دوسروں کی فکر کرنا، دوسروں کا تجسس کرنا، ان کی ٹوہ میں لگنا، دوسروں کے بارے میں بدگمانی اور غیبت کرنا حرام ہے، اور اس کے ذریعہ ہم اپنی دنیا بھی خراب کر رہے ہیں اور آخرت بھی خراب کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے فضل و کرم سے ان برائیوں سے محفوظ رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مذموم بدگمانی کونسی؟

بہر حال، اس بدگمانی اور تجسس کے بارے میں حضرت والا کے ملفوظات ہیں:
فرمایا کہ بدگمانی تکبر سے پیدا ہوتی ہے۔ مذموم بدگمانی وہ ہے جو خود لائی جائے، باقی جو وسوسہ خود آئے وہ مذموم بدگمانی نہیں جب تک اس پر عمل نہ ہو، اور عمل کی صورت یہ ہے کہ یا دل سے اس پر اعتقاد جازم کرلے یا زبان سے کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کردے، جب تک وسوسہ پر عمل نہ ہو اس وقت تک نہ اس پر مواخذہ ہے نہ وہ مضر ہے۔ (۱)

ایک شخص کے طرزِ عمل سے اس کے بارے میں آپ کو کچھ شبہ ہوا، اور دل میں وسوسہ آیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فلاں کام کیا ہوگا، اگر دل میں یہ وسوسہ خود بخود آیا اور خود بخود دل میں شبہ پیدا ہوا تو اس پر کوئی گناہ نہیں، کیونکہ اس میں آپ کے اختیار کو کوئی دخل نہیں۔

دوسرے کے عمل کی تاویل کریں

مثلاً رمضان کے دن میں آپ نے ایک شخص کو ہوٹل سے نکلتے دیکھا، آپ کے دل میں خیال آئے گا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے روزہ توڑا ہے، اب یہ جو خیال دل میں خود بخود پیدا ہوا، یہ کوئی گناہ نہیں۔ البتہ آدمی کو چاہئے کہ حتی الامکان اس کے اس عمل کو صحیح محمل پر محمول کرے۔ مثلاً یہ کہ یہ شخص جو ہوٹل سے نکل رہا ہے، شاید یہ اپنے بیمار کے لئے کھانا خریدنے گیا ہوگا یا کسی آدمی سے بات کرنے کے لئے ہوٹل کے اندر گیا ہوگا۔ یہ احتمالات بھی موجود ہیں، لہٰذا دل میں یہ احتمالات پیدا کرے کہ شاید ایسا ہوا ہو، زیادہ تحقیق میں پڑنے کے ہم مکلّف نہیں۔

یہ بدگمانی حرام ہے

لہٰذا خود بخود دل میں جو خیال آیا تھا، وہ گناہ نہیں، اس پر مؤاخذہ بھی نہیں، لیکن اگر دل میں جو خیال پیدا ہوا تھا، اس پر آپ نے پہلے اعتقاد اور یقین کرلیا کہ یہ صاحب ہوٹل میں روزہ توڑنے کے لئے داخل ہوئے تھے اور کھانا کھا کر باہر آئے ہیں، اس کا یقین کرلیا اور دوسرے احتمالات کی طرف دھیان نہیں کیا، اور پھر اس سے آگے بڑھ کر یہ کیا کہ دوسروں کے سامنے بیان کرنا شروع کردیا کہ میں نے خود اس کو روزہ میں کھاتے ہوئے دیکھا ہے، حالانکہ اس نے صرف یہ دیکھا تھا کہ وہ شخص ہوٹل سے

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ۱۵۳

نکل رہا تھا، کھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن دوسروں کے سامنے اس طرح بیان کر رہا ہے جیسے خود اس نے کھاتے ہوئے دیکھا تھا، اور سو فیصد یقین کے ساتھ دوسروں سے کہہ رہا ہے کہ یہ شخص روزہ خور ہے، یہ بدگمانی حرام اور ناجائز ہے۔

اس لئے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ دل میں خود بخود کسی کے بارے میں کوئی گمان پیدا ہو جانا، یہ کچھ گناہ نہیں، لیکن اس گمان پر سو فیصد یقین کر بیٹھنا اور پھر اس یقینی انداز میں اس کا تذکرہ کرنا گناہ ہے۔ اس لئے حضرت فرماتے ہیں:

''مذموم بدگمانی وہ ہے جو خود لائی جائے، باقی جو وسوسہ خود آئے وہ مذموم بدگمانی نہیں جب تک اس پر عمل نہ ہو، اور عمل کی صورت یہ ہے کہ یا دل سے اس پر اعتقاد جازم کر لے (یعنی یقین کر لے، پہلے صرف گمان تھا پھر اس گمان کو یقین سے تبدیل کر دیا) یا زبان سے کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کر دے''

بدگمانی کے دو درجے

گویا کہ بدگمانی کے دو درجے ہوئے، ایک درجہ غیر اختیاری ہے، وہ یہ کہ اپنے کسی عمل کے بغیر دل میں کسی کی طرف سے کوئی گمان پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔ دوسرا درجہ اختیاری ہے، وہ یہ کہ جو گمان دل میں پیدا ہوا، اس گمان کو لے کر بیٹھ گیا، اور اس سے مختلف باتیں نکال رہا ہے، اور اس پر یقین کر رہا ہے، یا اس کا تذکرہ دوسروں کے سامنے کر رہا ہے۔ یہ دوسرا درجہ حرام ہے، اس سے بچنا ضروری ہے۔

بدگمانی کا منشا کبر ہے

آگے حضرت والا نے بدگمانی کا علاج بیان فرمایا:

''جب کسی سے بدگمانی پیدا ہو جس کا منشا کبر ہے، تو اپنے عیوب کو پیشِ نظر کر لیا کرو''(۱)

یہ اس کا علاج ہے۔ یعنی دوسرے کے بارے میں دل میں برا گمان آیا، دل میں برا خیال آیا، بدگمانی پیدا ہوئی، اگرچہ وہ غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں، لیکن یہ غیر اختیاری بدگمانی بھی اگر دل میں زیادہ دیر جمی رہے گی تو گناہ کے اندر مبتلا کر دے گی، یا تو دل میں یقین پیدا کر دے گی یا دوسروں کے سامنے اس کا تذکرہ کرا دے گی۔ اس لئے اس کے علاج کی بھی فکر کرنی چاہئے۔

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ۱۵۳

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چنگاری آکر گر پڑی، اور آپ نے اس کو بجھایا نہیں، تو وہ چنگاری کسی بھی وقت شعلہ بن جائے گی۔ اسی طرح غیر اختیاری گمان کا بھی علاج کرنا ضروری ہے، وہ علاج یہ ہے کہ اپنے عیوب کو پیش نظر کر لے کہ میرے اندر تو فلاں فلاں عیب ہیں تو دوسرے کو کیا دیکھوں، اور اس کے بارے میں کیا گمان کروں، میری حالت خود خراب ہے، میرے اندر فلاں عیب ہے، میرے اندر فلاں عیب ہے۔ لہٰذا اپنے عیوب کے استحضار کرنے سے یہ بیماری رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی۔

تجسّس اور بدگمانی کی انتہاء ''غیبت'' ہے

آگے حضرت والا نے فرمایا:

> ''بدگمانی، تجسّس، غیبت، ان سب کا منشا کبر ہے، بلکہ متکبر کی غرض پوری طرح غیبت ہی سے حاصل ہوتی ہے، بدگمانی اور تجسّس سب اسی کے مقدمات ہیں۔ اگر کوئی شخص تجسّس اور بدگمانی کرے، مگر غیبت نہ کرے تو اس کا مقصود حاصل نہ ہوگا، اس لئے وہ بدگمانی اور تجسّس کو بھی ترک کر دے گا۔ پس غیبت سب سے اشد ہے''(۱)

یعنی یہ تینوں بیماریاں، بدگمانی، تجسّس اور غیبت، یہ سب ایک اور بیماری سے پیدا ہوتی ہیں، وہ ہے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، جب آدمی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے تب ہی وہ دوسرے سے بدگمان ہوتا ہے، اور تب ہی دوسرے کی ٹوہ میں لگتا ہے کہ اس کا کوئی عیب میرے ہاتھ آ جائے، اور تب ہی اس کی غیبت کرتا ہے۔ اور اصل ان تینوں میں سے غیبت ہے، اور متکبر کو اصل مزہ تو غیبت کرنے میں آتا ہے، لیکن غیبت کی تمہید کے طور پر وہ متکبر بدگمانی اور تجسّس کو استعمال کرتا ہے کہ جب میں بدگمانی اور تجسّس کروں گا تو اس کے نتیجے میں غیبت کرنے کا موقع ملے گا۔ لہٰذا بدگمانی اور تجسّس غیبت کے مقدمات ہیں، کیونکہ تجسّس کے نتیجے میں کوئی عیب ظاہر ہوگا تو اس کو لوگوں کے سامنے بیان کروں گا اور بدگمانی کے نتیجے میں نقص دل میں آئے گا تو اس کو لوگوں کے سامنے بیان کروں گا۔ لہٰذا آخری نتیجہ تو غیبت ہے جو متکبر کی اصل غرض ہے۔ ایسا آدمی ملنا مشکل ہے جو بدگمانی کرے اور تجسّس بھی کرے لیکن پھر آگے غیبت نہ کرے، کیونکہ وہ بدگمانی اور تجسّس اسی لئے کر رہا ہے کہ وہ غیبت کا مزہ لینا چاہتا ہے۔ اصل مقصود تو غیبت ہے، یہ بدگمانی اور تجسّس تو درمیان کے آلے اور واسطے ہیں۔ لہٰذا ان سب بیماریوں میں سب سے زیادہ اشد اور قابلِ توجہ بیماری ''غیبت'' ہے۔ اگر غیبت چھوٹ گئی تو پھر بدگمانی اور تجسّس بآسانی چھوٹ جائیں گی۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ۱۵۳

بدگمانی میں گناہ کا درجہ

آگے حضرت والا نے فرمایا:

''بدگمانی میں گناہ کا درجہ تو وہ ہے جس کا ذہن میں اعتقاد راسخ ہو، اگر راسخ نہ ہو تو مضر نہیں، مگر علاج اس کا بھی ضروری ہے، وہ یہ کہ اپنے عیوب کو پیشِ نظر رکھے، پھر اگر علاج کے بعد کچھ اثر رہے تو وہ مذموم نہیں'' (۱)

یعنی بدگمانی میں گناہ اس وقت ہے جب اس بدگمانی پر یقین کر لے، لیکن اگر یقین نہ کرے بلکہ محض احتمال کے درجے میں دل کے اندر موجود ہے کہ شاید اس نے یہ کام کیا ہو تو وہ مضر نہیں اور اس غیر اختیاری احتمال پر گناہ بھی نہیں۔ مثلاً رمضان میں کسی کو دن میں ہوٹل سے نکلتا ہوا دیکھا تو دل میں یہ خیال آیا کہ شاید اس نے روزہ توڑ دیا ہو، لیکن اس پر یقین نہیں کیا، یہ مضر تو نہیں لیکن علاج اس کا بھی ضروری ہے، کیونکہ یہ خیال ابھی چنگاری کے درجے میں ہے، ابھی شعلہ نہیں بنی، لیکن کسی بھی وقت شعلہ بن کر تمہیں خاکستر کر دے گی۔ لہٰذا اس کا بھی علاج کرے، وہ یہ کہ اپنے عیوب کو پیشِ نظر رکھے۔ البتہ علاج کے بعد اب بھی تھوڑا بہت بدگمانی کا خیال دل میں آتا ہے تو وہ مذموم نہیں، کیونکہ یہ اختیار سے باہر ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین پر صحیح طور پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بدگمانی اور تجسّس اور غیبت سے بچنے کے تین علاج

حضرت والا نے فرمایا:

''بدگمانی، تجسّس اور غیبت کا علاج یہ ہے کہ تواضع اختیار کرو، تکبر کو دل سے نکالو، اور جب تک اصلی مرض زائل نہ ہو اس وقت تک غیبت کا فوری علاج یہ کرو کہ (۱) فکر و تأمل سے کام لو (۲) اور کوتاہی پر جرمانہ مقرر کرو (۳) اور وسوسہ بدگمانی کے وقت توجہ کو ذکر اللہ وغیرہ کی طرف منعطف کرو'' (۲)

اس ملفوظ میں حضرت والا نے دو علاج تجویز فرمائے ہیں۔ ایک علاج پائیدار، دوسرا علاج وقتی اور فوری۔ پھر فوری اور وقتی علاج کی بھی تین صورتیں بیان فرمائیں۔ پہلا علاج یہ ہے کہ فکر و تأمل سے کام لو۔ یعنی بات کرنے سے پہلے سوچو کہ یہ بات زبان سے نکالوں یا نہ نکالوں، پہلے تو لو پھر بولو۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۴ (۲) انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۴

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا سکوت

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے جب کوئی شخص سوال کرتا تو آپ خاموش رہتے، فوراً جواب نہیں دیتے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت! لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں لیکن آپ کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ جواب میں فرمایا:

"حَتّٰی أَعْرِفَ أَنَّ الْفَضْلَ فِی السُّکُوْتِ أَوْ فِی الْکَلَامِ"

''یعنی میں اس وقت تک خاموش رہتا ہوں جب تک میرے سامنے یہ واضح نہ ہو جائے کہ بہتری بولنے میں ہے یا خاموش رہنے میں ہے''

یہ درحقیقت اس مقولے پر عمل ہو رہا تھا کہ ''پہلے تولو پھر بولو''

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا زبان کو سزا دینا

روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنی زبان کو بیٹھے ہوئے مروڑ رہے تھے۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضرت! آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ جواب دیا:

"اِنَّ هٰذَا أَوْرَدَنِیَ الْمَوَارِدَ"

''اس زبان نے مجھے ہلاکت کی جگہوں میں ڈالا ہے''(۱)

یہ کون کہہ رہا ہے؟ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ''صدیق'' کون ہوتا ہے؟ نبی کا آئینہ، وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس زبان نے مجھے ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ فکر عطا فرماتے ہیں، وہ اس طرح زبان کا استعمال کرنے میں احتیاط اور اس کا استحضار رکھنے کی تدبیر کرتے ہیں۔

لہٰذا اگر انسان زبان کو صحیح استعمال کرے تو بڑی اچھی چیز ہے، اور اگر اس کو غلط استعمال کرے تو یہ بڑی خراب چیز ہے۔ یہی زبان جنت میں لے جانے والی ہے، اور یہی زبان جہنم میں ڈالنے والی ہے۔ اگر دل کے یقین کے ساتھ زبان سے یہ کلمہ "أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ" پڑھ لیا، تو کافر جہنم سے جنت میں پہنچ جائے گا۔ اور اگر کسی مسلمان نے اس زبان سے کفر بول دیا تو وہ مسلمان سیدھا جہنم میں پہنچ جائے گا۔ حدیث شریف میں ہے کہ لوگ اپنی زبان کے کرتوت کی وجہ سے جہنم کے اندر اوندھے منہ ڈالے جائیں گے۔ (۲)

---

(۱) مؤطا مالك، الكتاب الجامع، باب ما جاء فيما يخاف من اللسان، رقم: ۱۵۶۷

(۲) سنن الترمذی، كتاب الإيمان عن رسول الله، باب ما جاء في حرمة الصلاة، رقم: ۲۵۴۱، سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب كف اللسان في الفتنة، رقم: ۳۹۶۳، مسند أحمد، رقم: ۲۱۰۰۸

اس زبان کا بے محابا استعمال کہ جو منہ میں آیا بک دیا، جو سمجھ میں آیا کہہ گزرے، اس کو چھوڑ دو اور بولنے سے پہلے سوچنے کی عادت ڈالو کہ یہ زبان سے جو کلمہ نکال رہا ہوں یہ کہیں مجھے ہلاکت میں تو نہیں ڈال دے گا۔

خاموش رہنے کا مجاہدہ

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے، وہ بہت بولتے تھے، آتے ہی بولنا شروع کر دیتے اور پھر کوئی انتہا نہیں ہوتی تھی۔ والد صاحب برداشت کرتے تھے۔ چند روز کے بعد ان صاحب نے کہا کہ حضرت! میں آپ سے بیعت ہونا چاہتا ہوں اور اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے فرمایا کہ اگر تم اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہتے ہو تو پہلا کام یہ کرو کہ اس زبان پر تالا لگاؤ، یہ زبان جو قینچی کی طرح چل رہی ہے اس کو روکو، بس یہی تمہارا وظیفہ اور علاج ہے۔ چنانچہ اس کے بعد جب وہ مجلس میں آتے تو خاموش بیٹھے رہتے اور اسی علاج کے ذریعے ان کی اصلاح ہوگئی۔

غیبت ہونے پر جرمانہ

اس لئے بولنے میں فکر اور تأمل سے کام لو کہ میں جو بول رہا ہوں یہ غیبت ہے یا جھوٹ ہے، جائز ہے یا ناجائز ہے، حرام ہے یا حلال ہے، اس کو پہلے سوچو، اور اگر تأمل اور غور وفکر کرنے کے باوجود اور توبہ واستغفار کرنے کے باوجود پھر بھی کوتاہی ہو جائے اور غیبت سرزد ہو جائے تو پھر اپنے اُوپر جرمانہ مقرر کرو کہ آئندہ جب کبھی غیبت ہوگی تو اتنے پیسے ادا کروں گا۔ لیکن پیسے اتنے ہونے چاہئیں جن کو نکالنے میں تھوڑی سی تکلیف ہو، اتنا کم نہ ہو جیسے علی گڑھ کالج میں تھا۔

نماز چھوڑنے پر جرمانہ

علی گڑھ کالج میں تمام طلبہ کو مسجد میں نماز پڑھنا ضروری تھا۔ اگر کوئی حاضر نہ ہوتا تو فی نماز چار آنے جرمانہ ادا کرنا ضروری ہوتا۔ چنانچہ جو طلبہ بڑے بڑے رئیسوں کے بیٹے ہوتے وہ مہینے کے شروع میں ہی پورے مہینے کا جرمانہ جمع کرا دیتے۔ لہٰذا جرمانہ ایسا ہونا چاہئے جس کے ادا کرنے میں تھوڑی سی مشقت بھی ہو۔ اور یا یہ جرمانہ مقرر کرو کہ جب کبھی غیبت ہوگی تو چار رکعتیں نفل پڑھوں گا۔ اس کے نتیجے میں انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ اس گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرما دیں گے۔

اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاؤ

ایک علاج یہ بھی ہے کہ جب کبھی دوسرے کی طرف سے بدگمانی کا خیال آئے تو اپنی توجہ کو ذکر اللہ کی طرف منعطف کردو، مثلاً استغفر اللہ پڑھنا شروع کردو، کلمہ پڑھنا شروع کردو، کوئی تسبیح پڑھنا شروع کردو اور اپنی توجہ اس طرف سے پھیر لو۔

تواضع پیدا کریں

یہ تو وقتی علاج تھے، مستقل علاج یہ ہے کہ اپنے اندر تواضع پیدا کرو، کیونکہ جیسا کہ پہلے عرض کیا تھا کہ یہ ساری بیماریاں تکبر کے ہونے سے اور تواضع کے نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ دل میں اپنی بڑائی ہے کہ جو میں سوچتا اور سمجھتا ہوں، وہ درست ہے، میں بڑا عقلمند ہوں، میں بڑا عالم ہوں، میں بڑا پارسا ہوں، یہ سب تکبر کے خیالات ہیں جو انسان کے اندر غیبت، بدگمانی اور تجسس کا داعیہ پیدا کرتے ہیں۔ ان سب کا علاج یہ ہے کہ اپنے اندر تواضع پیدا کرو۔

اپنی حقیقت میں غور کریں

اب تواضع کیسے پیدا ہو؟ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی شیخ کا دامن پکڑلو، کیونکہ شیخ کے سامنے رگڑے کھائے بغیر کام نہیں بنتا، اس کی چپت کھاؤ، اس کی ڈانٹ کھاؤ، اس کے ساتھ لگے لپٹے رہو، اس کی نگاہوں کو برداشت کرو، اس کے خلافِ طبع امور کو برداشت کرو، تو انشاء اللہ رفتہ رفتہ تواضع پیدا ہو جائے گی۔ اور جب تک شیخ نہ ملے یا شیخ سے تعلق قائم نہ ہو، اس وقت تک کم از کم اتنا کرو کہ اپنی حقیقت کو سوچا کرو کہ میری حقیقت کیا ہے؟ میری ذات میں کوئی کمال ہے؟ جو کچھ میرے اندر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ اگر صحت ہے وہ بھی اللہ کی عطا ہے، اگر میرے اندر حسن ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اگر علم میرے پاس ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اگر پیسہ ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اور وہ جب چاہے ان کو واپس لے لے۔ ایک آدمی بڑا صحت مند اور تندرست ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ چاہیں اس کی صحت کو واپس لے لیں۔

ایک صاحب کی قوت اور کمزوری

میرے ایک عزیز تھے، جن کا انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی قوت دی تھی کہ برف کی سِل کو ایک مُکا مار کر توڑ دیتے تھے۔ تربوز کو کبھی چھری سے نہیں کاٹتے تھے، بس ہاتھ مارا اور توڑ دیا۔

آخر عمر میں جب بیمار ہوئے تو میں ان کی عیادت کے لئے گیا۔ دیکھا کہ بستر پر لیٹے ہوئے ہیں اور ہاتھ اُوپر اُٹھانے کی طاقت بھی نہیں تھی۔ جب مجھے دیکھا اور ملاقات ہوئی تو میں نے دل میں کہا کہ یہ وہی "حامد" ہے جو برف کی سل اپنے ہاتھ سے توڑ دیا کرتا تھا، اور اب یہ حالت ہے کہ ہاتھ خود سے نہیں اُٹھا سکتا۔ لہٰذا انسان کس بات پر ناز اور فخر کرے۔

علم پر ناز نہ کریں

مولوی کو علم کا بہت ناز ہوتا ہے کہ میں بڑا عالم ہوں، مجھے بہت کچھ آتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جب چاہیں اس علم کو سلب فرمالیں۔ چنانچہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ دکھا دیتے ہیں کہ کاغذ قلم لے کر لکھنے بیٹھے تو اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھیں، جبکہ ہمیں اپنے لکھنے پر ناز ہے، ہم بڑے اچھے اہل قلم ہیں۔ بعض اوقات اپنے نام کے ہجے نہیں آتے کہ کس طرح اپنا نام لکھیں۔ لہٰذا انسان کس چیز پر ناز کرے، کس چیز پر اکڑے، کس چیز پر بھروسہ کرے، جو کچھ حاصل ہے، وہ سب ان کی عطا ہے، وہ جب چاہیں سلب کرلیں۔ جس دن یہ بات دل میں بیٹھ گئی اور اپنی بڑائی کا احساس دل سے نکل گیا کہ میں تو کچھ نہیں ہوں، ذرّہ ناچیز ہوں، بے مقدار ہوں، ہیچ در ہیچ ہوں، بس اس دن انشاء اللہ تواضع پیدا ہو جائے گی۔

آڑ میں بیٹھ کر باتیں سننا

آگے ارشاد فرمایا:

"آڑ میں بیٹھ کر کسی کی باتیں سننا بھی تجسّس میں داخل ہے، جس کو آڑ میں بیٹھنا ہے تو زبان سے کہہ دینا چاہئے کہ میں بیٹھا ہوں یا اس کے سامنے بیٹھنا چاہئے، غرض کسی طرح اپنے بیٹھنے کی اطلاع کردے"(۱)

مثلاً دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں، اب آپ نے آڑ میں جا کر ان کی باتیں سننا شروع کردیں، یہ گناہ اور حرام ہے اور تجسّس کے اندر داخل ہے۔ لہٰذا جو شخص آڑ میں بیٹھا ہو وہ باتیں کرنے والوں کو بتادے کہ میں یہاں پردے میں بیٹھا ہوں، تاکہ اگر وہ راز کی باتیں کرنا چاہتے ہیں تو نہ کریں، یا ان کے سامنے آکر بیٹھ جائے۔

(۱) انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۴

ہمارا طریقۂ زندگی

آج ہمارے معاشرے میں سب کام اُلٹے ہو رہے ہیں۔ ایسے موقع پر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو چھپالیں، اور باتیں کرنے والوں پر یہ ظاہر نہ کریں کہ میں یہاں پر موجود ہوں، اور آرام سے بیٹھ کر ان کی باتیں سنوں۔ یاد رکھئے! یہ سب تجسس میں داخل ہے اور حرام ہے، ناجائز ہے۔ دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ تم اپنے وجود کو ان پر ظاہر کر دیتے تاکہ وہ لوگ سوچ سمجھ کر باتیں کرتے۔

لڑائی جھگڑے کی بنیاد

ہماری شریعت نے ہمیں ایسی ایسی باتیں بتائی ہیں کہ اگر واقعۃً ہم لوگ اس پر عمل کرلیں تو آپس میں کوئی جھگڑا پیدا ہی نہ ہو اور معاشرے میں کوئی فساد رونما ہی نہ ہو۔ جہاں کہیں فتنہ وفساد اور جھگڑا ہوتا ہے وہ شریعت کی کسی نہ کسی تعلیم کو چھوڑنے کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ شریعت نے فتنہ اور فساد اور جھگڑے کے راستے پر ایسے پہرے بٹھائے ہیں کہ اگر ہم ان پر عمل کرلیں تو پھر کوئی جھگڑا ہی نہ ہو۔ چنانچہ ایک طرف تو نبی کریم ﷺ نے حدیث شریف میں یہ حکم دیا:

((لَا يَتَنَاجَى اثْنَانِ دُوْنَ ثَالِثٍ))(۱)

یعنی اگر محفل میں تین آدمی ہیں، تو ان میں سے دو آدمیوں کو یہ نہیں کرنا چاہئے کہ آپس میں علیحدہ ہو کر اس طرح باتیں کرنے لگیں کہ تیسرا آدمی اکیلا رہ جائے، ایسا کرنا جائز نہیں، کیوں؟ اس لئے کہ تیسرے کو یہ احساس اور خیال ہوگا کہ انہوں نے مجھے اکیلا کر دیا اور میرے بارے میں کوئی بات کر رہے ہیں اور مجھ سے وہ بات چھپانا چاہتے ہیں، اس سے اس کی دل شکنی ہوگی۔ اس لئے دو آدمی علیحدہ ہو کر سرگوشی نہ کریں۔

ایسی جگہ پر مت جائیں

اور دوسری طرف یہ حکم دیا کہ اگر پہلے سے دو آدمی سرگوشی کر رہے ہیں تو تیسرے کو چاہئے کہ وہ وہاں نہ جائے، تاکہ ان کی باتوں میں خلل واقع نہ ہو، ان کو اپنی باتیں کرنے دو، تم بیچ میں جا کر کیوں

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الإستئذان، باب لا يتناجى اثنان دون الثالث، رقم: ۵۸۱٤، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب تحريم مناجاة الإثنين دون الثالث، رقم: ٤٠٥٢، سنن الترمذی، کتاب الأدب عن رسول الله، باب ما جاء لا يتناجى اثنان دون ثالث، رقم: ۲۷۵۱، سنن ابن ماجه، کتاب الأدب، باب لا يتناجى اثنان دون الثالث، رقم: ۳۷٦۵

گھستے ہو؟ یہ ساری باتیں حضورِ اقدس ﷺ نے ہمیں بتادیں، لیکن ہم نے بس چند چیزوں کا نام دین رکھ لیا، نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا، بس قصہ ختم، دین کو اسی میں منحصر سمجھ لیا، زندگی گزارنے کے جو آداب حضورِ اقدس ﷺ نے ہمیں بتائے ہیں، ان کو قطعی طور پر دین سے خارج ہی کر دیا، حالانکہ یہ بھی حضورِ اقدس ﷺ کا حکم ہے۔

فون پر دوسروں کی باتیں سننا

یا مثلاً ٹیلیفون ہے۔ اب آپ نے ٹیلیفون کرنے کے لئے ریسیور اُٹھایا اور جب کان سے لگایا تو اس میں دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں، کسی دوسرے کی لائن آپ کے فون سے مل گئی تھی، آپ نے ان کی باتیں سننا شروع کر دیں، حالانکہ آپ کے لئے فون پر ان کی باتیں سننا جائز نہیں، بلکہ آپ فون بند کر دیں۔ اگر آپ ان کی باتیں سنیں گے تو وہ تجسس میں داخل ہے جو ناجائز اور حرام ہے۔

دوسروں کے خط پڑھنا

یا مثلاً دوسرے کا خط آپ کے ہاتھ لگ گیا، تو آپ کے لئے اس کی اجازت کے بغیر اس کا خط پڑھنا جائز نہیں۔ یہ بھی تجسس کے اندر داخل ہے اور گناہ ہے۔

تجسّس کی جائز صورت

بعض اوقات انتظامی طور پر "تجسس" ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی ادارے کا سربراہ اور ذمہ دار ہے، وہ اگر تجسس نہ کرے تو ادارے میں فساد پھیل جائے۔ مثلاً ذمہ دار کا یہ تجسس کرنا کہ کہیں ہمارے زیرِ انتظام ادارے میں کوئی ایسا جرم تو نہیں ہو رہا ہے جو خطرناک قسم کا ہو۔ اس حد تک تجسس کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اب پولیس کے محکمے کو دیکھ لیں وہ تو تجسس ہی کے کام کے لئے بنایا گیا ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ رات کو مدینہ منورہ کی گلیوں میں گشت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ گشت کے دوران دیکھا کہ ایک گھر سے گانے کی آواز آ رہی ہے اور کچھ گلاسوں کے کھڑکنے کی بھی آواز آئی۔ ان کو خیال ہوا کہ شاید یہاں پینے پلانے کا شغل ہو رہا ہے اور گانا بجانا بھی ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر تو

آپ سب سنتے رہے، پھر دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گئے، اور دیکھا کہ وہاں شراب پی جارہی ہے اور گانا بجانا ہو رہا ہے، چنانچہ آپ نے رنگے ہاتھوں ان کو پکڑ لیا۔ ان کا جو سربراہ تھا، وہ بڑا ہوشیار تھا، اس نے پوچھا کہ آپ نے ہمیں کیوں پکڑا؟ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم شراب پی رہے تھے اور گانا بجانا کر رہے تھے، تم مجرم ہو، اس لئے تمہیں پکڑ لیا۔ ان کے سربراہ نے کہا کہ ہم نے تو ایک ہی گناہ کیا تھا اور آپ نے کئی گناہ کیے۔ ایک گناہ تو آپ نے یہ کیا کہ آپ نے تجسس کیا اور ہماری ٹوہ میں لگے کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ دوسرا گناہ یہ کیا کہ اجازت کے بغیر ہمارے گھر میں داخل ہوئے اور اجازت کے بغیر دوسرے کے گھر میں داخل ہونا جائز نہیں۔ تیسرا گناہ یہ کہا کہ دیوار پھاند کر داخل ہوئے، حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا﴾ (۱)

"یعنی گھروں میں دروازے کے ذریعہ آؤ"

لہٰذا ہم نے تو صرف ایک گناہ کیا تھا اور آپ نے تین گناہ کیے۔

آپ رضی اللہ عنہ کا استغفار کرنا

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کی یہ بات سن کر تینوں گناہوں پر استغفار کیا کہ کہیں واقعی مجھ سے یہ گناہ سرزد نہ ہو گئے ہوں، اس لئے میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہتا ہوں۔ (۲)

ہم جیسا ہوتا تو اس شخص کو دو تھپڑ مارتا کہ کم بخت ایک طرف تو یہ گناہ کرتا ہے اور دوسری طرف میرے اُوپر یہ اعتراض کرتا ہے، چوری اور سینہ زوری۔ لیکن چونکہ یہ حضرات ساتھ ساتھ اپنے نفس کا بھی علاج کیا کرتے تھے، اس لئے انہوں نے یہ سوچا کہ چونکہ میری ذات پر اعتراض آیا ہے، تو اس کی مدافعت نہ کرنی چاہئے، بلکہ اس کے اندر جس خرابی کا احتمال ہے، اس کا تدارک کرنا چاہئے۔ اس لئے فوراً استغفار کیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فیصلہ

پھر یہ مسئلہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کے سامنے پیش کیا کہ یہ شخص مجھے یہ کہہ رہا ہے کہ میں نے تین گناہ کیے۔ آیا واقعۃً میں نے تجسس کا گناہ کیا؟ اور یہ تجسس کرنا میرے لئے گناہ تھا یا نہیں تھا؟ اور میرا اس طرح دوسرے کے گھر میں داخل ہونا جائز تھا یا نہیں تھا؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس جماعت نے مشورہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ جو ذمہ دار آدمی ہے، اگر اس کو یہ اندیشہ ہو کہ یہ فساد ایسا

(۱) البقرۃ: ۱۸۹ (۲) کنز العمال (۱۶۷/۲)

ہے جو معاشرے میں پھیل جائے گا اور لوگوں کے اندر اس کے برے اثرات مرتب ہوں گے تو اس صورت اس ذمہ دار کے لئے تجسس کرنا بھی جائز ہے، اور اجازت کے بغیر اندر داخل ہونا بھی اس کے لئے جائز ہے، اور دیوار پھاندنا بھی جائز ہے۔لیکن اگر متعدی خرابی کا اندیشہ نہ ہو، مثلاً ایک آدمی اپنے گھر میں کوئی ایسا عمل کر رہا ہے جس کا فساد اس کی ذات کی حد تک محدود ہے، اس کے برے اثرات دوسروں تک متعدی نہیں ہوں گے، تو اس صورت میں ذمہ دار اور سربراہ کو بھی تجسس کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ فقہاء کرام نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے کہ کن حالات میں تجسس جائز ہے اور کن حالات میں تجسس جائز نہیں۔

فقہاء کا قولِ فیصل

امام خصّاف رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''ادب القضاء'' ہے، اس کی شرح علامہ صدر الشہید رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے۔اس میں اس موضوع پر بہت طویل بحث کی ہے اور فقہاء کرام کا اختلاف نقل کیا ہے کہ کس حالت میں تجسس جائز ہے اور کس حالت میں جائز نہیں۔اس اختیار میں قولِ فیصل یہ ہے کہ جہاں کسی متعدی برائی کا اندیشہ ہو تو وہاں سربراہ کے لئے سب کچھ کرنا جائز ہے، تجسس کرنا بھی جائز، دیوار پھاندنا بھی جائز، اجازت کے بغیر اندر گھسنا بھی جائز۔اور جہاں متعدی برائی کا اندیشہ نہ ہو بلکہ ایک شخص کا ذاتی عمل ہے، وہ اپنے گھر میں بیٹھا کر رہا ہے تو اس وقت سربراہ کے لئے بھی تجسس کرنا جائز نہیں۔

دار العلوم کراچی کی تھوڑی سی ذمہ داری ہمارے سپرد بھی ہے۔اس کی وجہ سے ہمیں یہ تجسس کرنا پڑتا ہے کہ دار الاقامہ میں کیا ہو رہا ہے، طلبہ کن سرگرمیوں میں دلچسپی لے رہے ہیں۔یہ اس وقت جائز ہے جب کسی متعدی خرابی کا اندیشہ ہو، ورنہ سکوت افضل ہے۔

اپنے جاگنے کی اطلاع کر دے

آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اسی طرح ایک آدمی سونے کو لیٹ گیا، اور دوسروں کو یہ خیال ہوا کہ یہ سو گیا ہے اور وہ آپس میں باتیں کرنے لگیں، مگر یہ جاگ رہا تھا تو اس کو چاہئے کہ ان کو اطلاع کر دے کہ میں جاگ رہا ہوں، البتہ اگر وہ لوگ اسی کے متعلق باتیں کر رہے ہوں اور اس کو ضرر پہنچانا چاہتے ہوں تو تجسس کے ساتھ ان کی گفتگو سننا جائز ہے''(۱)

آج کل اُلٹا معاملہ ہوتا ہے کہ جاگنے والا اپنے آپ کو اور زیادہ سوتا ہوا ظاہر کرتا ہے تاکہ ان

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۴

کی گفتگو کے ذریعہ تمام رازوں کا پتہ چل جائے اور بعد میں وہ اپنی مہارت اور اُستادی دکھائے کہ تم نے جو جو باتیں کیں اس کا ہمیں پتہ چل گیا ہے۔ حالانکہ شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں، جاگنے والا بتادے کہ میں جاگ رہا ہوں، یہ بھی شریعت کا حکم ہے۔ البتہ اگر وہ گفتگو کرنے والے اسی کے متعلق گفتگو کررہے ہوں اور اس کو نقصان پہنچانا چاہتے ہوں تو پھر اس طرح چپکے چپکے باتیں سننا جائز ہے تاکہ ان کے شر سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

زبان دانی کی اطلاع کردے

آگے حضرت والا فرماتے ہیں:

''نیز اگر دو شخص انگریزی یا عربی میں گفتگو کررہے ہوں، اور تیسرا شخص بھی ان زبانوں کو سمجھتا ہو، مگر ان دونوں کو خبر نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ ان دونوں کو مطلع کردے کہ میں عربی یا انگریزی سمجھتا ہوں''(۱)

تاکہ دھوکہ میں آکر اپنا راز فاش نہ کردیں۔ مقصد یہ ہے کہ نہ تو انسان خود تجسّس کرے اور نہ ہی تجسّس کے اسباب پیدا کرے، اور نہ ہی دوسرے کو ایسی غلط فہمی میں مبتلا کرے جس سے وہ یہ سمجھے کہ یہ بے خبر ہے اور تم اس کی نادانستگی میں اس کے کسی راز پر مطلع ہوجاؤ۔

ایک بزرگ کا تجسّس سے بچنا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین میں ایک بزرگ تھے، انگریزی تعلیم یافتہ تھے، مگر حضرت والا کی صحبت نصیب ہوئی تو ان کی وضع قطع بھی ایسی ہوگئی جیسے دیندار لوگوں کی اور مولویوں کی ہوتی ہے، چہرے پر ڈاڑھی، لمبا کرتا وغیرہ۔ وہ ایک مرتبہ ریل میں سفر کررہے تھے۔ ان کے قریب ہی دو آدمی اور بیٹھے تھے، وہ بھی انگریزی دان تھے۔ وہ دونوں ان کا حلیہ دیکھ کر یہ سمجھے کہ یہ کوئی مولوی ہے، ان کو انگریزی کیا آتی ہوگی، چنانچہ ان دونوں نے بیٹھ کر انہی کے بارے میں انگریزی میں باتیں کرنا شروع کردیں۔ انگریزی میں باتیں کرنے کا مقصد ان سے چھپانا تھا کہ یہ مُلا آدمی ہے، انگریزی کیا سمجھے گا۔ ابھی گفتگو شروع ہی کی تھی کہ یہ بزرگ سمجھ گئے کہ یہ دونوں صاحب مجھ سے چھپ کر کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں، اس لئے انگریزی میں باتیں کررہے ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ یہ بات دیانت کے خلاف ہے کہ میں اسی طرح بیٹھ کر ان کی باتیں سنتا رہوں۔ چنانچہ ان بزرگ نے ان دونوں سے کہہ دیا کہ ''میں انگریزی جانتا ہوں، اگر آپ کو مجھ سے چھپ کر باتیں کرنی ہیں تو کوئی اور طریقہ اختیار کریں،

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۴

اس دھوکے میں نہ رہیں کہ میں انگریزی نہیں جانتا، اگر آپ کہیں تو میں اُٹھ کر چلا جاتا ہوں تاکہ آپ علیحدگی میں باتیں کرلیں۔

بہرحال، ان بزرگ کو یہ جو خیال آیا کہ یہ دونوں یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں زبان نہیں جانتا، اور مجھ سے چھپ کر باتیں کرنا چاہتے ہیں، اب اگر میں خاموش بیٹھا رہوں تو یہ "تجسس" میں داخل ہو جائے گا، یہ خیال ان کے ذہن میں کیوں پیدا ہوا؟ اس لئے کہ "تھانہ بھون" میں کچھ دن گزار لیے تھے اور حضرت والا کی صحبت نصیب ہوگئی تھی، ورنہ آج کیا کسی کے دل میں یہ خیال آئے گا کہ میں بتادوں کہ جس زبان میں تم باتیں کر رہے ہو، میں یہ زبان جانتا ہوں۔ آج اگر کوئی یہ بات بتائے گا بھی تو اپنا علم جتانے کے لئے بتائے گا کہ ہمیں جاہل مت سمجھنا، ہمیں بھی یہ زبان آتی ہے، اس لئے نہیں بتائے گا کہ کہیں تجسس کے گناہ میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ بلکہ آجکل تو اس کو کمال سمجھا جائے گا کہ چپکے چپکے بات سنتے رہیں اور بعد میں اس کا اظہار کریں گے کہ تم نے تو ہم سے چھپانے کی کوشش کی، لیکن ہم کو سب پتہ چل گیا کہ آپ نے کیا کیا باتیں کیں۔

بات یہ ہے کہ ان سب باتوں کا خیال کرنا دین کا ایک حصہ ہے۔ آج ہم نے ان کو دین سے خارج کر دیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ فکر عطا فرمادیں تو پھر یہ سب باتیں سمجھ میں آنے لگتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان سب باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

غصہ اور اس کا علاج ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ!

رمضان المبارک میں کئی سالوں سے ظہر کی نماز کے بعد حضرت تھانویؒ کی کتاب ''انفاسِ عیسیٰ'' پڑھنے کا معمول چلا آ رہا ہے اور اس میں رذائل کا بیان چل رہا ہے۔ اب یہاں جوش اور غصہ کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ یہ ''غصہ'' بھی رذائل میں سے ہے، بلکہ بعض حضرات صوفیاء نے فرمایا کہ یہ ''اُمّ الامراض'' ہے، یعنی یہ غصہ خود تو بیماری ہے اور نہ جانے کتنی بیماریاں پیدا کرتا ہے، اس غصہ کے نتیجے میں بیشمار گناہ سرزد ہوتے ہیں، مثلاً غصہ میں بے قابو ہو کر گالی گلوچ شروع کر دی، نامناسب الفاظ استعمال کرنا شروع کر دیئے، غصہ اور آگے بڑھا تو مار پٹائی شروع کر دی اور اس میں حد سے آگے بڑھ گیا۔

غصہ کے ساتھ جمع ہونے والے امراض

اور پھر انسان دوسرے پر اس وقت غصہ کرتا ہے جب اپنے آپ کو اس سے بہتر سمجھتا ہے، کیونکہ اگر انسان اپنے آپ کو کمتر سمجھے تو اس کو کبھی غصہ نہیں آئے گا، اس لئے اس غصہ کے ساتھ ''کبر اور عُجب'' بھی جمع ہو جاتا ہے، کبھی اس کے ساتھ ''بغض'' بھی جمع ہو جاتا ہے، لہٰذا بیشمار باطنی امراض اس کے نتیجے میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے حضرات صوفیاء کرام کے پاس جب کوئی شخص علاج کے لئے جاتا تھا تو وہ سب سے پہلے اس غصہ کا علاج کیا کرتے تھے۔

دو جبلی چیزیں

انسان کی جبلت میں دو بنیادی چیزیں ہیں، ایک غصہ، دوسرے شہوت، چاہے وہ شہوت بطن کی ہو یا فرج کی ہو۔ اگر غور کرو گے تو یہ نظر آئے گا کہ سارے گناہوں، ساری معصیتوں اور سارے گناہوں کی جڑ یہی دو چیزیں ہیں، اسی وجہ سے حضرات صوفیاء کرام سب سے پہلے غصے کا علاج کرتے ہیں، کیونکہ اگر غصہ قابو میں نہ ہوگا تو وہ نہ جانے کتنے گناہوں میں اور کتنے ضلالت کے گڑھوں میں جا کر گرے گا۔

☆ اصلاحی خطبات (۴/۸۶ تا ۱۳۲)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

حضور ﷺ سے مختصر نصیحت کا مطالبہ کرنا

ایک صحابی نے حضورِ اقدس ﷺ سے عرض کیا کہ "عِظْ وأوجز"، نصیحت فرمایئے اور مختصر فرمایئے۔ حضورِ اقدس ﷺ نے اس پر برا نہیں منایا کہ نصیحت بھی طلب کررہے ہو اور اوپر سے شرطیں بھی لگاتے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر نصیحت طلب کرنے والا یہ کہہ دے کہ مجھے مختصر نصیحت فرمادیجئے تو اس میں ناراضگی کی کوئی بات نہیں بلکہ یہ اس کا حق ہے، کیونکہ اگر اس نے آپ سے نصیحت طلب کی اور اس کے پاس وقت کم تھا، اب آپ نے اس کے سامنے ڈھائی گھنٹے کی تقریر کردی، حالانکہ اس کو سفر میں جانا تھا اور وہ جلدی میں تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیچارہ نصیحت طلب کرنے کے نتیجے میں مصیبت میں مبتلا ہوگیا، اور جب اس کے دماغ پر جلدی جانے کا بوجھ ہوگا تو وہ کیا آپ کی نصیحت سنے گا اور کیا سمجھے گا اور کیا اس پر عمل کرے گا، اس لئے بات کرنے والے کو چاہئے کہ مخاطب کے حال کا لحاظ کرے۔ اور اس حدیث میں تو خود مخاطب نے یہ کہہ دیا کہ میرے پاس وقت کم ہے، اس لئے مجھے مختصر نصیحت فرمادیجئے۔

غصہ مت کرنا

چنانچہ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ مختصر نصیحت فرمائی کہ "لَا تَغْضَبْ" غصہ مت کرنا۔[1] یہ مختصر نصیحت فرمادی، اس سے پتہ چلا کہ یہ غصہ ہی درحقیقت بہت سی برائیوں کا سرچشمہ ہے، اسی وجہ سے آپ ﷺ نے ساری برائیوں اور بداعمالیوں اور ساری معصیتوں میں سے اس کا انتخاب فرمایا، حالانکہ آپ چاہتے تو یہ فرماسکتے تھے کہ دیکھو جھوٹ مت بولنا، غیبت نہ کرنا، زنا نہ کرنا، چوری نہ کرنا وغیرہ، لیکن ان تمام چیزوں کو چھوڑ کر آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ غصہ مت کرنا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی بہت بڑی برائی ہے اور یہ سب گناہوں کا باپ ہے جس کے نتیجے میں انسان اور بہت سے گناہوں کے اندر مبتلا ہوجاتا ہے۔

غصہ ضروری بھی ہے

یہ غصہ ایسی چیز ہے کہ بعض اوقات اس کی ضرورت ہوتی ہے، اگر یہ غصہ بالکل نہ ہو تو انسان

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب الحذر من الغضب، رقم: ۵۶۵۱، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء فی کثرة الغضب، رقم: ۱۹۴۳، مسند أحمد، رقم: ۸۳۸۹، ہماری تخریج کردہ روایات میں عظ وأوجز کی جگہ علّمنی شیئًا ولا تکثر کے الفاظ ہیں۔ ایک مقام پر عظنی وأوجز کے الفاظ ملتے ہیں جن میں نبی کریم ﷺ نماز میں خشوع اختیار کرنے، غیر ضروری کلام سے اجتناب اور لوگوں سے بے نیازی کی نصیحت فرمارہے ہیں۔

زندہ ہی نہیں رہ سکتا، مثلاً کوئی دشمن یا کوئی درندہ آپ کے اوپر حملہ آور ہوگیا، اب اگر اس وقت آپ کو غصہ نہ آئے بلکہ پڑے رہیں اور مار کھاتے رہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ہی ختم ہو جائیں گے۔

ایک صاحب بہادر کا قصہ

ہمارے والد صاحبؒ ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ ایک صاحب بہادر تھے، کسی بڑے عہدے پر تھے، ہر کام نوکر سے کرانے کے عادی تھے، خود کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ ایک دن صبح بیدار ہوئے تو دیکھا کہ گھر کے اندر بندر آگئے، ایک بندر ان کا سوٹ اُٹھا کر لے گیا، ایک بندر ان کی پتلون اُٹھا کر لے گیا، ایک بندر ان کا ہیٹ اُٹھا کر لے گیا، اب صاحب بہادر بستر پر پڑے یہ سب تماشہ دیکھ رہے تھے اور آوازیں دے رہے تھے کہ ارے بھائی! کوئی مردوا (مرد) ہے جو ان بندروں کو روکے، اتنے میں ان کا کوئی دوست آگیا، اس نے آکر کہا کہ جناب! آپ بھی تو مردوے (مرد) ہیں، صاحب بہادر نے کہا کہ ہاں بھائی! خوب یاد دلایا، چنانچہ جلدی سے بستر سے اُٹھے اور بندروں کے پیچھے دوڑے، اتنی دیر میں وہ بندر سب چیزیں لے کر جنگل کی طرف بھاگ چکے تھے۔ لہٰذا یہ طرزِ عمل کہ بستر پر لیٹے ہیں اور اپنی مدافعت نہیں کر رہے ہیں، یہ صورت بھی انسان کی فطرت کے خلاف ہے، بلکہ انسان کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ جب اس پر کوئی حملہ آور ہو تو وہ اپنی مدافعت کرے اور اس پر غصہ کرے۔

غصہ کرنا عبادت بھی ہے

لہٰذا غصہ ہر جگہ برا نہیں ہوتا بلکہ بعض جگہ صحیح اور برحق ہوتا ہے بلکہ عبادت ہوتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص حضورِ اقدس ﷺ کی شان میں گستاخی کرے۔ نعوذ باللہ۔ اس وقت اگر مسلمان کو غصہ نہ آئے تو اس سے زیادہ بے غیرتی اور کیا ہوگی؟ اس موقع پر غصہ کرنا ہی عبادت ہے۔ لہٰذا بہت سے مواقع ایسے ہیں جہاں پر غصہ کا استعمال درست ہوتا ہے بلکہ بہتر ہوتا ہے بلکہ واجب بھی ہوتا ہے، اور بہت سے مواقع ایسے ہیں جہاں پر غصہ کا استعمال برا ہے بلکہ گناہ اور معصیت ہے۔

سالک ابتداءً بالکل غصہ نہ کرے

لیکن جب کوئی مرید اپنی تربیت کرانے کے لئے کسی سے تعلق قائم کرتا ہے تو شیخ اس مرید سے کہتا ہے کہ تم فی الحال غصہ بالکل مت کرنا، کیونکہ تم اس میں تمیز نہیں کر سکو گے کہ کہاں غصہ کرنا حق ہے اور کہاں ناحق ہے، لہٰذا ابھی تو تم یہ مشق کرو کہ کسی بھی موقع پر غصہ مت کرو۔ اسی کا نام ''مجاہدہ'' ہے، یعنی کسی محظور سے بچنے کے لئے سدِ ذریعہ کے طور پر کسی مباح چیز کو بھی ترک کر دینا، یہی مجاہدہ

ہے۔ حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ "مجاہدہ" کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں کہ ایک کاغذ کو ایک طرف موڑ دو، پھر اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو وہ سیدھا نہیں ہوگا، اس کے سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو مخالف سمت کی طرف موڑ دو، جب اس کو مخالف سمت کی طرف موڑ دو گے تو یہ کاغذ سیدھا ہو جائے گا۔

نفس کو دوسری سمت میں موڑ دو

اسی طرح ہمارا نفس بھی گناہوں کی طرف مڑ گیا ہے، اگر اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ سیدھا نہیں ہوتا، لہٰذا اس نفس کو دوسری طرف موڑ دو، یعنی اس سے کچھ مباح کام بھی چھڑاؤ، مباح کاموں کے چھڑانے کے نتیجے میں وہ نفس اعتدال پر آجائے گا، اسی کا نام مجاہدہ ہے۔ اس لئے حضرات صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ ابتداءً تم بالکل بھی غصہ مت کرو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غصہ رفتہ رفتہ قابو میں آجائے گا، اس کے بعد جب غصہ کو استعمال کرو گے تو وہ صحیح جگہ پر استعمال ہوگا، غلط جگہ پر استعمال نہیں ہوگا۔ بہرحال! اسی غصہ کے بارے میں اور اس کو کم کرنے کے لئے حضرت والا نے کچھ تدبیریں بیان فرمائی ہیں، ان کی تھوڑی سی تشریح عرض کر دیتا ہوں۔

غصہ کا پہلا علاج، اپنے عیوب کو سوچنا

چنانچہ حضرت والا نے غصہ کا پہلا علاج یہ بیان فرمایا:

"بہ تکلف ضبط کر کے اپنے عیوب سوچنے لگا کیجئے، انشاء اللہ اشتعال کم ہو جائے گا"(۱)

کسی صاحب نے حضرت والا کو خط میں لکھا تھا کہ میرے اندر اشتعال بہت پیدا ہوتا ہے اور ذرا سی بات پر غصہ آجاتا ہے۔ اس کا علاج حضرت والا نے یہ تجویز فرمایا کہ جب غصہ آرہا ہو اور کسی بات پر اشتعال ہو رہا ہو تو اس وقت غصہ کو بہ تکلف ضبط کر کے اپنے عیوب سوچا کریں، کیونکہ غصہ کے اندر تھوڑا سا عُجب یعنی اپنے آپ کو دوسرے سے بہتر سمجھنے کا پہلو ہوتا ہے اور دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے، اسی وجہ سے غصہ کرتا ہے، لہٰذا اس کا علاج یہ فرمایا کہ اپنے عیوب کو سوچے کہ میرے اندر کیا کیا عیوب ہیں اور یہ سوچے کہ اس وقت جو غصہ آرہا ہے، یہ بھی انہی عیوب کا ایک فرد ہے، اگر میں درست ہوتا تو مجھے اتنی شدت سے غصہ نہ آتا، اس طرح اپنے عیوب سوچنے سے غصہ اور اشتعال کم ہو جائے گا۔ البتہ اس کے لئے فکر کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ جس شخص کو فکر ہی نہیں کہ کتنا غصہ آیا اور غصہ کے نتیجے میں میری زبان سے کیا بات نکل گئی، کیا فعل مجھ سے سرزد ہو گیا، تو ایسا مرض تو ناقابلِ علاج ہے۔ بہرحال!

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۰

غصہ کے علاج کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ اپنے اندر فکر پیدا کرو، جب انسان کے اندر فکر پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے بعد جو علاج بتائے جاتے ہیں وہ کارگر ہوتے ہیں، اس لئے حضرت فرماتے ہیں کہ جب غصہ آئے تو اپنے عیوب کو سوچ لو تو انشاء اللہ غصہ کم ہو جائے گا۔

غصہ کا دوسرا علاج، مغضوب علیہ کو دور کر دینا

دوسرا علاج حضرت والا نے یہ ارشاد فرمایا:

''جس پر غصہ آئے، اس کے پاس سے فوراً خود ہٹ جائے یا اس کو اپنے پاس سے ہٹا دے جیسا موقع ہو''(۱)

غصہ کی خاصیت یہ ہے کہ جس پر غصہ آتا ہے، اسی کے قریب جانے کی فکر کرتا ہے، اس سے غصہ کے اندر اور ترقی ہوتی ہے، اس لئے حضرت فرما رہے ہیں کہ جس پر غصہ آئے، اس کے پاس سے فوراً یا تو خود ہٹ جاؤ یا اس کو سامنے سے ہٹا دو، کیونکہ سامنے ہونے کی وجہ سے غصہ زیادہ آئے گا۔

حضور ﷺ سے یہ علاج کرنا ثابت ہے

یہ علاج خود حضورِ اقدس ﷺ سے ثابت ہے، چنانچہ حضرت وحشی رضی اللہ عنہ جنہوں نے غزوۂ اُحد کے موقع پر حضورِ اقدس ﷺ کے محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا تھا، بعد میں اللہ تعالیٰ نے حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کو اسلام لانے کی توفیق دے دی، حضورِ اقدس ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم میرے سامنے مت بیٹھا کرو، کیونکہ تمہارے سامنے آنے سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا غم تازہ ہو جاتا ہے، اس کے نتیجے میں غصہ آنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ (۲)

اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ جس پر غصہ آرہا ہے، اس کو اپنے سامنے سے ہٹا دو۔

غصہ کے وقت سزا مت دو

اسی طرح اگر اپنے سے چھوٹے پر جائز غصہ بھی آرہا ہو، مثلاً اپنی اولاد پر یا اپنے شاگرد پر غصہ آرہا ہو، تو اس اشتعال کی حالت میں نہ اس کو ڈانٹو اور نہ اس کو سزا دو، کیونکہ اشتعال کے وقت حدود پر قائم نہیں رہو گے، اسلئے اشتعال کے وقت معاملے کو ٹلا دو اور تھوڑا سا وقت گزار دو، یہاں تک کہ اشتعال ٹھنڈا پڑ جائے، اشتعال ٹھنڈا ہو جانے کے بعد اس کو اپنے پاس بلاؤ اور اس وقت اس کی غلطی بتاؤ، اس وقت اگر ڈانٹنے کی ضرورت ہو تو ڈانٹ بھی دو، اس وقت کی ڈانٹ، چونکہ اشتعال کی حالت میں نہیں

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۰ (۲) حياة الصحابة (۱/ ۸۰، ۸۱)

ہوگی، اس لئے وہ حد کے اندر رہے گی اور اشتعال کے وقت حد سے آگے بڑھنے کا اندیشہ رہتا ہے۔

غصہ کا تیسرا علاج، عذابِ الٰہی کا استحضار

غصہ کا تیسرا علاج حضرت والا نے یہ بیان فرمایا:

''استحضار عذابِ الٰہی کا کرے''

یعنی اللہ جل شانہ کے عذاب کا استحضار کرے۔ یہ علاج بھی حدیث شریف سے ماخوذ ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنے غلام کو ڈانٹ رہے تھے، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو اس حالت میں دیکھا تو فرمایا:

((لَلّٰهُ أَقْدَرُ عَلَيْكَ مِنْكَ عَلَيْهِ))(۱)

''جتنی قدرت تمہیں اس غلام پر حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کو تم پر اس سے زیادہ قدرت حاصل ہے''

تم اس غلام کو تو سزا دے رہے ہو، اگر اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دینے پر آجائے تو تمہارا کیا بنے گا۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے استحضار سے غصہ میں کچھ کمی واقع ہوتی ہے اور اشتعال ٹھنڈا پڑتا ہے۔

آگے حضرت والا نے فرمایا کہ ''اپنے گناہوں کو یاد کر کے استغفار کی کثرت کرنے لگے''

یہ اسی پہلے علاج کا حصہ ہے جو اُوپر بیان فرمایا کہ اپنے عیوب کو سوچا کرے اور استغفار کرے۔ بہر حال! حضرت نے اس ملفوظ میں غصے کے تین علاج بیان فرمائے، اگر کوئی شخص غصہ کے وقت ان پر عمل کرے تو انشاء اللہ وہ غصہ اس کے لئے مضر نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

غصے کے تقاضے پر عمل مت کرو

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا:

''اگر آپ کو کوئی کچھ کہتا ہے اور اعتراض کرتا ہے تو تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے''

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب صحبة الممالیك وکفارة من لطم عبده، رقم: ۳۱۳۶، سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول اللّٰه، باب النهی عن ضرب الخدم وشتمهم، رقم: ۱۸۷۱، سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی حق المملوك، رقم: ٤٤٩٢، مسند أحمد، رقم: ١٦٤٦٧، واضح رہے کہ ہماری تخریج کردہ روایات میں یہ واقعہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بجائے حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے، جن کا اصل نام ''عقبہ بن عمرو'' ہے۔

جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا:

''مگر غصہ سے آگے انتقام تک مت بڑھنا ولو باللسان''(۱)

یعنی اگر غصہ آیا تو آنے دو، مگر اس کے تقاضے پر عمل مت کرنا اور انتقام مت لینا اگر چہ وہ انتقام زبان سے ہی کیوں نہ ہو، یعنی زبان سے بھی انتقام لینے کی فکر مت کرنا۔

معاف کرنا افضل ہے

شریعت نے بعض جگہ غصے کو استعمال کرنے کی اجازت دی ہے اور غصہ کرنا وہاں جائز اور مباح ہے، مثلاً حدود کے اندر رہتے ہوئے بدلہ لے لینا۔ (مگر تربیت کے لئے اور نا جائز حد تک پہنچنے سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے یہ مجاہدہ کرایا جاتا ہے کہ جائز انتقام بھی مت لو، گویا غصہ کے مقتضیٰ پر کسی وقت بھی عمل مت کرو اگر چہ حد کے اندر رہتے ہوئے انتقام لینا جائز ہے) لیکن افضل ہر حالت میں معاف کر دینا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط﴾(۲)

''یہ ایسے لوگ ہیں جو نیک کاموں میں خرچ کرتے ہیں ہر حال میں، فراغت میں بھی اور تنگی میں بھی اور غصہ کو ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرتے ہیں''

لہٰذا معاف کر دینا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، اس کے فضائل بہت زیادہ ہیں، اس لئے مبتدی سے کہا جاتا ہے کہ تم انتقام مت لو بلکہ صبر کرو اور جس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے، اس کو معاف کر دو، اس کے نتیجے میں تمہیں صبر کرنے کا ثواب الگ ملے گا اور معاف کرنے کا ثواب الگ ملے گا۔

بزرگوں کی مختلف شانیں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''ارواحِ ثلاثہ'' میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے ایک مرتبہ اپنے شیخ سے کہا کہ حضرت! میں نے سنا ہے کہ صوفیاء اور اولیاء کی شانیں مختلف ہوتی ہیں، ان کے مزاج مختلف ہوتے ہیں اور ان کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان کی مختلف شانیں کیا ہوتی ہیں؟ ان کے شیخ نے پہلے تو یہ جواب دیا کہ یہ سب چھوڑ دو، تم کس چکر میں پڑ گئے، بس جو تمہارا کام ہے، اس کام میں لگو۔ اس نے اصرار کیا کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ دہلی میں قطب صاحب کا مزار ہے، اس کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۰ (۲) آل عمران: ۱۳۴

ہے، اس مسجد میں جاؤ، اس میں تمہیں تین آدمی بیٹھے ذکر کرتے ہوئے نظر آئیں گے، تم جا کر ان تینوں کی کمر پر ایک ایک مُکّا مار دینا اور پھر جو کچھ وہ کریں، وہ مجھے آ کر بتانا۔

چنانچہ یہ صاحب اس مسجد میں گئے، دیکھا تو واقعی تین آدمی بیٹھے ہوئے ذکر کر رہے ہیں، ان صاحب نے جا کر پہلے ایک شخص کو پیچھے سے مُکّا مارا، انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کس نے مارا اور کیوں مارا، بس اپنے ذکر کے اندر مشغول رہے۔ اس کے بعد دوسرے صاحب کے پاس گئے اور ان کو مُکّا مارا تو وہ پیچھے مڑے اور ان کو بھی مُکّا مارا اور پھر اپنے ذکر میں لگ گئے۔ جب تیسرے شخص کو مُکّا مارا تو وہ پیچھے مڑے اور میرا ہاتھ سہلانے لگے کہ تمہارے ہاتھ میں چوٹ تو نہیں لگی۔

بدلہ لینے میں وقت کیوں ضائع کروں

اس کے بعد وہ صاحب اپنے شیخ کے پاس واپس آگئے اور بتایا کہ میرے ساتھ بڑا عجیب و غریب معاملہ ہوا، وہ یہ کہ جب پہلے شخص کو مُکّا مارا تو انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہی نہیں۔ شیخ نے پوچھا کہ وہ کیا کر رہے تھے؟ انہوں نے بتایا کہ وہ ذکر کر رہے تھے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ جب تم نے مُکّا مار دیا تو پھر وہ کیا کرتے رہے؟ انہوں نے بتایا کہ وہ ذکر کرتے رہے۔ فرمایا کہ انہوں نے یہ سوچا کہ اگر کسی نے میری کمر پر مُکّا مار دیا تو اب تو مار دیا، اب وہ مُکّا واپس تو لوٹ نہیں سکتا، جو تکلیف پہنچنی تھی وہ پہنچ گئی، اب میں خواہ مخواہ بدلہ لے کر اور دوسرے کو تکلیف پہنچا کر اپنا وقت کیوں خراب کروں، جتنا وقت بدلہ لینے میں صرف ہوگا، اگر وہ وقت میں ذکر میں لگا دوں تو اس سے جو ثواب اور جو فضیلت حاصل ہوگی، وہ بدرجہا بہتر ہے اس سے کہ میں انتقام لوں، کیونکہ انتقام لینے سے مجھے کیا حاصل ہوگا، اس لئے انہوں نے اس طرف توجہ ہی نہیں کی بلکہ اپنے کام میں لگے رہے۔

برابر کا بدلہ لے لیا

دوسرے صاحب جنہوں نے پلٹ کر تم سے بدلہ لیا، یہ بتاؤ کہ انہوں نے اتنا ہی زور کا مُکّا مارا جتنے زور کا تم نے مارا تھا یا اس سے زیادہ زور کا مُکّا مارا؟ اس نے کہا کہ انہوں نے اتنا ہی زور کا مارا جتنے زور کا میں نے مارا تھا۔ شیخ نے فرمایا کہ یہ وہ صاحب ہیں جنہوں نے شریعت کے مطابق انتقام لیا اور اس آیت پر عمل کیا:

﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ﴾(۱)

”اور اگر تم بدلہ لو تو بدلہ اسی قدر لو جس قدر کہ تم کو تکلیف پہنچائی جائے“

(۱) النحل: ۱۲۶

بدلہ لینے میں تمہارا فائدہ تھا

ان صاحب نے جو بدلہ لیا، وہ بھی تمہارے فائدے کے لئے لیا، اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل کے لئے نہیں لیا۔ کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی اللہ کے بندے کو تکلیف پہنچائی جاتی ہے اور وہ اس کا انتقام نہیں لیتا بلکہ صبر کرتا ہے تو اس صبر کے نتیجہ میں یہ ہوتا ہے کہ جو زیادتی کرنے والا ہوتا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ جاتا ہے، جس کو اُردو کے محاورے میں "صبر پڑنا" کہا جاتا ہے، اور کسی اللہ والے کا صبر پڑنا بڑا خطرناک ہوتا ہے، اس لئے ان بزرگ نے سوچا کہ اگر میں نے صبر کیا تو کہیں اس کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے، لہٰذا انہوں نے بدلہ لے لیا۔

ایک علمی اشکال

البتہ اس پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ بزرگ لوگ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بھی زیادہ شفیق اور مہربان ہوتے ہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں:

((مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ))(۱)

یعنی جو شخص میرے ولی کو ایذاء اور تکلیف دے، میرا اس کے ساتھ اعلانِ جنگ ہے جبکہ دوسری طرف ان بزرگ نے زیادہ شفقت کرتے ہوئے اس تکلیف پر صبر کرلیا اور اس کو معاف کر دیا، لہٰذا وہ بزرگ اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ مہربان اور شفیق ہو گئے!

اشکال کا جواب

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ دیکھو! اگر شیرنی کو کوئی شخص چھیڑے تو وہ درگزر کر جاتی ہے، لیکن اگر کوئی شیرنی کے بچے کو چھیڑے تو پھر شیرنی نہیں چھوڑتی۔ اسی طرح بسا اوقات اللہ تعالیٰ اپنے حقوق میں ہونے والی کوتاہی کو معاف فرما دیتے ہیں اور درگزر فرما دیتے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص اللہ کے اولیاء کی شان میں گستاخی کرے تو اس کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرماتے۔ اس لئے فرمایا:

((مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ))(۲)

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، رقم: ۶۰۲۱، جامع العلوم والحکم، ابن رجب الحنبلی (۱/۳۵۷)، معارج القبول، حافظ بن احمد حکمی (۳/۱۰۰۱)

(۲) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، رقم: ۶۰۲۱

اس حدیث پر کلام

یہ حدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی صحیح بخاری میں لائے ہیں[1] لیکن کوئی حدیث پوری بخاری شریف میں ایسی نہیں ہے جس کی سند پر محدثین نے اتنا زیادہ کلام کیا ہو جتنا کلام اس حدیث کی سند پر کیا ہے، یہاں تک کہ بعض محدثین نے یہ کہہ دیا کہ اس حدیث کو اپنی صحیح بخاری میں نقل کرنے میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے غلطی ہوگئی ہے، اس لئے کہ یہ حدیث ان کے معیار پر پوری نہیں اُترتی، لیکن اس کے باوجود اس حدیث کو اپنی کتاب میں لائے ہیں۔ اس کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ یہ حدیث بالکل موضوع اور بہت ضعیف ہے، البتہ امام بخاری کی شرائط پر پوری نہیں اُترتی، لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ یہ ہے کہ بعض اوقات اپنی شرائط کو ان مقامات پر نظر انداز کر جاتے ہیں جہاں خارجی قرائن سے ان کو یہ یقین ہوتا ہے کہ حدیث درست ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں ہیں اور دارالعلوم کے سب سے پہلے سرپرست تھے، جنہوں نے سنت اور بدعت کے درمیان حدِ فاصل قائم کی، ایک مرتبہ وعظ فرما رہے تھے اور اس وعظ میں قوالی کے خلاف بیان تھا اور بڑے زور و شور سے بیان ہو رہا تھا، وعظ کے دوران ایک صاحب کھڑے ہوگئے اور اس نے کہا کہ آپ یہ فرما رہے ہیں کہ قوالی ناجائز ہے اور حرام ہے لیکن حضرت نظام الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ تو قوالی سنتے تھے۔ جواب میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت نظام الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو دلیل معلوم ہوگی، ہمیں معلوم نہیں، ہمیں جو معلوم ہے ہم اس کے مکلّف ہیں۔ دیکھئے! ایک طرف تو قوالی کے خلاف اتنی جوشیلی تقریر ہو رہی ہے اور اسی دوران جب ایک بڑے بزرگ کا نام آگیا تو اس طرح جواب دیا۔

بزرگوں کے لئے ثقیل کلام مت نکالو

بات دراصل یہ ہے کہ بزرگوں سے اختلاف جتنا چاہو کرلو، تمہیں اختلاف کرنے کا حق ہے، لیکن ان کے لئے زبان سے کوئی ثقیل کلمہ نہ نکالو، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کیا مقام ہو، اللہ تعالیٰ نے اس کو کیا درجہ عطا فرمایا ہو۔ لہٰذا جس کے بارے میں شبہ بھی ہو کہ یہ اللہ والا ہے، اس کے خلاف کوئی ثقیل کلمہ بھی زبان سے نہ نکالو۔

بہر حال! غصہ کرنے کا ایک محل ہے، وہ ہے جائز انتقام لینا، اس حد تک انسان غصہ کرسکتا ہے،

لیکن پھر بھی معافی بہتر ہے اور خاص طور پر شروع میں تربیت کے لئے تو انسان کے لئے مناسب یہ ہے کہ جائز انتقام بھی نہ لے۔

غصہ آنا غیر اختیاری ہے

چنانچہ حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''سرعت غضب امر طبعی ہے، اختیار سے خارج ہے، اس پر ملامت نہیں، البتہ اس کے مقتضیٰ پر عمل جب کہ حدود سے تجاوز ہو جائے مذموم ہے''(۱)

یعنی غصہ کا آجانا غیر اختیاری ہے اور جتنا درجہ غیر اختیاری ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مؤاخذہ بھی نہیں۔ اس لئے کہ کوئی بھی ایسی چیز جو انسان کے اختیار سے باہر ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مؤاخذہ اور گرفت نہیں، گرفت ہمیشہ اس کام پر ہوتی ہے جس کو انسان اپنے اختیار اور قصد سے کرے، لہٰذا جو غیر اختیاری غصہ آ گیا اور طبیعت کے اندر ایک اوٹن پیدا ہوگئی، اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں، لیکن اگر اس غصے کے مقتضیٰ پر عمل کرتے ہوئے کسی کے ساتھ زبان سے یا ہاتھ سے بدسلوکی کرو گے تو اس پر گرفت ہو جائے گی، لہٰذا جب تک غصہ کے مقتضیٰ پر عمل نہیں ہوگا اس وقت تک انشاء اللہ اس غصہ سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

حد سے تجاوز کرنا مذموم ہے

لیکن عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب غصہ آتا ہے اور اس غصے کے اندر تیزی ہوتی ہے تو اس تیزی کے نتیجے میں آدمی کے اندر ایک بجلی سی بھر جاتی ہے، اور اس کے نتیجے میں آدمی بعض اوقات ایسی حرکتیں کرتا ہے جو حدود سے تجاوز ہو جاتی ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت والا اس ملفوظ میں فرما رہے ہیں کہ ''سرعت غضب امر طبعی ہے اور اختیار سے خارج ہے، اس پر ملامت نہیں، البتہ اس کے مقتضیٰ پر عمل جب کہ حدود سے تجاوز ہو جائے، مذموم ہے''

غصہ کا علاج: ہمت کا استعمال

آگے اس غصہ کا علاج بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''اور اس کا علاج بجز ہمت کے کچھ نہیں''(۲)

مثلاً کسی پر غصہ آیا اور دل چاہا کہ میں اس کا منہ نوچ ڈالوں، یہ جو دل چاہ رہا ہے، اس دل چاہنے پر عمل

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۰ (۲) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۰

نہ کرو اور اپنے آپ کو زبردستی کر کے اس سے روکو اور یہ تہیہ کر لو کہ میں اپنے اس غصہ کے تقاضے پر عمل نہیں کروں گا، عزم کرے اور ہمت کو کام میں لائے کہ چاہے دل اس کام کے کرنے کو کتنا ہی چاہ رہا ہو لیکن میں یہ کام نہیں کروں گا۔ اسی لئے حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرُعَةِ إِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِیْ يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ))(۱)

''پہلوان وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جس کو غصہ آرہا ہو اور اس وقت وہ اپنے نفس کو قابو میں کرے''

ہمت کو کام میں لانے کی تدبیریں

بہر حال! غصہ کو قابو کرنے کے لئے اصل چیز تو ''ہمت'' ہے، البتہ اس ہمت کو کام میں لانے کے لئے کچھ تدبیریں معاون ہو جاتی ہیں، اگر وہ تدبیریں اختیار کر لی جائیں تو پھر ہمت میں پختگی آجاتی ہے اور آدمی غصہ کا مقابلہ کر لیتا ہے۔ ان تدبیروں کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا:

''اس ہمت میں مغضوب علیہ سے فوراً دور چلا جانا اور اعوذ باللہ پڑھنا اور اپنی خطاؤں اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے احتمال کو یاد کرنا، یہ بھی بہت معین ہے''(۲)

پہلی اور دوسری تدبیر

پہلی تدبیر یہ بیان فرمائی کہ جس پر غصہ آرہا ہے، اس سے دور چلے جاؤ یا اس کو اپنے سامنے سے دور کر دو، اس سے غصہ کے اندر کمی آجاتی ہے۔ دوسری تدبیر یہ بیان فرمائی:

''أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ.''

پڑھنا، یہ قرآن کریم کا بتایا ہوا نسخہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾(۳)

یعنی جب شیطان کی طرف سے حملہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو اور پڑھو:

''أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ.''

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب الأدب، باب الحذر من الغضب، رقم:٥٦٤٩، صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب فضل من يملك نفسه عند الغضب، رقم:٤٧٢٣، مسند أحمد، رقم:٦٩٢١، مؤطا مالك، الكتاب الجامع، باب ما جاء في الغضب، رقم:١٤٠٩

(۲) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۰

(۳) الاعراف: ۲۰۰

غصہ کا ایک اور علاج: درود شریف پڑھنا

عربوں میں ایک بڑا اچھا دستور چلا آرہا تھا، اب اس کا رواج کم ہوگیا ہے، وہ یہ کہ جب دو آدمیوں میں لڑائی ہوجاتی اور ایک سخت غصے میں ہوتا تو دوسرا اس سے کہتا کہ صَلِّ عَلَى النَّبِي (صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی نبی کریم ﷺ پر درود پڑھو۔ تجربہ یہ تھا کہ سامنے والے کو چاہے کتنا ہی غصہ آرہا ہو، جب اس سے یہ کہا جاتا کہ "صَلِّ عَلَى النَّبِي" تو وہ فوراً درود شریف پڑھتا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ اور غصہ ختم ہوجاتا اور صلح ہوجاتی۔ یہ بہت اچھا رواج تھا، عربوں کی بداوت کے اندر ایسے اچھے رواج تھے، لیکن جوں جوں وہاں نئی تہذیب اور تمدن آرہا ہے، یہ چیزیں رخصت ہوتی جارہی ہیں، یہ بھی غصہ دور کرنے کی ایک اچھی تدبیر تھی۔

اللہ تعالیٰ کے غضب کو سوچنا

تیسری تدبیر یہ بیان فرمائی کہ اپنی خطاؤں اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے احتمال کو یاد کرو کہ جتنا میں اس شخص پر غصہ کررہا ہوں، میں کہیں زیادہ اس بات کا مستحق ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر غصہ کریں، اس لئے کہ میری خطائیں اور میرے گناہ بہت زیادہ ہیں، اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر غصہ کرنے لگیں تو میرا کیا حال ہو؟ یہ تدبیر بہت مددگار ہے۔

تکلف کر کے نرمی اختیار کریں

آگے ارشاد فرمایا:

"اور نرمی وغیرہ مدت تک تکلف سے سوچ سوچ کر اختیار کرنی چاہئے، مدت کے بعد ملکہ ہوگا ہمت نہ ہارے"(۱)

یعنی باقاعدہ تکلف کر کے لوگوں کے ساتھ بات چیت میں نرم لہجہ اختیار کرو اور نرم برتاؤ کرنے کی مشق کرو اور مسلسل کرو، یہ نہیں کہ دو روز تین روز کرلیا اور پھر چھٹی ہوگئی، ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ تو جنم روگ ہے اور ساری زندگی اس پر عمل کرنا ہوگا۔ اس لئے ہر وقت اس کا دھیان رکھے اور ہمت نہ ہارے، البتہ اس طرح کرتے کرتے کچھ عرصہ گزر جائے گا تو اس کے بعد ملکہ پیدا ہوجائے گا اور پھر غصہ جاتا رہے گا اور غصہ کے مواقع پر بھی غصہ نہیں آئے گا۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۰

غصہ کے وقت کی سات تدبیریں

آگے ایک ملفوظ میں ارشاد فرمایا:

جس وقت غصہ آوے، امورِ ذیل کی پابندی کریں:

(۱) یہ خیال کریں کہ میں بھی حق تعالیٰ کا خطاوار ہوں، اگر وہ بھی اسی طرح غصہ کریں تو میرا کہاں ٹھکانہ ہو۔

(۲) اگر میں اس کو معاف کردوں گا تو اللہ تعالیٰ مجھ کو معاف کردیں گے۔

(۳) اس وقت بے کار نہ رہیں، فوراً کسی کام میں لگ جائیں، خصوصاً مطالعۂ کتب میں۔

(۴) اس جگہ سے ہٹ جائیں۔

(۵) ''اعوذ باللہ'' پڑھنے کی کثرت کریں۔

(۶) پانی پی لیں۔

(۷) وضو کرلیں۔(۱)

اس ملفوظ میں حضرت والا نے غصہ دور کرنے کی چند تدابیر بیان فرمائی ہیں۔

میں بھی اللہ تعالیٰ کا خطاوار ہوں

پہلی تدبیر یہ ہے کہ اس وقت یہ سوچے کہ میں بھی اللہ تعالیٰ کا خطاوار ہوں، جس طرح میں اس شخص پر غصہ کررہا ہوں، اگر اللہ تعالیٰ بھی میری خطاؤں کی وجہ سے میرے اُوپر غصہ کریں تو میرا کہاں ٹھکانہ ہوگا؟ یہ سوچنے سے وہ غصہ جاتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ مجھے معاف کردیں گے

دوسری تدبیر یہ بیان فرمائی کہ اس وقت آدمی یہ سوچے کہ میں جس شخص پر غصہ کررہا ہوں، اگر میں اس کو معاف کردوں گا تو اللہ تعالیٰ مجھ کو معاف فرمادیں گے، اگر میں نے انتقام اور بدلہ لے لیا تو مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ لیکن اگر میں نے معاف کردیا اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ مجھے آخرت میں معاف کردیں تو اس میں سے کون سا سودا نفع کا ہے؟ ظاہر ہے کہ دوسرا سودا نفع بخش ہے۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۱

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے معاف کرنے کا واقعہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بہت غصے میں آئے اور کہا کہ فلاں شخص نے میرا دانت توڑ دیا ہے، میں اس سے قصاص لوں گا اور بدلہ میں اس کا دانت توڑوں گا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو سمجھایا کہ اس کا دانت توڑنے سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا، تم پیسے لے لو اور صلح کرلو۔ اس نے کہا کہ میں صلح نہیں کرتا، میں تو اس کا دانت توڑوں گا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اچھا اس کا دانت توڑ لے، شرعاً تمہیں حق ہے۔ جب وہ دانت توڑنے کے ارادے سے اس کی طرف چلا تو غالباً حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے اس کو روک لیا اور اس سے فرمایا کہ تم اس کا دانت توڑنے تو جارہے ہو، لیکن ایک بات سنتے جاؤ۔ اس نے کہا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اب تک تو تم مظلوم ہو، لیکن اگر تم نے دانت توڑتے ہوئے زیادہ زور کی چوٹ ماردی تو اس کے نتیجے میں تم ظالم بن جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہاری پکڑ ہوجائے گی، اور اگر تم اس کو معاف کردو گے تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص ہمارے بندے کی کسی زیادتی کو معاف کردے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو معاف فرمائیں گے جب اس کو معافی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ اس شخص نے پوچھا کہ کیا آپ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی ہے؟ ان صحابی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا جی ہاں! میں نے خود یہ بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ اس شخص نے کہا کہ میں نے اس کو معاف کردیا۔

اب کہاں تو وہ شخص جوش و خروش میں تھا، صلح کرنے کے لئے تیار نہیں تھا، پیسہ لینے پر تیار نہیں تھا، معاف کرنے پر تیار نہیں تھا، بلکہ اس بات پر مصر تھا کہ دانت توڑوں گا، لیکن جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث شریف سن لی تو سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا، یہ ہے مؤمن کی شان۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنا آسان اور سیدھا راستہ بتادیا کہ اگر تم معاف کردو گے تو آخرت میں تمہاری معافی ہوجائے گی۔

کسی کام میں لگ جائیں

اس ملفوظ میں تیسری تدبیر یہ بتائی کہ اس وقت بیکار نہ رہیں، یعنی انسان کو جب غصہ آرہا ہو تو وہ فارغ نہ بیٹھے بلکہ کسی نہ کسی کام میں لگ جائے، خصوصاً مطالعۂ کتب میں مشغول ہوجائے۔ چوتھی تدبیر یہ ہے کہ اس جگہ سے ہٹ جائیں۔ پانچویں تدبیر یہ ہے کہ "أعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم" پڑھنے کی کثرت کریں۔ چھٹی تدبیر یہ ہے کہ غصے کے وقت پانی پی لیں۔ ساتویں تدبیر یہ ہے کہ غصے کے وقت وضو کرلیں۔

اپنے کو پستی کی طرف لے جانا

ایک اور تدبیر یہ ہے کہ اگر آدمی غصہ کے وقت کھڑا ہوا ہے تو بیٹھ جائے اور اگر بیٹھا ہوا ہے تو لیٹ جائے، کیونکہ غصہ دماغ کی طرف چڑھتا ہے اور طالبِ علو ہے، چنانچہ جس شخص کو غصہ آتا ہے تو وہ اگر لیٹا ہوا ہے تو بیٹھ جائے گا اور اگر بیٹھا ہوا ہے تو کھڑا ہو جائے گا اور اگر کھڑا ہے تو چلنا شروع کر دے گا، یہ غصہ کی خاصیت ہے۔ لہٰذا اس غصے کا علاج بالضد کرو، وہ یہ کہ اگر غصے کے وقت تم کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ اور اگر بیٹھے ہو تو لیٹ جاؤ۔ یہ تمام علاج ہیں، ان علاجوں پر عمل کرنے سے انشاء اللہ ہمت پیدا ہوگی اور ہمت کے ذریعہ غصہ پر قابو پانا آسان ہوگا۔

غصہ کو قابو کرنے کے لئے اصل چیز "ہمت" ہی ہے، لہٰذا چاہے تم پانی پی لو یا چاہے اعوذ باللہ پڑھ لو، جب تک دل میں تحمل کا ارادہ ہی نہیں کرو گے اور عزم اور ہمت سے کام نہیں لو گے تو اس وقت تک کچھ نہیں ہوگا۔ بہرحال! اپنی طرف سے یہ عزم اور ہمت کرو کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، غصے کے مقتضیٰ پر عمل نہیں کروں گا، باقی یہ تمام تدابیر اس ہمت کے لئے معاون بن جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس غصہ کو ہمت کے ذریعہ قابو کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

غصہ کو قابو میں کرنے کا طریقہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے غصہ کے بارے میں ایک اصولی بات ایک ملفوظ میں ارشاد فرمائی ہے، وہ یہ ہے:

> "غصہ میں جوش کا دفعۃً آنا تو غیر اختیاری ہے، اس پر ملامت نہیں، لیکن بعد کو اس پر قائم رہ کر اس کے مقتضیٰ پر عمل کرنا اختیاری ہے اور اختیاری فعل کا ترک بھی اختیاری ہے، پس اس کے مقتضیٰ پر عمل نہ کرنا اختیاری ہے، اور بار بار اس کے مقتضیٰ پر عمل نہ کرنے سے تقاضا جوش کا بھی مضمحل ہو جائے گا" (۱)

جیسا کہ کل عرض کیا تھا کہ غصہ آنے پر کوئی مؤاخذہ نہیں، لیکن اس غصے کے تقاضے پر عمل کرتے ہوئے کسی کو ڈانٹ دیا، کسی کو جھڑک دیا، کسی کو مار دیا، اب اس پر مؤاخذہ ہوگا۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ اس غصے کا علاج ہی یہ ہے کہ جب غصہ آئے تو اس کے تقاضے پر عمل نہ کرو، خواہ غصے کے اندر کتنا ہی جوش آ رہا ہو، لیکن اس جوش کی بنیاد پر کوئی بات زبان سے نہ نکالے، کوئی قدم آگے نہ بڑھائے بلکہ اس تقاضے کو دبائے، اور بار بار اس تقاضے کو دبائے گا تو رفتہ رفتہ اس جوش میں

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۱

بھی کمی آجائے گی اور غصے کا جو اُبال ہوتا تھا وہ بھی کم ہو جائے گا۔ غصہ کا علاج ہی یہی ہے کہ جتنا اس غصے کو پیو گے، اتنا ہی یہ قابو میں آئے گا اور جتنا اس غصے کے تقاضے پر عمل کرو گے اتنا ہی اس غصے میں اضافہ ہوگا۔

غصے کا گھونٹ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ''احیاء العلوم'' میں یہ حدیث نقل فرمائی ہے کہ اللہ جل شانہ کو انسان کا کوئی گھونٹ پینا اتنا محبوب نہیں ہے جتنا غصے کا گھونٹ پینا محبوب ہے۔[(۱)]

یعنی پانی کا گھونٹ پینا، شربت کا گھونٹ پینا، دودھ کا گھونٹ پینا سب جائز ہے، لیکن غصے کا گھونٹ پینا محبوب ہے، اس لئے کہ غصہ کا گھونٹ پینے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ جل شانہ کے ڈر سے اور اس کی عظمت کے تصور سے اپنے غصے کو دبائے اور اس کو پی جائے اور اس غصے کے تقاضے کو کچل دے اور اس کی خواہش کو پورا نہ کرے، یہ عمل اللہ تعالیٰ کو بے انتہا محبوب ہے۔

دل توڑنے کے لئے ہے

یہی مجاہدہ درحقیقت مطلوب ہے، جب اس دل پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاطر چوٹیں پڑتی ہیں تو پھر یہ دل اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلی گاہ بن جاتا ہے۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

جتنا یہ دل ٹوٹے گا، اتنا ہی یہ دل اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں محبوب ہوتا چلا جائے گا، اس دل پر جتنی چوٹیں پڑیں گی، اتنی ہی اس دل پر اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا نزول ہوگا، اللہ تعالیٰ نے دل کے اندر جو خواہشات پیدا کی ہیں، یہ اسی لئے پیدا کی ہیں تاکہ ان کو توڑا جائے، اس لئے نہیں ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے۔ حدیث شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ الْجَنَّةَ حُفَّتْ بِالْمَكَارِهِ))[(۲)]

یعنی جنت کو مکروہات سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ مکروہات ان کاموں کو کہا جاتا ہے جن کو دل

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، ومن سند بنى هاشم، رقم: ۲۸۶۰، إحياء العلوم، باب علاج الغضب بعد هيجانه (۱۷۶/۳)

(۲) صحيح مسلم، كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، رقم: ۵۰۴۹، سنن الترمذى، كتاب صفة الجنة عن رسول الله، باب ما جاء صفت الجنة بالمكاره، رقم: ۲۴۸۲

پسند نہیں کر رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ان پر عمل کر رہا ہے اور اس کے نتیجے میں دل پر چوٹ مار رہا ہے، مثلاً غصہ آیا لیکن اللہ تعالیٰ کی خاطر اس غصے کو پی گیا، یا مثلاً دل میں شہوت کی نظر ڈالنے کا تقاضا پیدا ہوا، لیکن اللہ تعالیٰ کی خاطر نظر جھکا لی، ان کاموں کے نتیجے میں دل کی خواہشات کو کچلا جا رہا ہے، اس کچلنے کے نتیجے میں یہ دل اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ بن جاتا ہے۔

نفس کی خواہشات کو کچل دو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ آدمی ایک مرتبہ یہ طے کر لے کہ ؂

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں برباد ہوں
اب تو اس دل کو بنانا ہے ترے قابل مجھے

آدمی یہ عزم کر لے کہ دل میں جتنی خواہشات اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو رہی ہیں، ان کو کچلنا ہے اور ان کو پامال کرنا ہے اور پامال کرنے کے نتیجے میں ان پر قابو حاصل کرنا ہے۔ اور جب بندہ ایک مرتبہ یہ کام کر لیتا ہے اور اپنی خواہشات کو کچلتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خواہشات مضمحل ہو جاتی ہیں اور کمزور پڑ جاتی ہیں۔ یاد رکھو! یہ خواہشات مرتے دم تک ختم نہیں ہوں گی بلکہ باقی رہیں گی، لیکن ان کے جوش و خروش میں اور ان کی شدت میں کمی آجاتی ہے۔

حلاوتِ ایمان کب نصیب ہوتی ہے؟

اور جب اس دل پر بار بار چوٹ پڑنے کے نتیجے میں اس کی خواہشات کمزور پڑ جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ حلاوتِ ایمان عطا فرما دیتے ہیں اور اپنی معرفت عطا فرماتے ہیں اور اس حلاوتِ ایمان اور معرفت کی جو لذت حاصل ہوتی ہے، اس کے مقابلے میں خواہشات کی لذت ہیچ در ہیچ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو حلاوتِ ایمان اور اپنی معرفت عطا فرما دے۔ آمین۔ اس حلاوت کے آگے گناہوں کی اور خواہشات کی لذت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

یہ حلاوت مفت نہیں ملتی

لیکن یہ حلاوت مفت میں نہیں ملتی بلکہ پہلے ان خواہشاتِ نفس پر چوٹ مارتے رہو، مارتے رہو، اور چوٹ مارنے سے شروع شروع میں بڑی تکلیف ہوگی، بڑی مشقت ہوگی، لیکن اس مشقت کو برداشت کر کے چوٹیں مارتے رہو، مارتے رہو، رفتہ رفتہ یہ دل ٹوٹ ٹوٹ کر اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ بن جائے گا۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت خوبصورت شعر پڑھا کرتے تھے کہ ؂

یہ کہہ کے کوزہ گر نے پیالہ پٹک دیا
اب اور کچھ بنائیں گے اس کو بگاڑ کے

جس ذات نے بڑا خوبصورت پیالہ بنایا، اسی ذات نے یہ کہتے ہوئے اس پیالہ کو پٹک دیا کہ اب اس کو بگاڑ کر اور کچھ بنائیں گے۔ اس دل پر چوٹیں ماریں، اس پر ہتھوڑے چلائے، یہ سب کیوں کیا، تا کہ اس کو بگاڑ کر اور کچھ بنائیں گے۔

برباد دل پر تجلیات کا نزول

کسی نے اس پر بڑا خوبصورت شعر کہا ہے کہ۔

بتانِ ماہ وش اُجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
جسے برباد کرتے ہیں اسی کے دل میں رہتے ہیں

لہٰذا خواہشات کو کچل کچل کر جب دل کو برباد کر دیا جاتا ہے تو اس دل پر اللہ تعالیٰ کا نزول اجلال ہوتا ہے اور ان کی تجلیات ظاہر ہوتی ہیں۔

دل پر ذرا نشتر لگایئے

حضرات صوفیاء کرام اور اولیاء کرام، ان سے بھی آگے صحابہ کرام، ان سے بھی آگے انبیاء کرام علیہم السلام، ان کے جو قلوب مجلّٰی مزکّٰی مصفّٰی ہوتے ہیں، وہ بھی اسی طرح ہوتے ہیں کہ یہ حضرات اپنی خواہشات کو توڑتے ہیں اور ان کو کچلتے ہیں، کیونکہ جب خواہشات کو کچلا جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس دل کو مجلّٰی مزکّٰی بنا دیتے ہیں، اس دل میں پھر اللہ تعالیٰ کی معرفت کا نور آتا ہے، اس کے بعد پھر ان گناہوں کی خواہشات مضمحل ہو جاتی ہیں اور ان کا جوش و خروش ماند پڑ جاتا ہے، مگر اس کے لئے ابتداء میں ان خواہشات سے کشتی لڑنی پڑتی ہے۔ میں نے بھی اسی موضوع پر ایک شعر کہا تھا کہ۔

کتنے غنچے مضطرب ہیں دل میں کھلنے کے لئے
اپنے ہاتھوں سے ذرا نشتر لگا کر دیکھئے

اس دل پر جتنے نشتر لگاؤ گے، اتنے ہی غنچے کھلیں گے، اتنے ہی اس میں کمالات پیدا ہوں گے اور اتنے ہی اس میں انوارات اور تجلیات حاصل ہوں گی۔

رفتہ رفتہ یہ غصہ قابو میں آجائے گا

اس ملفوظ میں حضرت والا یہی فرما رہے ہیں کہ غصہ کا علاج یہی ہے کہ اگر غصہ آ گیا تو آنے

دو، لیکن اس کے بعد دل میں جو یہ تقاضا پیدا ہوا کہ اُٹھ کر اس کو ایک تھپڑ ماروں یا اس کو گالی دوں یا اس کو برا بھلا کہوں، اس تقاضے کو زبردستی دبا جاؤ اور یہ سوچو کہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے اس تقاضے کو دبا رہا ہوں تو پھر اس غصے کو پامال کرنے میں بھی لذت اور حلاوت حاصل ہوگی انشاء اللہ، اور جتنا یہ عمل کرتے جاؤ گے، اتنا ہی یہ نفس قابو میں آتا جائے گا۔

انسان کا نفس دودھ پیتے بچے کی طرح ہے

قصیدہ بردہ میں علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اَلنَّفْسُ كَالطِّفْلِ اِنْ تُمْهِلْهُ شَبَّ عَلٰى
حُبِّ الرَّضَاعِ وَاِنْ تَفْطِمْهُ يَنْفَطِمُ

یعنی انسان کا نفس چھوٹے بچے کی طرح ہے جو ابھی دودھ پیتا ہے، وہ بچہ کبھی یہ چاہے گا کہ میں دودھ چھوڑ دوں؟ نہیں، کیونکہ اس کو تو دودھ پینے کی عادت پڑی ہوئی ہے، اس لئے وہ ماں کا دودھ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے، دودھ پیتے پیتے دو سال ہو چکے ہیں، اب اگر ماں باپ یہ سوچیں کہ اگر اس بچے کا دودھ چھڑائیں گے تو اس کو بہت تکلیف ہوگی، روئے گا، چلّائے گا، خود بھی پریشان ہوگا اور ہمیں بھی پریشان کرے گا، لہٰذا دودھ نہ چھڑاؤ، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بچہ جوان ہو جائے گا اور دودھ پینے کی عادت نہیں جائے گی۔ لیکن اگر ماں باپ اس کا دودھ چھڑانے کی کوشش کریں گے تو وہ بچہ دودھ چھوڑ بھی دے گا، ایک دن، دو دن، تین دن تک روئے گا، چلّائے گا، پریشان کرے گا، لیکن بالآخر چھوڑ دے گا، ہر بچے کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے۔

نفس کو بے مہار مت چھوڑیں

علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان کا نفس بھی بچے کی طرح ہے، اگر تم نے اس نفس کو بے مہار چھوڑ دیا کہ جو خواہش ہو رہی ہے، اس پر عمل کر رہے ہو اور اس کی ہر خواہش پوری کر رہے ہو تو یہ نفس تمہیں ہلاکت کے گڑھے میں لے جا کر گرا دے گا اور تم کبھی بھی گناہوں سے نجات نہیں پا سکو گے، لیکن اگر تم نے اس کو قابو کر لیا اور اس سے زبردستی گناہ چھڑانے کی کوشش کر لی تو یہ نفس گناہ چھوڑ بھی دے گا، بات ساری کوشش کی ہے۔ یہی معاملہ غصے کا ہے کہ اس کے تقاضے کو دباتے رہو تو رفتہ رفتہ غصہ کا جوش مضمحل ہو جائے گا۔

غصہ کا بہترین علاج

بعض اوقات غصے کو قابو میں کرنے کے لئے اور علاج بھی مفید ہو جاتے ہیں، لیکن وہ علاج بڑے سخت ہیں، وہ علاج حضرت والا نے اس ملفوظ میں بیان فرمائے ہیں، فرمایا:

''اگر طبعی طور سے غصہ زیادہ آجاتا ہو اور ذرا سی بات پر حد سے زیادہ غصہ آجاتا ہو کہ اس وقت عقل نہ رہتی ہو تو اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ جس پر غصہ کیا جائے، غصہ فرو ہونے کے بعد مجمع میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑے، پاؤں پکڑے، بلکہ اس کے جوتے اپنے سر پر رکھ لے، ایک دو بار ایسا کرنے سے نفس کو عقل آجائے گی''(۱)

یعنی جس شخص پر بہت زیادہ غصہ کر لیا اور حدود سے تجاوز کر گئے تو اس کا ایک علاج یہ ہے کہ جب غصہ ختم ہو جائے تو مجمع میں اس سے معافی مانگے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف کر دو، اس کے سامنے ہاتھ جوڑے، اس کے پاؤں پکڑے، اس کے جوتے سر پر رکھ لے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب اگلی مرتبہ غصہ کا موقع آئے گا تو اس وقت نفس یہ سوچے گا کہ یہ تو اچھی خاصی مصیبت ہے، پہلے تو صرف غصے کو پینا ہی تھا، اب تو مجمع کے سامنے ذلت اٹھانی پڑتی ہے، اس ڈر سے غصے کے تقاضے کی شدت میں کمی آجائے گی، ایک دو بار ایسا کرنے سے انشاء اللہ نفس کو عقل آجائے گی۔

اپنی ماں کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگیں

میرے ایک دوست ہیں جو مغلوب الغضب ہیں، غصے کے بہت تیز ہیں، یہاں تک کہ اگر ماں نے بھی کچھ کہہ دیا تو ماں پر غصہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مجھ سے بار بار پوچھتے رہتے ہیں کہ فجر کی نماز میں کیا ذکر کروں، ظہر کی نماز میں کیا تسبیحات پڑھوں۔ میں نے اس سے کہا کہ تم کچھ مت کرو، پہلا کام یہ کرو کہ ماں کے پاس جا کر اس کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگو اور کہو کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف کر دو۔ میری یہ بات سن کر تعجب سے کہنے لگے کہ اچھا حضرت! میں معافی مانگوں، یہ تو بڑا مشکل کام ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو تمہیں کرنا ہوگا، جا کر معافی مانگو اور پاؤں پکڑو اور یہ کام سب بہن بھائیوں کے سامنے کرو۔ کہنے لگے کہ بڑا مشکل ہے۔ میں نے کہا کہ کچھ بھی ہو جائے، لیکن تم یہ کام کرو۔ ان کو یہ عمل بہت شاق گزر رہا تھا کہ میں اپنے تمام بہن بھائیوں کے سامنے ماں سے معافی مانگوں۔ لیکن انہوں نے جا کر یہ کام کیا، جب واپس آئے تو مجھ سے کہا کہ کیا بتاؤں، اس وقت میرے

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۱

سینے پر سانپ لوٹ گئے، آرے چل گئے۔ میں نے کہا کہ میرا بھی یہی مقصد تھا۔ جب دو چار مرتبہ یہ کام ان سے کرایا تو طبیعت اعتدال پر آ گئی۔

بہر حال! انسان کا نفس ان کاموں کو سخت محسوس کرتا ہے، لیکن بعض اوقات یہی کرنا پڑتا ہے۔ جب انسان یہ کڑوی گولی نگل لیتا ہے تو اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے شفا ہوتی ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس مرض سے نجات عطا فرما دیتے ہیں۔

شیخ کی نگرانی میں علاج کرے

مگر یہ کام بھی کسی شیخ کی نگرانی میں کرنے چاہئیں، خود اپنی رائے سے نہ کرے، بعض اوقات اپنی رائے سے کرنے سے بھی نقصان ہو جاتا ہے اور اُلٹا اثر پڑ جاتا ہے، کیونکہ شیخ جانتا ہے کہ کتنی خوراک دوا دی جائے، اگر ضرورت سے زیادہ دوا دے دی تو مصیبت ہو جائے گی اور اگر کم دوا دے دی تو فائدہ نہیں کرے گی، اس لئے شیخ کے ذریعہ یہ علاج کرنا چاہئے۔

غصہ کا ایک اور علاج

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غصہ کے علاج کے لئے اس بات کا کثرت سے استحضار کرنا بھی مفید ہوتا ہے، وہ بات یہ ہے کہ

> ''تجربہ کر کے دیکھا گیا ہے کہ غصہ روکنا ہمیشہ اچھا ہوا اور جب اس کو جاری کیا گیا تو اس کا انجام ہمیشہ برا ہوا اور دل کو قلق بھی ہمیشہ ہوا''(۱)

یعنی زمانہ ماضی کو یاد کرو کہ جتنی مرتبہ غصے کو روکا تو اس کا انجام اچھا ہی ہوا، غصہ روکنے سے نقصان نہ ہوا، اور جب کبھی غصہ کیا اور اس کے تقاضے پر عمل کیا تو بکثرت ایسا ہوا کہ بعد میں ندامت اور شرمندگی ہوئی، اگر آدمی کے اندر ذرا بھی سلامتی طبع ہو تو غصہ کرنے کے بعد قلب میں ظلمت محسوس ہوتی ہے اور کدورت اور ندامت محسوس ہوتی ہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیا خوبصورت بات ارشاد فرمائی:

> ((مَا دَخَلَ الرِّفْقُ فِیْ شَیْءٍ إِلَّا زَانَهٗ وَما نَزَعَ مِنْ شَیْءٍ إِلَّا شَانَهٗ))(۲)
>
> ''نرمی جس چیز میں بھی داخل ہو جائے، اسے زینت بخشے گی اور جس چیز سے بھی نکال دی جائے تو اسے عیب دار بنا دے گی''

لہٰذا نرمی جہاں بھی ہوگی، زینت کا سبب ہوگی۔ اس لئے جب غصہ کرنے سے بکثرت نقصان

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص۱۷۲ (۲) المعجم الأوسط، رقم: ۲۱۸۰ (۲/۳۴۴)

ہوتا ہے اور ندامت ہوتی ہے اور غصہ نہ کرنے سے نہ نقصان ہوتا ہے اور نہ ہی ندامت ہوتی ہے تو پھر آدمی کو وہی کام کرنا چاہئے جس سے آدمی کو ندامت نہیں ہوتی۔

غصہ کے وقت بچے کو نہیں مارنا چاہئے

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''غصے میں بچوں کو ہرگز نہ مارا جائے (چاہے استاذ ہو یا باپ ہو) بلکہ غصہ فرو ہونے کے بعد سوچ سمجھ کر سزا دی جائے، اور بہتر سزا یہ ہے کہ بچوں کی چھٹی بند کر دی جائے، اس کا ان پر کافی اثر ہوتا ہے، مُلّا جی مارنے میں اس واسطے آزاد ہیں کہ ان سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں، بچے تو باز پرس کے اہل نہیں اور والدین کا مقولہ ہے کہ ہڈی ہماری اور چمڑا میاں جی کا۔

مگر یاد رکھو جس حق کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہ ہو، اس کا مطالبہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہوگا، یہاں تک کہ اگر کافر ذمی پر کوئی حاکم ظلم کرے تو حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ اس کی طرف سے مطالبہ کریں گے''(۱)

بچوں کو مارنا بڑا خطرناک معاملہ ہے

بچوں کو مارنے کا معاملہ بڑا خطرناک ہے۔ ہمارے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اور گناہوں کی معافی توبہ کے ذریعہ ممکن ہے، لیکن اگر بچوں پر ظلم کیا جائے تو اس کی معافی کا معاملہ بھی بڑا مشکل ہے، کیونکہ یہ حق العبد ہے اور حق العبد صرف توبہ سے معاف نہیں ہوتا جب تک وہ بندہ معاف نہ کرے جس بندے کی حق تلفی کی گئی ہے، اور یہاں پر بندہ نابالغ ہے اور نابالغ کی معافی بھی معتبر نہیں، حتیٰ کہ اگر وہ نابالغ زبان سے بھی یہ کہہ دے کہ میں نے معاف کیا، تب بھی وہ معافی معتبر نہیں اس لئے اس کی معافی بڑی مشکل ہے، لہٰذا بچوں کو مارنے اور ان پر سختی کرنے میں ڈرتے رہنا چاہئے۔

مدارس میں بچوں کے مارنے پر پابندی

ہمارے مدارس کے جو قاری صاحبان ہیں، وہ اس کے اندر مبتلا ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو عافیت عطا فرمائے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اصول بنا دیا تھا کہ مکتب میں کسی قاری صاحب کو

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۳

مارنے کی اجازت نہیں تھی۔ جب کوئی قاری صاحب پٹائی کرتے تو آپ اس سے باز پرس فرماتے اور کبھی سزا بھی دیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے یہاں تک فرمادیا کہ اب اگر مجھے پتہ چلا کہ کسی قاری صاحب نے بچے کو مارا ہے تو میں مسجد کے صحن میں قاری صاحب کو کھڑا کر کے اسی بچے سے پٹواؤں گا جس کو مارا ہے۔ یہ سختی اس لئے فرمائی کہ یہ معاملہ بڑا خطرناک ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔

غصہ ختم ہونے کے بعد سوچ سمجھ کر سزا دو

اس میں کوئی شک نہیں کہ بچوں کو پڑھانے والے اُستادوں کا کام بہت مشکل ہے، بچوں کو قابو کرنا بڑا دشوار ہوتا ہے اور کبھی نہ کبھی مارنے کی نوبت آ ہی جاتی ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ کوئی اور علاج کارگر نہ ہو رہا ہو اور پٹائی کی نوبت آ ہی جائے تو اس کے بارے میں حضرت فرما رہے ہیں کہ غصے کی حالت میں نہ مارو بلکہ اس وقت طرح دے جاؤ اور جب غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو اس وقت سوچ سمجھ کر سزا دو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اتنی ہی سزا دو گے جتنی سزا کی ضرورت ہوگی اور حد سے تجاوز نہیں کرو گے، اور اگر غصے میں مارنا شروع کر دو گے تو جہاں ایک طمانچہ کی ضرورت تھی، وہاں دس لگ جائیں گے، اس کی وجہ سے ایک تو فی نفسہٖ گناہ ہوا کہ جتنی مارنے کی ضرورت تھی، اس سے زیادہ مار دیا۔ دوسرا یہ کہ نقصان ہوا، کیونکہ جو چیز حد سے زیادہ ہوتی ہے وہ حقیقت میں نقصان دہ ہوتی ہے، تیسرے یہ کہ بعد میں ندامت بھی ہوئی۔

اس لئے اس ملفوظ میں حضرت نے بڑے گُر کی بات فرمادی کہ اس وقت سزا دو جب غصہ ٹھنڈا پڑ جائے، جب طبیعت میں اشتعال ہو رہا ہو، اس وقت سزا مت دو۔

اختتامیہ

غصہ کے بارے میں یہ چند اصول ہیں جو حضرت والا نے بیان فرمادیئے اور یہ بھی بتادیا کہ کونسی چیز مضر ہے اور کونسی چیز مضر نہیں اور اس غصے کے شر سے بچنے کا کیا طریقہ ہے، اب ہر انسان کو اپنے حساب سے ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے، اور عمل کرنے کا بہترین راستہ یہ ہے کہ کسی شیخ سے اس نیت سے رابطہ رکھے کہ مجھے ان رذائل کی اصلاح کرانی ہے اور پھر ان سے مشورہ لیتا رہے، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ رفتہ رفتہ ان رذائل کو دور فرمادیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمارے رذائل کو دور فرمادے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

حسد اور اس کا علاج ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰی آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ. أَمَّا بَعْدُ!

گزشتہ تین دن سے غصہ کا بیان چل رہا تھا، اب آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ''حسد'' کا بیان شروع فرمار ہے ہیں، یہ حسد بھی بڑی خراب باطنی بیماری ہے، یہ بڑی خطرناک بھی ہے اور اس کا چلن بھی بہت زیادہ ہے، یعنی یہ بیماری کثرت سے پیدا ہوجاتی ہے، خاص طور پر ہمارے طبقے میں یعنی طالب علموں کے طبقے میں یہ بیماری بہت زیادہ ہے، لہٰذا بہت زیادہ اہتمام کے ساتھ اس کے ازالے کی فکر کرنی چاہئے۔

تین چیزیں اور ان کا حکم

چنانچہ حسد کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے جو ملفوظات ہیں، وہ ایک ایک پڑھ لیتے ہیں اور ساتھ ساتھ اس کی تشریح بھی ہوجائے گی۔ ایک ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا:

''ایک تو کیفیت انسانیہ ہے جس میں انسان ''معذور'' ہے، ایک عمل ہے مقتضی پر، اس میں انسان مازور (گناہ گار) ہے، ایک مخالفت ہے اس مقتضی کی، اس میں انسان ''ماجور'' ہے، یعنی حسد کے غلبہ سے کسی کی مذمت کا تقاضا ہو تو اس کی مدح کرو، اگر اس سے اعراض کو دل چاہے تو اس سے ملو، اس کی تعظیم کرو، اس کو ابتداء بالسلام کرو اور اس کے ساتھ احسان کرو''(۱)

حسد کس کو کہتے ہیں؟

حسد کے تمام مباحث کو اس مختصر سے ملفوظ میں سمیٹ دیا، سب سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ حسد کس کو کہتے ہیں؟ ''حسد'' اسے کہتے ہیں کہ دوسرے کسی شخص کو جو اچھائی حاصل ہے، اس کی اچھائی سے

☆ اصلاحی مجالس (۴/۱۴۴ تا ۱۶۴)، بعد از نمازِ ظہر، رمضان المبارک، دار العلوم، کراچی

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۳

رنجیدہ ہو کر اس کے زوال کی تمنا کرنا۔

حسد کی مثالیں

مثلاً میرا ایک ہم جماعت ہے، ہم دونوں ایک ساتھ پڑھتے ہیں، میرا ساتھی امتحان میں اوّل آجاتا ہے، اس کے نمبر زیادہ آتے ہیں، اب میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اس کے نمبر کیوں زیادہ آتے ہیں؟ وہ مجھ سے کیوں آگے بڑھ گیا؟ اب دل میں یہ خواہش ہے کہ اس کے نمبر کم آئیں، وہ آئندہ اوّل پوزیشن حاصل نہ کر سکے، چاہے میں پوزیشن حاصل کروں یا نہ کروں، اس سے کوئی بحث نہیں، لیکن یہ اوّل نہ آئے۔ یہ خیال اور جذبہ ''حسد'' ہے۔

یا مثلاً ایک شخص بڑا مالدار ہے، اب آپ کے دل میں یہ خیال آرہا ہے کہ اس کے پیسے کم ہو جائیں، اس کی آمدنی کم ہو جائے، یہ جذبہ ''حسد'' ہے۔ یا مثلاً ایک شخص کی عزت اور شہرت ہے، لوگ اس کی طرف زیادہ رجوع کرتے ہیں، اب دل میں یہ کڑھن ہو رہی ہے کہ لوگ اس کی طرف کیوں مائل ہیں؟ اور دل میں یہ خیال آرہا ہے کہ اس کی عزت اور شہرت ختم ہو جائے، یہ ''حسد'' ہے۔

رشک کرنا جائز ہے

ایک ''غبطہ'' ہوتا ہے، جس کو اُردو میں ''رشک'' کہتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ جب دوسرے شخص کے پاس کوئی نعمت دیکھی تو خیال آیا کہ اس شخص کے پاس یہ نعمت ہے، اللہ تعالیٰ یہ نعمت مجھے بھی عطا فرمادے اور اس کے پاس بھی یہ نعمت رہے۔ مثلاً اس کی صحت اچھی ہے، اللہ تعالیٰ میری صحت بھی اچھی کردے۔ اس کے پاس دولت ہے، اللہ تعالیٰ مجھے بھی دولت عطا فرمادے۔ یا مثلاً فلاں کے پاس علم زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ مجھے بھی علم عطا فرمادے۔ یہ ''رشک'' ہے، اس میں دوسرے کی نعمت کو دیکھ کر اپنے لئے بھی اسی نعمت کے حصول کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ ''رشک'' کرنا منع نہیں، جائز ہے، جبکہ ''حسد'' میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ مجھے یہ نعمت ملے یا نہ ملے، لیکن اس کے پاس سے زائل ہو جائے، یہ ''حسد'' ہے۔

صرف دل کا رنجیدہ ہونا گناہ نہیں

یہ ''حسد'' بڑی خراب چیز ہے۔ اگر صرف دل میں یہ خیال آگیا کہ یہ شخص مجھ سے فلاں چیز میں آگے بڑھ گیا ہے اور اس خیال کے نتیجے میں دل میں تکلیف اور صدمہ اور رنج ہو رہا ہے، لیکن اس رنج اور صدمہ کا کوئی اثر اپنے عمل سے ظاہر نہیں ہونے دیا تو یہ صدمہ اور رنج غیر اختیاری طور پر پیدا ہوا ہے۔

اس کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمار ہے ہیں کہ یہ ''کیفیت انسانیہ'' ہے جس میں انسان معذور ہے بشرطیکہ صرف دل کے اندر تک رہے، نہ اس رنج کا کوئی اثر اپنے کسی عمل سے ظاہر ہو اور نہ اس رنج کے مقتضی پر عمل ہو، اس حد تک کوئی گناہ نہیں۔

دل کے تقاضے پر عمل کرنا گناہ ہے

ہاں! گناہ اس وقت ہوگا جب اس ''حسد'' کے نتیجے میں اس کی بدخواہی میں کوئی کام کرگزرے۔ مثلاً دل میں خیال آیا کہ یہ شخص مجھ سے آگے بڑھ گیا ہے، اب میں لوگوں کے سامنے اس کی برائی بیان کروں تاکہ اس کی عزت میں کمی آئے، یا کوئی ایسی تدبیر اختیار کرے جس کے نتیجے میں اس کی دولت کم ہو جائے، اس کی صحت کم ہو جائے، اس کا علم کم ہو جائے، لوگوں پر اس کے اثرات کم ہو جائیں۔ یا اس کے لئے بددعا کرے کہ یا اللہ! اس کی فلاں نعمت اس سے زائل ہو جائے، یا لوگوں کے سامنے اس کی غیبت کرے، یا مجمع کے سامنے اس کو ذلیل کرنے کی فکر کرے، یا جب اس سے ملاقات ہو تو اس کو سلام نہ کرے وغیرہ، جب ''حسد'' کے نتیجے میں حسد کرنے والا یہ اعمال کرے گا تب یہ ''حسد'' گناہ اور معصیت کی شکل اختیار کرے گا۔ لیکن جب تک ''حسد'' کے نتیجے میں صرف دل میں ایک صدمہ اور تکلیف پیدا ہوئی ہے، اس حد تک یہ ''حسد'' گناہ اور معصیت نہیں کیونکہ یہ بات غیر اختیاری طور پر پید ہوئی ہے۔

البتہ دل کا خیال بھی خطرناک ہے

لیکن ''احیاء العلوم'' میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب یہ حسد دل میں پیدا ہوا اور دوسرے کے خلاف دل میں ایک کڑھن پیدا ہوئی کہ یہ مجھ سے آگے کیوں بڑھ گیا، اگرچہ غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے انسان اس میں معذور ہے اور یہ براہِ راست گناہ نہیں، لیکن یہ خیال اور کڑھن بھی بڑی خطرناک ہے، کیونکہ اگر یہ خیال دل میں کچھ عرصہ تک باقی رہا تو یہی خیال بالآخر اس کو معصیت اور گناہ میں مبتلا کر دے گا اور اس کے نتیجے میں اس سے کوئی نہ کوئی بدخواہی کا عمل دوسرے کے خلاف سرزد ہو جائے گا۔ لہٰذا چاہے ''حسد'' کا خیال بلا اختیار آیا ہو لیکن اس ''حسد'' کو دل میں رکھنا اور اس کی پرورش کرنا بڑا خطرناک ہے، اس لئے نہ اس خیال کی پرورش کرو اور نہ اس کو دل میں باقی رکھو۔

خیال کے علاج کے لئے تین کام کریں

بلکہ اس موقع پر اس کے علاج کے لئے تین کام کرو۔ پہلا کام یہ ہے کہ جو خیال دل میں آیا

ہے،اس کو برا سمجھو کہ یہ خیال جو میرے دل میں آیا ہے، یہ بری بات ہے، کسی مسلمان کے بارے میں ایسی بات سوچنا بہت برا ہے،اس طرح اس خیال کی برائی کا تصور کرو۔ دوسرا کام یہ کرو کہ جس آدمی کے بارے میں یہ خیال پیدا ہوا ہے،اس کے محاسن اور اس کی اچھائیوں کا استحضار کرو، خاص طور پر ان اچھائیوں کا جن کا تعلق تمہاری ذات سے ہو، مثلاً اگر تم کو اس کے ذریعہ کسی موقع پر کسی درجہ میں نفع پہنچا ہے تو گویا کہ اس کا تمہارے اوپر احسان ہے، اگر ایسا ہوا ہے تو خاص طور پر اس احسان کا استحضار کرو۔

تیسرا کام یہ کرو کہ اگر چہ تمہارے دل میں اس کے ''حسد'' کا خیال آرہا ہے اور حسد کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو تکلیف پہنچے، اس کو نیچا دکھایا جائے، اس کی برائی ہو، لیکن بہ تکلف اور زبردستی اس کے حق میں دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو اور زیادہ ترقی عطا فرما۔ یہ دعا کرنا بہت ہی کڑوا گھونٹ ہے، کیونکہ دل تو چاہ رہا ہے کہ وہ ذلیل وخوار ہو، لوگوں کے دلوں میں اس کی وقعت کم ہو اور وہ آگے ترقی نہ کرے، لیکن آپ اس کے لئے دعا کر رہے ہیں کہ یا اللہ! اس کو اور زیادہ ترقی درجات عطا فرما، اس کے علم میں ترقی عطا فرما، اس کی دولت میں ترقی عطا فرما، اس کی صحت میں ترقی عطا فرما، اور جب وہ سامنے آئے تو اس سے ابتداء بالسلام کرو اور اس کی تعظیم واکرام کرو اور لوگوں کے سامنے اس کی تعریف اور اچھائی بیان کرو، ایسا کرنے سے آپ کے سینے پر سانپ لوٹ جائیں گے، لیکن حسد کا علاج یہی ہے۔

ورنہ وہ خیال ہلاکت میں ڈال دے گا

بہر حال مندرجہ بالا تین کام کرو، اگر حسد کرنے والا شخص یہ تین کام نہیں کرے گا تو پھر جو غیر اختیاری خیال دل میں آیا تھا، وہ بالآخر معصیت پر منتج ہو کر رہے گا اور وہ خیال تمہیں ہلاکت میں ڈال دے گا، اور اگر مندرجہ بالا تین کام کر لیے تو انشاء اللہ وہ جو غیر اختیاری خیال آیا تھا، وہ معاف ہو جائے گا۔ اب دوبارہ حضرت والا کا ملفوظ دیکھ لیں۔ حضرت فرما رہے ہیں کہ

''ایک تو کیفیت انسانیہ ہے'' اس کیفیت انسانیہ سے مراد وہ غیر اختیاری خیال ہے جو دل میں آگیا، مثلاً کسی کے تم سے آگے بڑھنے سے تمہارے دل پر چوٹ لگ گئی، اس میں انسان معذور ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر مؤاخذہ نہیں۔ دوسرا یہ کہ اس خیال کے مقتضیٰ پر عمل کرے، مثلاً اس کے درپے آزار ہو گیا، اس کی چغلیاں شروع کر دیں، اس کی غیبت شروع کر دی اور اس کو ذلیل وخوار کرنے کے لئے اس کے پیچھے پڑ گیا، اس کے اندر انسان مازور یعنی گناہ گار ہے۔

تیسرا یہ کہ اس کے مقتضیٰ کی مخالفت کرے، مثلاً دل میں تو یہ خیال آرہا ہے کہ کسی طرح اس کو ذلیل وخوار کروں، لیکن اس تقاضے کے برخلاف اس کی تعریف کر رہا ہے اور اس کے لئے دعا کر رہا ہے، اس عمل کے نتیجے میں انسان ''ماجور'' ہے، یعنی ایسا کرنے پر اس کو اجر وثواب ملے گا۔

خیال کی مخالفت کا نتیجہ

نفس کے اس خیال کی مخالفت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شیطان تمہارے دل میں حسد کا خیال اس لئے لایا تھا تا کہ تمہیں جہنم میں پہنچا دے، کیونکہ حسد کے نتیجے میں جو اعمال تم کرتے، وہ اعمال تم کو تباہ کر دیتے اور جہنم میں پہنچا دیتے، لیکن تم نے یہ کیا کہ جب حسد کا خیال آیا تو تم نے اس خیال کے تقاضے کی خلاف ورزی شروع کر دی، مثلاً اس کے حق میں دعا شروع کر دی اور اس کی تعریف شروع کر دی، تو خیال اوّلاً تمہیں معصیت میں مبتلا کرنے کے لئے آیا تھا، لیکن اس کے مقتضیٰ کے خلاف عمل کرنے کے نتیجے میں بالآخر نیکیوں اور ثواب کا خزانہ تمہارے نامۂ اعمال میں جمع ہو جائے گا۔

کیا گناہ اچھی چیز ہے؟

ہمارے ایک بزرگ حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز صحبت تھے، وہ بڑی عجیب وغریب باتیں کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ گناہ بڑی اچھی چیز ہے۔ ہم نے کہا کہ حضرت! گناہ اور اچھی چیز ہونا، سمجھ میں بات نہیں آئی۔ فرمایا کہ ہاں! گناہ بڑی اچھی چیز ہے، اس لئے کہ جب گناہ کا تقاضا دل میں پیدا ہوا اور انسان زبردستی کر کے اس گناہ سے بچے تو اس کے درجات کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ اگر گناہ نہ ہوتے تو یہ درجات نہ بڑھتے، کیونکہ گناہ انسان کے دل میں جو معصیت اور نافرمانی کا تقاضا پیدا کرتا ہے اور پھر انسان اس تقاضے کی مخالفت کرتا ہے اور اس کو کچلتا ہے تو اس کے درجات میں کہیں سے کہیں ترقی ہو جاتی ہے۔

دو شخصوں میں موازنہ کریں

دیکھئے! ایک وہ شخص ہے جس کے دل میں گناہ کا خیال ہی نہیں آیا، نہ اس کو گناہ کرنے کے مواقع میسر آئے اور وہ گناہوں سے بچتا ہوا گزر گیا تو ان شاء اللہ وہ عذاب سے نجات پا جائے گا۔ لیکن دوسرا شخص وہ ہے کہ قدم قدم پر اس کے دل میں گناہوں کے تقاضے اور داعیے پیدا ہو رہے ہیں، گناہوں کے مواقع بھی میسر آ رہے ہیں، ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو اس کے سامنے گناہ کا ایک تقاضا آ کر کھڑا ہو جاتا ہے، وہ کسی طرح اپنے آپ کو اس گناہ سے بچا کر آگے بڑھتا ہے، جب دوسرا قدم بڑھاتا ہے تو پھر ایک گناہ کا تقاضا پیدا ہوتا ہے، پھر وہ اپنے آپ کو کسی طرح اس سے بچا کر آگے بڑھا تو ایک داعیہ اور پیدا ہو گیا، اس طرح زندگی بھر گناہوں کے تقاضوں سے مقابلہ کرتے ہوئے قبر تک پہنچ گیا۔ فرمایا کہ یہ جو دوسرا شخص ہے جو گناہوں کی کشمکش سے گزرتا ہوا اور اپنے دامن کو گناہوں سے

بچاتا ہوا قبر تک پہنچا ہے، اس کا درجہ پہلے شخص کے مقابلے میں کہیں آگے ہے۔ یہ کیوں آگے بڑھ گیا؟ یہ گناہوں کی وجہ سے آگے بڑھ گیا۔ اس لئے حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ گناہ بڑی اچھی چیز ہے، کیونکہ گناہوں کے تقاضوں کو کچلنے سے درجات بلند ہوتے ہیں۔

انگریزوں کے کباب لذیذ بنیں گے

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی اور جہاد کیا، ان کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی، ان کی ہر چیز سے نفرت تھی اور یہ نفرت غلبۂ حال تک پہنچی ہوئی تھی۔ کسی صاحب نے آکر کہا کہ حضرت! آپ ہر وقت انگریزوں کی برائی ہی بیان کرتے رہتے ہیں، آخر ان میں کوئی اچھائی بھی تو ہوگی؟ دنیا میں کوئی بری چیز ایسی نہیں ہے جس میں کوئی نہ کوئی اچھائی نہ ہو، تو ان انگریزوں میں بھی کوئی تو اچھائی ہوگی؟ کبھی آپ ان انگریزوں کی اچھائی بھی بیان کردیا کریں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہاں بھائی! ان انگریزوں کے کباب بنا کر کھائے جائیں تو بڑے لذیذ ہوں گے، ان میں یہ ایک اچھائی ہے۔

بہر حال! گناہوں کی اچھائی یہ ہے کہ ان گناہوں کے تقاضوں کو کچلا جائے اور ان کے تقاضوں کو دبایا جائے تو اس سے انسان کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ اسی طرح حسد کا جو خیال تمہارے دل میں آیا تھا، یہ اگرچہ تمہیں گناہ کے اندر مبتلا کرنے کے لئے آیا تھا، لیکن جب اس خیال کے تقاضے کے خلاف تم نے عمل کیا تو یہ اُلٹا تمہاری ترقی درجات کا سبب بن گیا۔ اسی طرح گناہوں کے جتنے داعیے اور تقاضے ہیں، وہ بالآخر انسان کی ترقی درجات کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اس لئے اگر تمہارے دل میں حسد کے خیالات آتے ہیں تو ان کو ترقی درجات کے حصول کا ذریعہ بنالو تو پھر انشاء اللہ اس حسد کے خیال سے کوئی ضرر نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حاسد خود حسد کی آگ میں جلتا رہتا ہے

''حسد'' کو صوفیاء کرام نے آگ سے تشبیہ دی ہے، کیونکہ ''حسد'' کے نتیجے میں انسان کے دل میں ''جلن'' پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً کسی دوسرے کو اچھی حالت میں دیکھا اور اس کو اپنے سے بڑھتا ہوا دیکھا تو طبیعت میں ایک جلن پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حسد کے بارے میں ایک عربی شاعر نے کہا ہے

اَلنَّارُ تَاْكُلُ بَعْضَهَا اِنْ لَمْ تَجِدْ مَا تَاْكُلُ (۱)

(۱) البلاغة العربية أسسها وعلومها وفنونها (۱/۶۱۸)، العقد الفريد (۱/۱۹٤)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ حسد کی مثال آگ جیسی ہے اور آگ کی خاصیت یہ ہے کہ جب اس کو دوسری چیز کھانے کو ملے تو تب تو یہ اس کو کھاتی رہے گی، مثلاً لکڑی کو آگ لگی ہوئی ہے تو وہ آگ لکڑی کو کھاتی رہے گی، لیکن جب لکڑی ختم ہو جائے گی تو آگ کا ایک حصہ خود اپنے دوسرے حصے کو کھانا شروع کر دے گا، یہاں تک کہ وہ آگ بھی ختم ہو جائے گی، اسی طرح حسد کی آگ بھی ایسی ہے کہ حسد کرنے والا پہلے تو دوسرے کو خراب کرنے اور دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جب حاسد دوسرے کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تو پھر خود حسد کی آگ میں جل جل کر بیمار ہو جاتا ہے اور اس کو ظاہری بیماری لگ جاتی ہے، کتنے لوگ ہیں جو اس حسد کی آگ میں جل جل کر خود ختم ہو گئے۔

''حاسد'' اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض کرنے والا ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ''حسد'' بہت بڑا گناہ ہے، اس لئے کہ اگر غور کرو گے تو یہ نظر آئے گا کہ ''حسد'' کرنے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور تقسیم پر اعتراض کر رہا ہے، مثلاً یہ کہ فلاں کو مجھ سے کیوں آگے بڑھا دیا گیا؟ فلاں کو آپ نے یہ نعمت کیوں عطا کر دی؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جس شخص کو جو چیز دی ہے، وہ ہم نے اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کس شخص کو کیا چیز دی جائے اور کتنی مقدار میں دی جائے۔ لہٰذا یہ ان کی حکمت کا فیصلہ ہے، اب تم اعتراض کر رہے ہو کہ فلاں کو یہ نعمت اتنی کیوں دی گئی؟ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾(۱)

اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر جو فضیلت عطا فرمائی ہے، اس کی تمنا مت کرو، کیونکہ یہ غیر اختیاری چیزیں ہیں، ان کے اندر تمنا مت کرو کہ یہ چیز اس کو کیوں مل گئی اور مجھے کیوں نہیں ملی۔

یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے

یہ تو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے، کسی کو اچھی صحت دے دی لیکن اس کے پاس پیسہ نہیں، دوسرے کو پیسے کی نعمت دے دی لیکن صحت اچھی نہیں، کسی کو علم کی دولت دے دی لیکن پیسے کی دولت نہیں دی، کسی کو عزت اور شہرت کی دولت دے دی اور دوسری نعمت مثلاً اولاد کی نعمت اس کو میسر نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے فیصلے سے یہ نعمتیں مقرر فرمائی ہیں کہ کس کو کیا نعمت دی جائے، تم اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہو۔

---

(۱) النساء: ۳۲، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جن چیزوں میں ہم نے تم کو ایک دوسرے پر فوقیت دی ہے، ان کی تمنا نہ کرو''

اپنی نعمتوں کی طرف نظر کرو

''حسد'' کے اندر حاسد کو اپنی نعمت کی طرف نظر نہیں ہوتی بلکہ دوسرے کی نعمت کی زوال کی خواہش ہوتی ہے۔ لہٰذا حسد کرنے والا اگر یہ سوچ کہ فلاں کو یہ نعمت ملی ہوئی ہے، مجھے اس کے بجائے دوسری نعمت ملی ہوئی ہے، اس پر غور کرے گا تو حسد کی بیماری دل سے نکل جائے گی، مثلاً یہ کہ فلاں کو پیسے کی نعمت ملی ہوئی ہے لیکن مجھے اللہ تعالیٰ نے علم کی نعمت دی ہے۔ بقول کسی کے۔

رَضِینَا قِسمَةَ الْجَبَّارِ فِینَا
لَنَا عِلْمٌ وَ لِلْجُهَّالِ مَالٌ (۱)

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان جو تقسیم فرمائی ہے، اس پر ہم راضی ہیں کہ جاہلوں کو مال کی نعمت دیدی اور ہمیں انکے مقابلے میں علم کی دولت دے دی۔ لہٰذا آدمی کیوں غمگین اور رنجیدہ ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہئے۔

بہرحال! حسد کے اندر سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض ہوتا ہے، اس لئے اس سے بچنا چاہئے۔

ان خیالات کو برا سمجھو

جیسا کہ کل عرض کیا تھا کہ بعض اوقات دل میں ''حسد'' کے غیر اختیاری خیالات آجاتے ہیں، ان غیر اختیاری خیالات کے آنے میں انسان ایک درجے میں معذور ہے اور اس میں گناہ بھی نہیں۔ لیکن یہ غیر اختیاری خیالات بھی خطرناک ہیں، کیونکہ کسی وقت بھی یہ انسان کو گناہ کے اندر مبتلا بھی کردیتے ہیں، لہٰذا ان کا علاج کرنا ضروری ہے، ان خیالات کا علاج یہ ہے کہ ان کو برا سمجھو اور ان کے مقتضیٰ کے خلاف پر عمل کرو۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> ''اختیاری کی ضد بھی اختیاری ہوتی ہے، پس جو امور حسد سے ناشی ہیں، ان کی ضد کو اپنے اختیار سے عمل میں لاؤ، اس طرح کہ بجائے غیبت کے محسود کی مدح زبان سے کیا کرو، گو نفس کو ناگوار ہو، مگر زبان پر تو اختیار ہے، اور اس سے نیازمندی کے

---

(۱) روضة الأدب، ص: ۱۲، ادب کی بہت سی کتابوں میں ہمیں اس مفہوم کا ایک اور خوبصورت شعر بھی ملتا ہے

رَضِینَا قِسمَةَ الرَّحْمٰنِ فِینَا
لَنَا حَسَبٌ وَلِلثَّقَفِيِّ مَالٌ

ملاحظہ ہو: طبقات الشعراء، (۱/۳۵)، بهجة المجالس وأنس المجالس (۱/۳۹)، الشعر والشعراء (۱/۱۹۲)

ساتھ ملاقات و کلام کرو، اور اس کے ضرر پر زبان سے رنج ظاہر کیا کرو، اس کے سامنے بھی اور دوسروں کے سامنے بھی، اور وہ اگر سامنے آجائے تو اس کی تعظیم کیا کرو، کبھی کبھی اس کو ہدیہ دیا کرو، ایک مدت تک ایسا کرنے سے حسد زائل ہو جائے گا، کم از کم بیس بار اس معاملہ کو واضح کیا جائے"(۱)

یعنی جس کام کا کرنا اختیار میں ہے، اس کا چھوڑنا بھی اختیار میں ہوگا، لہٰذا حسد کے نتیجے میں جو خیال دل میں پیدا ہو رہا ہے کہ میں اس کو ماروں، اس کو برا بھلا کہوں، اس کی اہانت کروں، اس کو لوگوں میں بدنام کروں، اس کی غیبت کروں، حسد کی وجہ سے ان اعمال کو کرنے کا دل میں خیال پیدا ہو رہا ہے اور یہ سب اعمال اختیاری ہیں اور حرام ہیں، لہٰذا ان کی ضد بھی اختیاری ہے۔

جس سے حسد ہو رہا ہے اس کی تعریف کرو

مثلاً دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ اس کو بدنام کروں، لیکن بجائے بدنام کرنے کے اس کی تعریف لوگوں کے سامنے کرو، یہ بھی اختیار میں ہے، اور جب اختیار میں ہے تو اپنے اختیار سے اس کو عمل میں لاؤ۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ "جو امور حسد سے ناشی ہیں، ان کی ضد کو اپنے اختیار سے عمل میں لاؤ، اس طرح کہ بجائے غیبت کے محسود کی مدح زبان سے کیا کرو" یعنی جس سے دل میں حسد پیدا ہو رہا ہے، اس کی برائی کرنے کے بجائے اس کی تعریف کرو، دل تو اس پر آمادہ نہیں ہوگا، لیکن دل کو قابو کر کے زبردستی اس کی تعریف کرو، گو نفس کو ناگوار ہو۔

اب دل تو چاہ رہا ہے کہ میں اس کو گالی دوں یا ایسا برا بھلا کہوں کہ یہ ساری دنیا میں بدنام ہو جائے، لیکن اس حاسد سے اُلٹا یہ کہا جا رہا ہے کہ اس کی تعریف کرو، تعریف کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی کوئی مصنوعی تعریف کرو بلکہ اس کی حقیقی تعریف کرو، کیونکہ دنیا میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے اندر کوئی قابلِ تعریف پہلو نہ ہو، لہٰذا اس محسود کے اندر قابلِ تعریف پہلو کو تلاش کر کے پھر اس کی تعریف کرو کہ ماشاء اللہ اس کے اندر یہ بہت اچھا وصف موجود ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا چور کے پاؤں چومنا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے واقعہ لکھا ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ کسی راستے سے گزر رہے تھے، دیکھا کہ ایک آدمی سولی پر لٹکایا ہوا ہے، اس کا دایاں ہاتھ بھی کٹا ہوا ہے اور اس کا بایاں پاؤں بھی کٹا ہوا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا قصہ ہے؟ لوگوں نے بتایا

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص۱۷۴

کہ اس نے پہلی مرتبہ جب چوری کی تو اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا تھا، جب دوسری مرتبہ اس نے چوری کی تو اس کا بایاں پاؤں کاٹ دیا گیا تھا، اس کے بعد پھر بھی باز نہ آیا اور پھر اس نے چوری کی تو اب اس کے نتیجے میں اس کو سولی پر لٹکایا جا رہا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ آگے بڑھے اور اس چور کے پاؤں کو جو لٹک رہا تھا، اس کو بوسہ دیا۔

لوگوں نے کہا کہ حضرت! آپ جیسا انسان اتنے بڑے چور اور ڈاکو کے پاؤں کو بوسہ دے؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ نے کیوں بوسہ دیا؟ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس شخص کے اندر ایک بہت عمدہ وصف ہے، وہ ہے ''استقامت'' میں نے اس کے اس وصف کو بوسہ دیا ہے۔ اگرچہ اس شخص نے اس ''استقامت'' کے وصف کو غلط جگہ استعمال کیا اور گناہ کے کام میں استعمال کیا، یہ اس کی غلطی ہے، لیکن ''استقامت'' کا وصف بذاتِ خود قابلِ تعریف وصف ہے، اگر یہ شخص اس وصف کو کسی صحیح کام میں لگا لیتا تو یہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔

ہر انسان کے اندر کوئی خوبی ہوتی ہے

لہٰذا ہر انسان کے اندر کوئی نہ کوئی خوبی کی بات ہوتی ہے۔ علامہ اقبال بچوں کے لئے لکھی ہوئی ایک نظم میں کہتے ہیں:

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

لہٰذا دنیا میں جتنی چیزیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے پیدا فرمائی ہیں۔

محسود کی مدح کرو

لہٰذا جس شخص سے تمہارے دل میں حسد پیدا ہو رہا ہے، اس کے اندر کوئی اچھائی تلاش کرو، اس کی کوئی خوبی تلاش کرو، پھر لوگوں کے سامنے اس کی اس اچھائی کو اور خوبی کو بیان کرو، ایسا کرنے سے دل پر آرے چلیں گے، لیکن چلنے دو، کیونکہ جو ''حسد'' کی بیماری دل میں پیدا ہو رہی ہے، اس کا علاج ہی دل پر آرے چلانا ہے، اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''بجائے غیبت کے محسود کی مدح زبان سے کیا کرو گو نفس کو ناگوار ہو، مگر زبان پر تو اختیار ہے'' ایک کام تو یہ کرو۔

محسود سے نیازمندی کے ساتھ ملاقات کرو

دوسرا کام یہ کرو کہ ''اس سے نیازمندی کے ساتھ ملاقات اور کلام کرو''

مثلاً دل تو چاہ رہا ہے کہ اس کا منہ نوچ لوں، لیکن جب ملاقات ہو تو اس سے نیازمندی اور عاجزی کے ساتھ ملاقات کرو اور اس سے بات چیت بھی نرمی کے ساتھ کرو۔

محسود کے ضرر پر رنج ظاہر کرو اور اس کی تعظیم کرو

تیسرا کام یہ کرو کہ "اس کے ضرر پر زبان سے رنج ظاہر کیا کرو"

یعنی اگر اس محسود کو کوئی صدمہ یا کوئی رنج یا کوئی تکلیف پہنچ جائے تو اس تکلیف پر خود بھی اظہارِ رنج کرو، اس کے سامنے بھی کرو اور دوسرے لوگوں کے سامنے بھی کرو۔

چوتھا کام یہ کرو کہ "جب وہ سامنے آجائے تو اس کی تعظیم کیا کرو"

محسود کو ہدیہ دیا کرو

پانچواں کام یہ کرو کہ "کبھی کبھی اس کو ہدیہ دیا کرو"

تاکہ اس کے دل میں بھی تمہاری محبت پیدا ہو، اور تمہارے دل میں بھی اس کی محبت پیدا ہو۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے لئے دوسرے سب کام کرنا تو گوارا ہو جاتا ہے لیکن پیسے خرچ کرنا طبیعت پر بڑا بھاری ہوتا ہے، بقول کسی کے "گر جان طلبی حاضر است، گر زر طلبی سخن دریں است" لہٰذا پیسہ جیب سے نکالنا بڑا بھاری ہوتا ہے، لیکن یہ کڑوا گھونٹ بھی پیو۔ اب تم اس کو ہدیہ دو گے تو یہ ہوگا کہ جیب سے پیسے بھی نکلیں گے اور ایسے شخص کے پاس جائیں گے جس سے سخت نفرت ہے، اور جب یہ سب کام "حسد" کی مخالفت میں کرو گے تو اس کے نتیجے میں ان شاء اللہ یہ حسد کی بیماری زائل ہو جائے گی۔

یہ کام بار بار کرنے سے حسد دور ہوگا

آگے حضرت والا نے فرمایا: "ایک مدت تک ایسا کرنے سے "حسد" زائل ہو جائے گا، کم از کم بیس بار اس معاملے کو واضح کیا جائے" یعنی بیس مرتبہ یہ کام کرو۔ چونکہ ایک صاحب نے خط میں حضرت والا کو لکھا تھا کہ مجھے فلاں آدمی سے "حسد" ہے، اس پر حضرت والا نے اس کا علاج فرمایا کہ اس کی تعریف کرو، اس کی تعظیم کرو، اس کو ہدیہ دو، اور کم از کم بیس مرتبہ یہ عمل کرو تو ان شاء اللہ یہ حسد زائل ہو جائے گا۔

حسد اور حقد میں فرق

ایک اور خط کے جواب میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا:

"اگر کسی کے نقصان کی خبر سننے یا برائی کی خبر سننے سے دل خوش ہو تو یہ "حسد" کا مادّہ ہے، اور اگر اس شخص سے رنج پہنچا ہو تو "حقد" کا مادہ ہے، مگر "مادہ" پر مواخذہ نہیں، اگر اس کے مقتضیٰ پر عمل کیا جائے تو مواخذہ ہے اور عمل اختیاری ہے، اس سے بچنا اختیاری ہے، لیکن مادہ کو مضمحل کرنا ضروری ہے تا کہ بڑھ نہ جائے، اس کی تدبیر یہی ہے کہ شرمندہ ہوں اور حق تعالیٰ سے توبہ کریں اور دعا کریں کہ اس کو (اللہ تعالیٰ) دفع کریں اور اس شخص کی اعانت کریں، خواہ مال سے، یا بدن سے یا دعا سے، اس سے وہ "مادہ" کالعدم ہو جائے گا"(۱)

اس خط میں حضرت والا نے "حسد" اور "حِقد" میں فرق بیان فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا کہ "اگر کسی کے نقصان کی خبر سننے سے دل خوش ہو" مثلاً کسی کے گھر میں چوری ہو گئی یا ڈاکہ پڑ گیا تو اب دل خوش ہوا کہ اچھا ہوا اس کے پیسے کم ہو گئے، یا مثلاً کسی کو تجارت میں نقصان ہو گیا تو دل خوش ہوا کہ چلو اچھا ہوا، یہ بہت اکڑ رہا تھا تو یہ زوالِ نعمت پر خوش ہونا، یہ بھی حسد کا ایک حصہ ہے، اگر اس طرح دل خوش ہو تو یہ "حسد" ہے۔

یہ کینہ ہے

اور اگر کسی شخص سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی اور اس تکلیف پہنچنے کے نتیجے میں دل میں اس شخص کی نفرت پیدا ہو گئی، اور اس نفرت کی وجہ سے اس کو صدمہ پہنچنے سے تمہیں خوشی ہوتی ہے، اس کو تکلیف پہنچنے سے تمہیں راحت حاصل ہوتی ہے، تو یہ صورت "حقد" کہلائے گی۔ گویا کہ تمہارے دل میں "کینہ" ہے، کیونکہ "کینہ" کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص نے تمہیں تکلیف پہنچائی، اس کے نتیجے میں تمہارے دل میں اس سے انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہوا، لیکن دل میں جس طرح کا انتقام لینے کی خواہش تھی، ویسا انتقام تم نہ لے سکے اور اس کے نتیجے میں تمہارے دل میں گھٹن پیدا ہو گئی، اور اس گھٹن نے اس آدمی کی نفرت تمہارے دل میں پیدا کر دی، اور اب اس کی برائی اور تکلیف سے دل میں خوشی کا جذبہ پیدا ہو گیا اور اس کی بدخواہی دل میں پیدا ہو گئی، اس کا نام "کینہ" ہے۔ اسی کا بیان آگے انشاء اللہ تعالیٰ مستقل آئے گا۔ بہر حال! حضرت والا یہاں پر "حسد" اور "کینہ" کے درمیان فرق بیان فرما رہے

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۴

ہیں کہ اگر صرف یہ بات ہو کہ اس کی برائی سے خوشی ہو تو یہ حسد ہے اور اگر اس شخص سے رنج پہنچا ہے، اور اس کے نتیجے میں یہ صورت پیدا ہوئی ہو تو یہ ''حقد'' اور ''کینہ'' ہے۔

مادہ کو کمزور کرنا ضروری ہے

آگے حضرت والا فرمارہے ہیں کہ ''مگر مادہ پر مواخذہ نہیں''

یعنی دل میں جو غیر اختیاری خیال پیدا ہوا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی گرفت نہیں، اگر اس کے مقتضیٰ پر عمل کیا جائے تو مواخذہ ہے۔ یعنی دل میں حسد کا خیال آنے کے بعد کوئی ایسا بدخواہی کا عمل کرنا جس سے اس کو تکلیف پہنچے، اس کو رنج اور صدمہ پہنچے تو اس پر مؤاخذہ ہے۔ اور عمل اختیاری ہے اور اس سے بچنا بھی اختیاری ہے لیکن مادہ کو مضمحل کرنا ضروری ہے تاکہ بڑھ نہ جائے، یعنی صرف مادہ کا پیدا ہونا گناہ نہیں لیکن اس مادہ کو کمزور کرنا بڑا ضروری ہے تاکہ بڑھے نہیں۔

''اس کی تدبیر یہی ہے کہ شرمندہ ہو اور حق تعالیٰ سے توبہ کرے، اور اللہ تعالیٰ سے اس کے دفع ہونے کی دعا کرے اور اس شخص کی اعانت کرے خواہ مال سے یا بدن سے یا دعا سے، اس سے وہ مادہ کالعدم ہو جائے گا''

شیطان کی حکایت

اللہ بچائے یہ ''حسد'' بڑی خراب چیز ہے، خاص طور پر ہمارے اہل علم کے طبقے میں زیادہ پایا جاتا ہے، کیونکہ یہ علم ایسی چیز ہے کہ اس کے اندر ترفع کی شان ہے، اس وجہ سے دوسرے شخص کو علم میں آگے بڑھتا ہوا اور ترقی کرتا ہوا دیکھ کر اور اس کی مقبولیت دیکھ کر بعض اوقات اس کی طرف سے دل میں حسد پیدا ہو جاتا ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک شخص نے خواب میں شیطان کو ایک بنجارے کی شکل میں دیکھا۔ ''بنجارہ'' اس کو کہتے ہیں جو اپنا سامانِ تجارت ایک گٹھڑی میں باندھ کر اور اپنے کندھے پر لاد کر گاؤں گاؤں محلے محلے اس سامان کو بیچتا پھرتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی مشہور نظم ہے جس میں وہ یہ کہتا ہے کہ

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

بہر حال! خواب میں دیکھا کہ شیطان ایک بنجارے کی طرح بہت ساری گٹھڑیاں اپنے کندھے پر لادے جارہا ہے، وہ گٹھڑیاں بھی عجیب وغریب تھیں، کسی گٹھڑی میں پاخانہ بھرا ہوا ہے، کسی گٹھڑی میں پیشاب بھرا ہوا ہے، کسی گٹھڑی میں پیپ وغیرہ، ساری دنیا کی نجاستیں اس کے پاس موجود تھیں اور ہر گٹھڑی پر کچھ نہ کچھ لکھا ہوا ہے، کسی پر لکھا ہے ''حسد''، کسی پر ''کینہ''، کسی پر ''حبِ مال''

کسی پر "حبِ جاہ" وغیرہ۔

کسی شخص نے شیطان سے پوچھا کہ تم یہ لے کر کہاں جارہے ہو؟ شیطان نے کہا کہ یہ سامانِ تجارت ہے، اس کو بیچنے جارہا ہوں۔ اس شخص نے کہا کہ یہ سب گندگی ہے، یہ کون تیرے سے خریدے گا؟ شیطان نے کہا کہ مجھے اپنے مال کی منڈیاں معلوم ہیں کہ کس منڈی میں میرا مال فروخت ہوگا، یہ "حبِ مال" تاجروں کے علاقے میں لے جاکر فروخت کروں گا، وہ مجھ سے یہ مال خرید لیں گے، یہ "حبِ جاہ" اور "حسد" اس کی منڈیاں علماء ہیں، جب علماء کے پاس لے جاؤں گا تو وہ اس کو ہاتھوں ہاتھ خرید لیں گے۔ العیاذ باللہ۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔

علم سے حبِ جاہ اور حسد پیدا ہوجاتا ہے

بہرحال! اگر علم کے ساتھ اخلاص نہ ہو تو اس علم کے نتیجے میں "حبِ جاہ" پیدا ہوتی ہے اور حبِ جاہ" کے نتیجے میں "حسد" پیدا ہوجاتا ہے، کیونکہ جب دوسرے کو علم کے اندر آگے بڑھتا ہوا دیکھے گا تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ یہ مجھ سے کیوں آگے بڑھ گیا؟ اس کی شہرت کیوں زیادہ ہوگئی؟ اس کی طرف لوگوں کا رجوع کیوں زیادہ ہونے لگا؟ اگر علم کے ساتھ اخلاص ہو کہ وہ علم اللہ تعالیٰ کے لئے ہو تو پھر "حسد" اور "حبِ جاہ" پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا، بلکہ کوئی دوسرا علم کے اندر آگے بڑھ جائے گا تو خوشی پیدا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رحمت سے اخلاص عطا فرمائے۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا اخلاص

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ یہ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہم سبق تھے اور دونوں کو آپس میں ایک دوسرے سے بڑی محبت تھی اور اس درجے کی محبت تھی کہ حضرت والد صاحب کی ہر کتاب کے دو نسخے رکھا کرتے تھے، اور چونکہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی تھا، اس لئے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب کا جو نام رکھتے تھے، وہ بھی اپنی کتاب کا وہی نام رکھتے تھے، چنانچہ والد صاحب نے قرآن کریم کی تفسیر لکھی اور اس کا نام "معارف القرآن" رکھا، انہوں نے بھی قرآن کریم کی تفسیر لکھی اور اس کا نام بھی "معارف القرآن" رکھ دیا، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب "دعاوی مرزا" کے نام سے لکھی، انہوں نے بھی ایک کتاب "دعاوی مرزا" کے نام سے لکھی، کئی کتابیں ایک ہی نام کی لکھیں۔

حسد کی وجہ سے تعلقات کی خرابی

لاہور میں قیام تھا، ایک مرتبہ میں لاہور گیا اور ان سے ملاقات کے لئے پہنچا تو مجھ سے فرمایا کہ ''مولوی شفیع'' سے میرا اسلام کہیو''

لفظ ''مولوی'' سے آگے مولانا کا لفظ کبھی نہیں بولتے تھے، پھر فرمانے لگے کہ مولوی شفیع سے ہمارا باون سال کا تعلق ہے اور الحمدللہ اس باون سالہ تعلق کے دوران کبھی دل میں ایک دوسرے کے خلاف بال بھی نہیں آیا۔ پھر فرمانے لگے کہ یہ بتاؤں کہ ایک دوسرے کے خلاف بال بھی کیوں نہیں آیا؟ فرمایا کہ بال اس لئے نہیں آیا کہ مولویوں کے درمیاں جو تعلقات خراب ہوتے ہیں، اس کی وجہ ''حسد'' ہوتی ہے کہ فلاں ہم سے آگے کیوں نکل گیا؟ اس حسد کی وجہ سے کدورتیں پیدا ہوتی ہیں اور اس کے نتیجے میں تعلقات خراب ہوتے ہیں، الحمدللہ! میرا مولوی شفیع سے اس قسم کا حسد کبھی ہوا ہی نہیں۔

بے مثال دوستی کا نمونہ

پھر فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤں کہ ہمارے درمیان ''حسد'' کیوں نہیں ہوا؟ میں نے کہا: بتادیں۔ فرمایا کہ تم نے ''کافیہ'' پڑھا؟ میں نے کہا: جی ہاں! پڑھا۔ فرمایا کہ اس میں توابع کا بیان آتا ہے، وہ تم نے پڑھا؟ میں نے کہا: جی ہاں! پڑھا۔ فرمایا کہ اس توابع میں ایک نعت ہوتی ہے، وہ پڑھی؟ میں نے کہا کہ جی ہاں! پڑھی۔ فرمایا کہ نعت کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک متبوع کی نعت اور ایک متعلق متبوع کی نعت، مثلاً اگر ''زیدن العالم'' کہو تو ''عالم'' زید کی نعت اور اس کی صفت ہے، اور کبھی متعلق متبوع کی نعت ہوتی ہے، جیسے ''زیدن العالم غلامہ'' اس میں ''عالم'' اگرچہ اصلاً غلام کی نعت ہے، لیکن جب ترکیب کروگے تو یوں کہوگے ''زید'' موصوف ''العالم غلامہ'' صفت، حالانکہ ''العالم'' زید کی صفت نہیں ہے بلکہ اس کے متعلق یعنی غلام کی صفت ہے، مگر پھر بھی ترکیب میں اس کو ''زید'' ہی کی صفت کہا جاتا ہے۔

یہ ساری تفصیل بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ مولوی صاحب! جب مولوی شفیع کا کوئی علمی کارنامہ میرے سامنے آوے تو میں یوں سمجھوں کہ میں ''زیدن العالم اخوہ'' کی قبیل سے ہوں اور جو تصنیف انہوں نے کی ہے، وہ حقیقت میں تو ان کی ہے لیکن ان کے واسطے سے میری بھی ہے، اس وجہ سے ہمارے درمیان طویل عرصے کی دوستی کے باوجود کبھی دل میں حسد پیدا نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ یہ جذبہ ہم سب کو عطا فرمادے۔

علم کے ساتھ اخلاص اور خادمیت کا جذبہ

لہٰذا علم کے اندر اخلاص ہونا چاہئے، یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے علم حاصل کرنا چاہئے، یہ علم اس لئے نہیں ہے کہ اس کے ذریعے دوسروں پر فضیلت جتائی جائے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحبؒ کیا خوبصورت بات ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ کیا یہ علم اللہ تعالیٰ نے دوسروں پر جتلانے کے لئے دیا ہے؟ ارے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک نعمت دی ہے، اس نعمت کو صحیح مصرف پر استعمال کرو، اس علم کا صحیح مصرف یہ ہے کہ اس علم کے ذریعہ دوسروں کو نفع پہنچاؤ اور اس کے ذریعہ دوسروں کی خدمت کرو، تم خادم ہو اور دوسری مخلوق مخدوم ہے، علم کے ساتھ یہی خدمت کا جذبہ انسان کے اندر پیدا ہونا چاہئے، نہ یہ کہ اس کے ذریعہ دوسروں پر اپنی فضیلت جتائی جائے۔

پھر حسد پیدا نہیں ہوگا

اور جب یہ اخلاص پیدا ہو جائے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کوئی دوسرا شخص علم کے اندر تم سے آگے بڑھتا نظر آئے گا اور اس کے ذریعہ لوگوں کو فائدہ پہنچتا نظر آئے گا تو تم یہی سمجھو گے کہ میرا ہی مقصد حاصل ہو رہا ہے، لہٰذا اس پر خوش ہونا چاہئے، نہ یہ کہ اس پر رنجیدہ ہوں۔

شہرت خراب چیز ہے

یہ ''شہرت اور حبِ جاہ اور مقبولیت'' دین کے اعتبار سے تو یہ خراب چیز ہے، حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی راحت کے اعتبار سے بھی بڑی خراب چیز ہے، اس کے نتیجے میں آدمی کسی کام کا نہیں رہتا، آدمی ایسی فضول چیز کو حاصل کرنے کی طرف کیوں توجہ کرے اور اس کی وجہ سے دوسروں سے کیوں حسد کرے۔ ارے بھائی! اگر لوگ تمہارے مقابلے میں دوسروں کی طرف زیادہ متوجہ ہو رہے ہیں تو تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ تمہارا کام آدھے سے زیادہ دوسرا انجام دے رہا ہے، اس لئے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، نہ یہ کہ اس سے حسد کرنے بیٹھ جاؤ۔

خلاصہ: بہر حال! اگر دل میں یہ اخلاص رہے تو پھر حسد کی جڑ کٹ جاتی ہے، اور اس حسد سے بچنے کا بڑا ذریعہ یہ ہے کہ ہر عمل میں اخلاص پیدا کرو، جوں جوں اخلاص پیدا ہوگا، انشاء اللہ یہ حسد زائل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

کینہ اور اس کا علاج ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَأَصْحَابِہٖ أَجْمَعِیْنَ. أَمَّا بَعْدُ!

گزشتہ دو روز سے ''حسد'' کا بیان چل رہا تھا، جو الحمد للہ مکمل ہو گیا۔ آگے حضرت والا ایک اور باطنی بیماری حِقد یعنی کینہ کا بیان شروع فرما رہے ہیں۔

یہ ''کینہ'' بھی انسان کے دل کی ایک بہت بڑی بیماری ہے، یہ اتنی بڑی بیماری ہے کہ ایک حدیث میں حضورِ اقدس نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''شبِ براءت میں اللہ تعالیٰ بے شمار انسانوں کی مغفرت فرماتے ہیں اور قبیلہ بنی کلب کی بکریوں کے جسم پر جتنے بال ہیں، ان بالوں کی مقدار کے برابر انسانوں کی مغفرت فرماتے ہیں''

''قبیلہ بنی کلب'' بہت بڑا قبیلہ تھا جو ہزارہا افراد پر مشتمل تھا اور ہر شخص کے پاس بکریوں کے ریوڑ تھے، ان کی بکریاں بھی ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ہوں گی، آپ نے فرمایا کہ اس قبیلے کی بکریوں کے جسم پر جتنے بال ہیں، اتنے انسانوں کی مغفرت اللہ تعالیٰ اس رات میں فرماتے ہیں لیکن دو آدمیوں کی مغفرت نہیں فرماتے۔ (۱)

پاجامہ نیچے لٹکانے والا

دیکھئے! رحمت کا دروازہ اس رات میں کھلا ہوا ہے، رحمت کے پروانے تقسیم ہو رہے ہیں، لیکن اس رات میں دو آدمیوں کی مغفرت نہیں ہوتی، ایک وہ شخص جس کی شلوار یا پاجامہ یا تہبند ٹخنوں سے نیچے لٹکا ہوا ہو۔ العیاذ باللہ۔ کیونکہ یہ تکبر کی علامت ہے اور جو آدمی اس رات میں بھی تکبر سے باز نہ آئے، اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنے اور گڑگڑانے کے بجائے تکبر کا کام کرے تو اللہ تعالیٰ

☆ اصلاحی مجالس (۴/۱۶۶ تا ۱۸۶)، بعد از نمازِ ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب ما جاء في ليلة النصف من شعبان، رقم: ۱۳۸۰، مسند أحمد، رقم: ۶۳۵۳

فرماتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ہماری مغفرت کی ضرورت نہیں، اس لئے ہم اس کی مغفرت نہیں کرتے۔

کینہ رکھنے والے سے اللہ کی ناراضگی

دوسرا وہ شخص جس کے دل میں دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ ہو، بغض ہو، اللہ تعالیٰ اس کی بھی مغفرت نہیں فرماتے، چاہے وہ نمازیں پڑھ رہا ہو، چاہے وہ سجدے کر رہا ہو، چاہے وہ روزے رکھ رہا ہو یا رات کو جاگ رہا ہو، شبِ برأت اور شبِ قدر میں بھی اس کی مغفرت نہیں ہوتی۔ یہ کینہ اور بغض اتنی خراب چیز ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ کی مغفرت کے خزانے لٹ رہے ہیں، اس وقت بھی یہ شخص محروم ہے جس کے دل میں کینہ ہے، اس لئے اس سے ڈرنا چاہئے اور اس کی فکر کرنی چاہئے کہ کسی مسلمان کی طرف سے دل میں کینہ نہ ہو۔ مسلمان کا کام یہ ہے کہ ۔

کفر است در طریقتِ ما کینہ داشتن
آئین ما است سینہ چوں آئینہ داشتن

ہمارے طریقے میں دوسرے مسلمان کی طرف سے دل میں کینہ رکھنا کفر ہے، اور ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہمارا سینہ آئینہ کی طرح صاف شفاف ہو، اس میں کسی دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ نہ ہو۔

''کینہ'' کسے کہتے ہیں؟

''کینہ'' کیا ہے؟ اس کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''کینہ'' وہ ہے جو اختیار و قصد سے کسی کی برائی اور بدخواہی دل میں رکھی جائے اور اس کو ایذاء پہنچانے کی تدبیر بھی کرے''(۱)

اپنے اختیار سے کسی شخص کی بدخواہی دل میں پال لی اور اس کی تدبیر بھی کر رہا ہے کہ اس کو تکلیف پہنچے، اس کا نقصان ہو اور اس کے درپے آزار ہو جائے۔ اس کو ''کینہ'' کہا جاتا ہے۔

کینہ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟

یہ ''کینہ'' اکثر اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص سے آپ کو کوئی رنج یا کوئی تکلیف پہنچی، اس رنج اور تکلیف پہنچنے کے نتیجے میں آپ کو اس پر غصہ آیا اور دل چاہ رہا ہے کہ میں بھی اس کو کوئی رنج اور تکلیف پہنچاؤں، لیکن جس شخص نے آپ کو تکلیف پہنچائی ہے وہ ایسا آدمی ہے کہ تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۴

سکتے، کیونکہ وہ یا تو عمر میں تم سے بڑا ہے یا مرتبے میں تم سے بڑا ہے اور تمہارا اس کے اوپر بس نہیں چلتا، اور بس نہ چلنے کی وجہ سے تم اس سے انتقام نہیں لے سکتے اور تمہارے پاس انتقام لینے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ لہٰذا ایک طرف تو غصہ آرہا ہے اور طبیعت میں اس کے خلاف اوٹن ہو رہی ہے اور اس کے خلاف دل میں جذبات پیدا ہو رہے ہیں اور دوسری طرف ان جذبات کے نکلنے کا کوئی راستہ بھی نہیں ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دل کے اندر گھٹن پیدا ہو رہی ہے، وہ گھٹن انسان کے اندر ''کینہ'' پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ وہ سوچتا ہے کہ اس وقت تو مجھے بدلہ لینے کا موقع نہیں ہے، لیکن جب کبھی موقع ملا تو میں اس کو چھوڑوں گا نہیں، یہ کینہ ہے۔

یہ خیال گناہ نہیں

اور اگر دل میں اتنا خیال ہو کہ جب مجھے موقع ملے گا تو جتنی تکلیف اس نے پہنچائی تھی، میں بھی اتنی تکلیف پہنچا دوں گا، تو یہ گناہ کی بات نہیں، کیونکہ شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ اگر کسی دوسرے شخص نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہے تو تم بھی اس کو اتنی ہی تکلیف پہنچا سکتے ہو۔

غصہ میں انسان حد پر نہیں رہتا

لیکن یہ غصہ اور یہ گھٹن انسان کے دل میں یہ جذبہ پیدا کر دیتی ہے کہ اگر میرا قابو چل گیا تو اس نے جتنی تکلیف مجھے پہنچائی ہے، اس سے دس گنی تکلیف میں اس کو پہنچاؤں گا، کیونکہ جو آدمی حدود کا پابند نہیں ہوتا، وہ کبھی حد پر نہیں رہتا۔ جو لوگ آپس میں گالی گلوچ کرتے ہیں، ان کا طریقہ یہ ہے کہ جب ایک نے یہ گالی دی کہ تو احمق اور بیوقوف ہے تو دوسرا جواب میں فوراً یہ کہے گا کہ تو بیوقوف، تیرا باپ بیوقوف، تیرا دادا بیوقوف، وہ کبھی ایک پر اکتفا نہیں کرے گا بلکہ باپ دادا تک پہنچ جائے گا۔ جس شخص کے اخلاق کا تزکیہ نہ ہوا ہو، وہ کبھی حد پر قائم نہیں رہتا۔ جیسا کہ عربی کا مقولہ ہے:

''اَلْجَاهِلُ إِمَّا مُفْرِطٌ أَوْ مُفَرِّطٌ''

جاہل کا جذبہ صرف ایک مرتبہ ''بیوقوف'' کہہ دینے سے ٹھنڈا نہیں ہوتا بلکہ اور آگے بڑھتا ہے۔ اسی طرح جب دوسرے کو تکلیف پہنچانے کا موقع آجائے تو اس میں حد پر نہیں رہے گا، مثلاً کسی نے اس کو ایک ہاتھ مارا تو وہ جواب میں دو ہاتھ مار دے گا۔

انتقام لینے کا جذبہ کینہ ہے

لہٰذا جب آگے بڑھنے کا جذبہ موجود ہے تو وہ دل میں یہ ٹھانے ہوئے ہے کہ جب کبھی انتقام

کا موقع ملے گا تو اس کو چھوڑوں گا نہیں، یہ بدخواہی جو دل میں پیدا ہو رہی ہے، اسی کا نام ''کینہ'' اور ''بغض'' ہے، اس ''کینہ'' کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جہاں اس کو تکلیف پہنچانے کا موقع ہوگا تو اس کو تکلیف پہنچادے گا، جہاں بدنام کرنے کا موقع آئے گا وہاں بدنام کردے گا، جہاں اس کی غیبت کرنے کا موقع ملے گا، تو اس کی غیبت کردے گا، جہاں زبان سے اس کی دل آزاری کا موقع ملے گا تو زبان سے دل آزاری کرے گا، طنز و طعنہ کے تیر اس کے اوپر برسائے گا، ان سب کاموں کا سبب بغض اور کینہ ہے، اس کینہ اور بغض کا ازالہ ضروری ہے۔

انسان کے پاس ترازو نہیں

دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حق دیا ہے کہ جس شخص نے آپ کو جان بوجھ کر تکلیف پہنچائی ہے تو آپ اس سے انتقام لے سکتے ہیں، مگر اتنا ہی انتقام لے سکتے ہیں جتنی تکلیف اس نے پہنچائی ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ یہ حد مقرر ہے، اس سے آگے بڑھنا جائز نہیں، لیکن یہ کیسے پتہ چلے کہ کس موقع پر انسان سرحد پار کر گیا؟ اس لئے کہ انسان کے اپنے پاس ایسا کوئی ترازو نہیں ہے جس سے وہ یہ پتہ چلائے کہ میں کس موقع پر حد پر قائم رہا اور کس موقع پر حد سے آگے بڑھ گیا، کہاں میں نفسانی جذبے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے انتقام لے رہا ہوں اور کہاں میں اللہ کے لئے بدلہ لے رہا ہوں، اس کا پتہ نہیں چلتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سبق آموز واقعہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی نے ان کے سامنے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کا کلمہ کہہ دیا۔ العیاذ باللہ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہاں برداشت کرنے والے تھے، انہوں نے اس کو پکڑ کر زمین پر گرایا اور اس کے سینے پر سوار ہو گئے، جب یہودی نے دیکھا کہ اب بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے تو اس نے نیچے پڑے پڑے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منہ پر تھوک دیا، جب یہودی نے تھوکا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کو چھوڑ کر کھڑے ہو گئے، لوگوں نے کہا کہ اب تو اور زیادہ سزا دیئے جانے کے لائق تھا اور آپ نے اس کو چھوڑ دیا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اب تک تو میں اس سے اس لئے لڑ رہا تھا کہ اس نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی، لہٰذا میری اس کے ساتھ جو لڑائی تھی، وہ اپنی ذات کے لئے نہیں تھی بلکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھی، لیکن جب اس نے میرے منہ پر تھوک دیا تو مجھے غصہ آیا اور اس سے انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہوا، لہٰذا اب اگر میں اس سے انتقام لیتا تو اپنی ذات کے لئے انتقام لیتا اور اپنی ذات کے لئے میں انتقام لینا نہیں چاہتا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تزکیہ شدہ تھے

یہ تھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا "یُزَکِّیْھِمْ" یعنی اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے تزکیہ کے لئے بھیجا تھا۔ چنانچہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ایسا تزکیہ کیا جیسا کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں دیکھا۔

بہرحال! آدمی جب دوسرے سے انتقام لیتا ہے تو عام طور پر حد پر نہیں رہتا بلکہ حد سے آگے بڑھ جاتا ہے، اور اگر انتقام نہ لے سکا تو اس کے نتیجے میں کینہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ آمین۔ یہ کینہ بڑی خطرناک بیماری ہے۔

"کینہ" کا علاج

اس کا علاج بھی وہی ہے جو حسد کا علاج ہے یعنی اپنے نفس پر جبر کر کے لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کرو اور اس کے حق میں دعاءِ خیر کرو کہ یا اللہ! دنیا و آخرت میں اس کے درجات بلند فرما، یا اللہ یہ شخص جس کی طرف سے میرے دل میں برائی کے پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں، اس کو دنیا میں بھی ترقی عطا فرما اور آخرت میں بھی ترقی عطا فرما۔ اس طرح کرنے کے نتیجے میں سینے پر سانپ لوٹ جائیں گے، کیونکہ دل میں اس کی طرف سے کینہ، بغض اور بدخواہی ہے اور دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ اس کا منہ نوچ ڈالوں، لیکن زبان سے اس کی تعریف کر رہے ہو اور اس کے لئے دعا کر رہے ہو کہ یا اللہ! اس کے درجات بلند فرما۔ لیکن اس بیماری کا علاج بھی یہ ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ﴾ (۱)

یعنی یہ کام وہی کر سکتا ہے جس نے اپنے آپ کو صبر کا عادی بنایا ہو اور یہ کام وہی کر سکتا ہے جو بڑا صاحبِ نصیب ہو۔ اس کے ذریعہ خوشخبری دے دی کہ جو شخص یہ کام کرے گا وہ بڑا صاحبِ نصیب ہوگا۔

جنت کے لئے قربانی دینی پڑتی ہے

بھائی! جنت اس قدر سستی نہیں ہے، اس کے لئے تھوڑی سی قربانی دینی پڑتی ہے۔ بعض اوقات جان کی قربانی دینی پڑتی ہے، بعض اوقات مال کی قربانی دینی پڑتی ہے اور بعض اوقات جذبات

---

(۱) حٰمٓ السجدۃ: ۳۵، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "اور یہ بات صرف انہی کو عطا ہوتی ہے جو صبر سے کام لیتے ہیں، اور یہ بات اسی کو عطا ہوتی ہے جو بڑے نصیبے والا ہو"

کی قربانی دینی پڑتی ہے اور جذبات کی قربانی بعض اوقات جان و مال کی قربانی سے زیادہ سخت ہوتی ہے، لیکن یہ جذبات کی قربانی اللہ تعالیٰ کے لئے دینی پڑتی ہے، بقول کسی کے۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

لہٰذا جس آدمی کی طرف سے دل میں نفرت پیدا ہو رہی تھی، اسی کے حق میں دعا کی اور جب اللہ تعالیٰ یہ دیکھتے ہیں کہ میرے بندے نے میری خاطر یہ کام کیا، اس نے میری خاطر اپنی نفسانی خواہشات کو کچلا، اپنے جذبات کو قربان کیا اور اپنے دل کی آرزوؤں اور تمناؤں کا خون کیا تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو بلند مقامات تک پہنچا دیتے ہیں۔

اس کے اندر اچھائی تلاش کرو

بہر حال! پہلا کام یہ کرو کہ تمہارے دل میں اس کی طرف سے جو برائی آرہی ہے، اس کو برا سمجھو کہ میرے دل میں جو بات آرہی ہے، وہ اچھی نہیں ہے، ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ اور اس برے خیال کو دور کرنے کا ایک طریقہ حضورِ اقدس ﷺ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا:

((لَایَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً اِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ))(۱)

یعنی کوئی مؤمن مرد کسی مؤمنہ عورت کے ساتھ بغض نہ رکھے۔ دراصل یہ میاں بیوی کے تعلقات کے بارے میں ارشاد ہے کہ کوئی شوہر اپنی بیوی سے بغض نہ رکھے، کیونکہ اگر اس کی کوئی بات ناپسندیدہ ہے تو اس کی کوئی بات پسندیدہ بھی ہوگی۔

اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے بغض دور کرنے کا طریقہ بتا دیا کہ جس شخص کی طرف سے دل میں بغض پیدا ہو رہا ہے، اس کی اچھائیوں کی طرف نگاہ کرو اور اس کی اچھائیاں سوچ سوچ کر یاد کرو، یعنی یہ سوچو کہ میرے دل میں اس کی طرف سے جو بغض پیدا ہو رہا ہے، وہ اس کے فلاں وصف کی وجہ سے ہو رہا ہے، لیکن اس کے اندر صرف یہی ایک وصف نہیں ہے بلکہ اس کے اندر تو اور بہت سے اچھے اوصاف بھی ہیں، پھر ان اچھے اوصاف کو یاد کرو، اس کے نتیجے میں اس بغض میں کمی آجائے گی۔

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

یاد رکھئے! دنیا میں کوئی بھی آدمی ایسا نہیں ہے جس کے اندر کوئی نہ کوئی اچھائی نہ ہو، اللہ تعالیٰ

(۱) صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیة بالنساء، رقم: ۲۶۷۲، مسند أحمد، رقم: ۸۰۱۳

نے اس دنیا میں جو چیزیں بنائی ہیں، ان میں نہ کوئی سراپا سیاہ ہے اور نہ کوئی سراپا سفید ہے بلکہ ہر ایک میں کچھ عیوب بھی ہیں اور کچھ اچھائیاں بھی ہیں، کائنات میں یہی نظام چل رہا ہے۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

لہٰذا ایک کام یہ کرو کہ جن عیوب کی وجہ سے تمہارے دل میں کسی کی طرف سے بغض اور کینہ پیدا ہوا ہے، ان عیوب کو تھوڑی دیر کے لئے فراموش کر دو اور ان اچھائیوں کی طرف نگاہ کرو جو اس کے اندر موجود ہیں۔

کینہ سے متعلق وعیدوں کی طرف نظر کرو

دوسرا کام یہ کرو کہ اس بغض اور کینہ رکھنے پر قرآن وحدیث میں جو وعیدیں آئی ہیں، مثلاً یہ کہ شبِ برأت میں بھی اس شخص کی مغفرت نہیں ہوگی جس کے دل میں دوسرے کی طرف سے بغض اور کینہ ہوگا، وغیرہ، ان وعیدوں کی طرف نظر کرو۔ پھر عمل میں اس بات کا اہتمام کرو کہ اس شخص کے خلاف کوئی کلمہ زبان سے نہ نکلے اور کوئی قدم عملاً اس کے خلاف نہ اُٹھے اور اس کے حق میں دعاء خیر کرو اور لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کرو۔

یہ بات بغض میں داخل نہیں

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ بعض اوقات دل میں دوسرے کی طرف سے بغض اور کینہ نہیں ہوتا لیکن لوگ اس کو بغض سمجھ لیتے ہیں، بات یہ ہے کہ ''بغض'' اس وقت متحقق ہوتا ہے جب انسان دوسرے کی بدخواہی پر کمربستہ ہو جائے اور جان بوجھ کر اس کو تکلیف پہنچانے کی فکر میں لگ جائے اور تکلیف بھی پہنچائے، تب تو اس کو ''بغض'' کہیں گے۔ لیکن اگر صرف یہ بات ہے کہ اس آدمی سے ملنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے اور اس سے طبیعت نہیں ملتی ہے اور اس کے گھر ملاقات کرنے کے لئے جانے کو دل نہیں چاہتا تو یہ ''بغض'' نہیں بلکہ یہ طبیعت کا نہ ملنا ہے اور عدم مناسبت ہے۔ لہٰذا اگر کسی سے ملنے کو دل نہیں چاہتا تو نہ ملو، البتہ اس کے جو حقوق واجب ہیں، وہ ادا کرتے رہو، مثلاً جب سلام کرنے کا موقع آئے تو اس کو سلام کرو، وہ اگر سلام کرے تو اس کا جواب دو، اگر بیمار ہو جائے تو اس کی بیمار پرسی کرلو، اگر اس کا انتقال ہو جائے تو اس کے جنازے میں شریک ہو جاؤ، اگر اس کے یہاں کوئی شادی یا غمی ہو تو اس میں شریک ہو جاؤ، بس، یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس سے میل جول رکھا جائے اور صبح شام اس کے ساتھ مجلسیں جمائی جائیں اور ہنسی مذاق کیا جائے، یہ سب فضول باتیں ہیں، ان کی

کوئی ضرورت نہیں، لیکن یہ بات ضروری ہے کہ اس کی بدخواہی نہ ہو۔

انقباضِ طبعی کینہ نہیں

اسی بات کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس ملفوظ میں بیان فرمارہے ہیں:

"اگر کسی سے رنج کی کوئی بات پیش آئے اور طبیعت اس سے ملنے کو نہ چاہے تو یہ کینہ نہیں بلکہ انقباض طبعی ہے جو گناہ نہیں"(۱)

یعنی انسانی طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں، مزاج الگ ہوتے ہیں، ایک آدمی کا مزاج دوسرے سے نہیں ملتا تو یہ کوئی فرض نہیں کہ دوسرے سے ضرور ملا جائے، اس لئے یہ بغض اور کینہ نہیں۔

دوسرے کے نقصان سے دل میں فرحت

دیکھئے! جو لوگ اپنے شیخ سے اصلاح کراتے ہیں، وہ لوگ اپنے حالات اپنے شیخ کو لکھتے رہتے ہیں کہ میرے ساتھ اس قسم کی بات پیش آرہی ہے، یہ کوئی بیماری ہے یا نہیں؟ اگر یہ بیماری ہے تو اس کا علاج کیا ہے؟ شیخ سے یہی باتیں معلوم کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا:

"اپنے مخالف کو کوئی نقصان کسی سے پہنچ جاتا ہے تو قلب میں ایک فرحت محسوس ہوتی ہے"(۲)

یہ ہے شیخ سے اصلاح کرانے کا طریقہ کہ جو حالات دل پر گزر رہے ہیں، ان کی اطلاع شیخ کو کی جائے، چنانچہ ان صاحب نے یہ محسوس کیا کہ جب میرے مخالف کو کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے، مثلاً اس کے گھر میں آگ لگ گئی یا اس کے گھر میں چوری ہوگئی یا اس کی بدنامی ہوگئی تو اس سے دل میں ایک فرحت اور خوشی محسوس ہوتی ہے، آپ بتائیں کہ یہ فرحت ہونا گناہ ہے یا نہیں؟ اگر یہ گناہ اور بیماری ہے تو اس کا علاج کیا ہے؟

یہ فرحت قابلِ دفع ہے

جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا:

"عقلاً اور اعتقاداً اس کا استحضار کیا جائے کہ یہ فرحت قابلِ دفع ہے اور دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس فرحت کو دفع فرمادیں"(۳)

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۴ (۲) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۵ (۳) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۵

حضرت والا کا ایک ایک لفظ ٹکا ہوا ہوتا ہے، فرمایا کہ ایک کام تو یہ کرو کہ تمہیں دوسرے کے نقصان سے جو فرحت ہو رہی ہے، عقلاً اور اعتقاداً اس بات کا دھیان کرو کہ دل میں اس خوشی کا پیدا ہونا اچھی بات نہیں بلکہ بری بات ہے۔ ''عقلاً'' اور اعتقاداً'' کے الفاظ اس لئے بیان فرمائے کہ ''طبعاً'' جو خوشی ہو رہی ہے وہ غیر اختیاری ہے، وہ انسان کے اختیار میں نہیں، اور غیر اختیاری پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مؤاخذہ نہیں، لیکن عقلی اور اعتقادی طور پر یہ سمجھے اور اس کا دھیان کرے کہ مجھے یہ جو خوشی ہو رہی ہے، یہ بہت بری ہے، مجھے یہ خوشی نہیں ہونی چاہئے، یہ خوشی قابلِ دفع ہے، اس کو ختم ہو جانا چاہئے۔ دوسرا کام یہ کرو کہ دعا کرو کہ یا اللہ تعالیٰ! یہ خوشی بری بات ہے، سچی بات یہ ہے کہ مجھے یہ خوشی ہونی نہیں چاہئے تھی، لیکن اے اللہ! میرے قابو سے باہر ہے، اپنی رحمت سے میری یہ خوشی دور فرما دے۔

غیر اختیاری خیال گناہ نہیں لیکن برا ہے

دیکھئے! حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نہیں فرمایا کہ تمہارے دل میں یہ جو خوشی پیدا ہو رہی ہے، یہ بہت بڑا گناہ ہے، کیونکہ غیر اختیاری طور پر انسان کے دل میں جو خیال آ جاتا ہے، وہ گناہ نہیں ہوتا، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ نہیں ہوتی، اس لئے کہ وہ اختیار سے باہر ہے، لیکن اگر اس نے اس خیال کو دل میں جما لیا اور بٹھا لیا اور اس کے بارے میں یہ تصور نہ کیا کہ یہ گناہ ہے اور یہ خیال دل میں بیٹھ کر کینہ میں تبدیل ہو جائے گا اور اس کے نتیجے میں تم سے گناہ سرزد ہو جائیں گے، پھر غیبت ہوگی، دل آزاری ہوگی اور بدگوئی ہوگی۔ لہٰذا اس خیال کا علاج یہ کرو کہ دل سے اس کو برا سمجھو کہ یہ خیال جو میرے دل میں آ رہا ہے، یہ بہت برا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ! میرے دل سے یہ خیال نکال دیجئے۔ یہ دو کام تو فوراً کر لو اور اس بات کا اہتمام کر لو کہ اس خیال کے نتیجے میں اس کے خلاف کوئی عمل نہ ہو۔

تکلیف پہنچنے کو اپنی بدعملی کا نتیجہ سمجھنا

ایک صاحب نے حضرت کو خط میں لکھا کہ

''آرزو ہے کہ مخالف کی مخالفت کو اپنی حرکات ناشائستہ و اعمال سیئہ کا نتیجہ سمجھوں''(۱)

کینہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مخالف کوئی تکلیف پہنچائے، اس لئے وہ صاحب یہ لکھتے ہیں کہ میرا

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۵

دل یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری طبیعت ایسی بنادے کہ جب بھی کسی شخص سے کوئی تکلیف پہنچے تو میرے دل میں اس کے خلاف جذبات پیدا ہونے کے بجائے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ میاں! دنیا میں جو تکلیف کسی انسان کو پہنچتی ہے، وہ اس کی بدعملی کی وجہ سے پہنچتی ہے، کیونکہ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ﴾(۱)

یعنی جو تکلیف اور مصیبت تمہیں پہنچتی ہے، وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے پہنچتی ہے۔ جب یہ بات ہے تو اب اگر دوسرا شخص مجھے برا بھلا کہہ رہا ہے یا دوسرا شخص مجھے تکلیف پہنچا رہا ہے تو درحقیقت وہ تکلیف بھی میری کسی بدعملی کی وجہ سے پہنچی ہے، اگر میں براعمل نہ کرتا تو یہ آدمی مجھے یہ تکلیف نہ پہنچاتا، چاہے وہ تکلیف کسی انسان سے پہنچے یا کسی جانور سے پہنچے یا زید عمرو بکر سے پہنچے، وہ تکلیف میرے کسی بدعمل کا نتیجہ ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص مجھے ماررہا ہے تو حقیقت میں وہ مجھے نہیں ماررہا ہے بلکہ میرے کسی برے عمل کی وجہ سے مجھے مارا جارہا ہے۔

جلاد بادشاہ کے حکم کا تابع ہے

اگر بادشاہ جلاّد کو حکم دے کہ فلاں شخص کو سو کوڑے مارو تو اب بظاہر تو وہ جلاّد ماررہا ہے لیکن حقیقت میں تو بادشاہ کے حکم کی وجہ سے ماررہا ہے۔ لہٰذا جس شخص کو کوڑے مارے جارہے ہیں، اس کے دل میں یہ بات ہوگی کہ میرا اصل دشمن یہ جلاّد نہیں بلکہ بادشاہ ہے، اس لئے اگر کبھی یہ شخص انتقام لینے کا ارادہ کرے گا تو جلاّد سے انتقام نہیں لے گا، کیونکہ جب بادشاہ نے مارنے کا حکم دے دیا تو اب جلاّد کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ مارنے سے رک جاتا، اس کو تو حکم کے مطابق عمل کرنا تھا، اس کی تو یہ ڈیوٹی تھی۔

”تقدیر“ اس سے یہ کروا رہی ہے

لہٰذا اگر دل میں یہ بات آجائے کہ یہ شخص جو مجھے تکلیف پہنچا رہا ہے، اس کی کیا مجال تھی کہ مجھے تکلیف پہنچاتا، یہ تو درحقیقت ”تقدیر“ اس سے یہ عمل کروا رہی ہے، اور تقدیر اس لئے کروا رہی ہے کہ میں نے کوئی براعمل کیا تھا، اس کی سزا مجھے دنیا میں مل رہی ہے، لہٰذا میں تکلیف پہنچانے والے کو کیوں برا سمجھوں۔ جب یہ بات دل میں ہوگی تو پھر دوسرے کی طرف سے برائی اور کینہ دل میں نہیں آئے گا۔

---

(۱) الشوریٰ: ۳۰

یہ سوچنا اختیاری ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں تحریر فرمایا:

''اس کا استحضار اختیاری ہے، تکرار استحضار سے اس میں رسوخ ہو جائے گا''(۱)

یعنی اس بات کا دل میں دھیان کرتے رہنا کہ مجھے جو کچھ تکلیف پہنچ رہی ہے، وہ میرے برے اعمال کی وجہ سے پہنچ رہی ہے، یہ دھیان کرنا انسان کے اختیار میں ہے اور تکرار استحضار سے اس میں رسوخ ہو جائے گا، یعنی بار بار جب یہ دھیان کرے گا تو رفتہ رفتہ یہ بات دل میں پیوست ہو جائے گی۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ ''رسالہ قشیریہ'' میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ راستے میں جا رہے تھے، کوئی بیوقوف آپ کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے پیچھے پڑ گیا، اس بیوقوف کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا، وہ اس نے حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے سر پر مارنا شروع کر دیا، اس وقت حضرت کی زبان پر پہلا جملہ جو آیا، وہ جملہ یہ تھا:

''إِضْرِبْ رأسًا طَالَمَا عَصَى اللّٰهَ''(۲)

یعنی اس سر کو مارو، کیونکہ اس سر نے بہت عرصے تک اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے۔ لہٰذا جو مار پڑ رہی تھی، اس کو اپنی بدعملی کی طرف منسوب کیا۔

میں ہی سب سے زیادہ بدعمل ہوں

انہی ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ لوگ ان کے پاس آئے اور آکر کہا کہ حضرت! بارش نہیں ہو رہی ہے، قحط پڑا ہوا ہے، دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ اس قحط کو دور فرمادیں۔ جواب میں فرمایا کہ یہ بارش بدعملیوں کی وجہ سے نہیں ہو رہی ہے اور مجھ سے زیادہ بدعمل اس بستی میں کوئی اور نہیں، لہٰذا میں اس بستی سے نکل جاتا ہوں، شاید میرے نکلنے کے بعد اس بستی پر اللہ تعالیٰ کی رحمت آجائے اور بارش ہو جائے۔ اپنے آپ کو بدترین خلائق سمجھ رہے ہیں۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۷۵

(۲) حلية الأولياء (۳۸۸/۷)، وفيات الأعيان (۳۲/۱)، صفة الصلوة (۴۴۵/۱)، الرسالة القشيرية (۷/۱) مذکورہ مراجع میں یہ واقعہ حضرت ذوالنون مصریؒ کے بجائے حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کی طرف منسوب ہے۔

یہ سب کام کسی اور کے اشارے پر ہو رہے ہیں

بہر حال! یہ بات صحیح ہے کہ کسی کی مجال نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو نقصان پہنچائے، نہ کسی انسان کی مجال ہے، نہ کسی جانور کی یہ مجال ہے، نہ کسی جن کی یہ مجال ہے، جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی اور کی طرف سے ہو رہا ہے اور حکمت کی بنیاد پر ہو رہا ہے، چونکہ ہماری اور آپ کی سمجھ میں وہ حکمت نہیں آتی، اس لئے اس نقصان اور تکلیف پر واویلا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

دنیا ہی میں پاک صاف کرنا چاہتے ہیں

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص شیر کے پنجرے میں آجائے تو وہ شخص بے اختیار ہوگا، سوائے تسلیم و رضا کے کوئی چارہ کار نہیں ہوگا کہ تجھے کھانا ہے تو کھالے، پھاڑنا ہے تو پھاڑ لے، اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں۔ اسی طرح ہر انسان کو یہ سوچنا چاہئے کہ اس کائنات میں سب کام مالک الملک والملکوت کی تقدیر سے ہو رہا ہے، اگر کوئی تمہیں پتھر بھی مار رہا ہے تو وہ کسی کی اذن سے مار رہا ہے، کسی کی مشیت سے مار رہا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ مشیت کیوں ہوئی؟ وہ مشیت اس لئے ہوئی کہ تم نے بدعملی کی تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ تمہیں دنیا ہی میں سزا دے دیں تاکہ آخرت میں عذاب نہ دینا پڑے۔ کیونکہ دو ہی راستے تھے، یا تو آخرت میں جہنم میں ڈالتے یا دنیا ہی میں سزا دے دیتے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے تم پر رحمت فرمائی کہ آخرت کے عذاب کے بدلے دنیا میں ہی سزا دے دی تاکہ یہیں حساب کتاب صاف ہو جائے۔

یہ سوچنا کینہ کو ختم کر دے گا

لہٰذا دوسرا شخص تمہیں جو تکلیف پہنچا رہا ہے، یہ کسی کی تقدیر کے تحت ہے، لہٰذا اس آدمی سے بغض اور کینہ رکھنے کی کیا ضرورت ہے، اگر کینہ رکھنا ہے تو اپنی بداعمالیوں سے کینہ رکھو، اپنی بداعمالیوں سے بغض رکھو جن کی وجہ سے اس کو تمہیں تکلیف پہنچانے کا یہ حوصلہ پیدا ہوا، اگر یہ خیال کرو گے تو پھر انشاء اللہ دل میں کسی دوسرے کی طرف سے بغض اور کینہ پیدا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو بھی ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

ریاکاری اور اس کا علاج ☆

بعد از خطبۂ مسنونہ!

أَمَّا بَعْدُ! عَنْ جُنْدُبَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سُفْيَانَ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ((مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهِ وَمَنْ يُرَائِيْ يُرَائِي اللّٰهُ بِهِ))(۱)

''حضرت جندب بن عبداللہ بن سفیان رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص کوئی کام شہرت کے لئے کرتا ہے تو اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے بدنام کر دیتے ہیں اور جو کوئی لوگوں کو دکھانے کی خاطر کوئی نیک کام کرتا ہے تو اس کا انجام بالآخر یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حقیقت لوگوں کو دکھا دیتے ہیں کہ یہ شخص جو کچھ کر رہا ہے، سب دکھاوے کے لئے کر رہا ہے''

اس حدیث کے اندر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بیماریوں کی طرف توجہ دلائی ہے:

(۱) ریاء (دکھلاوا)　(۲) سمعۃ (شہرت پسندی)

''سمعۃ'' کا معنی ہوتا ہے کہ دین کا کوئی کام طلبِ شہرت کے لئے کیا جائے۔ اور اگر کوئی کام دکھاوے کے لئے کیا جائے تو اس کو ریا کہتے ہیں۔ گزشتہ جمعہ میں عرض کیا گیا تھا کہ جس خلق کی تحصیل ہر مسلمان پر فرض ہے وہ اخلاص ہے کہ جو کام بھی کیا جائے وہ اللہ کی رضا کے لئے ہو دنیا مقصود نہ ہو۔ تو تحصیلِ اخلاص فرض اور اس کا برعکس یعنی ریا حرام ہے۔ دراصل اخلاص ہی تمام اعمال کی روح ہے۔ اگر اخلاص نہیں تو عمل خواہ کتنا ہی کر لے وہ بیکار ہے۔ اور جس نسبت سے اخلاص کی کمی ہوگی اسی نسبت سے اس عمل کا فائدہ کم ہو جائے گا، لہٰذا اخلاص اعمال کی روح ہے اور سمعۃ و ریا اعمال کو برباد کر دینے والی چیزیں ہیں۔

دکھاوے کی بیماری ایسی ہے کہ اس سے چھٹکارا آسانی سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے محنت درکار ہے۔ یہ ایسا باریک مرض ہے کہ بسا اوقات مریض کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ بیمار ہے، لہٰذا پہلے

☆ اصلاحی مواعظ (۲/۱۲۱ تا ۱۴۰)، جامع مسجد بیت المکرّم، کراچی

(۱) صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب الرياء والسمعة، رقم: ٦٠١٨، صحيح مسلم، كتاب الزهد والرقائق، باب من أشرك في عمله غير الله، رقم: ٥٣٠١، سنن الترمذي، كتاب النكاح عن رسول الله، باب ما جاء في الوليمة، رقم: ١٠١٦، مسند أحمد، رقم: ١٩٥٥٧

اس کی تھوڑی سی حقیقت سمجھ لیں پھر بزرگوں کا تجویز کردہ علاج بھی مقصودِ بیان ہے۔

ریا کی اصل

دراصل ریا ایک بہت بڑی بیماری ''حبِ جاہ'' کا ایک شعبہ ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ جاہ تو کسی بھی ایسے طریقے سے حاصل کیا جاسکتا ہے کہ جس سے لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچنا مقصود ہو، لیکن ریاء اس عبادت میں پائی جاتی ہے کہ جو آدمی اس غرض سے کرے کہ لوگوں کے دلوں میں میری وقعت پیدا ہو جائے یا بڑھ جائے۔ مثلاً ایک آدمی شہرت چاہتا ہے اور اس کی خاطر وہ ہر روز اخبارات میں اشتہار چھپواتا ہے تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں اس کا نام اچھی طرح جم جائے اور اس کی شہرت ہو جائے تو اس کا یہ عمل جاہ طلبی اور حبِ جاہ تو ہے لیکن ریا نہیں، کیونکہ ریا عبادت میں ہوتی ہے اور اخبار میں اشتہار دے دینا عبادت نہیں ہے۔ ریا کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک آدمی لوگوں کو دکھانے کے لئے نماز پڑھ رہا ہے یا صدقہ کر رہا ہے، اس غرض سے کہ لوگ اس کی تعریف کریں تو یہ ریا ہے۔ تو حبِ جاہ ایک عام چیز ہے جس کا ایک شعبہ ریا ہے، جس کی حقیقت یہ ہے کہ عابد کی نگاہ خالق سے ہٹ کر مخلوق کی طرف چلی جاتی ہے

ریا کا پہلا درجہ

آدمیوں کے لحاظ سے ریا کے چند درجے ہیں جن میں سے بعض درجے تو ایسے ہیں کہ جن سے کفر اور شرک تک نوبت آجاتی ہے، بعض اس سے کچھ کم اور بعض اس سے بھی کم درجے ہیں۔ مثلاً سب سے بڑا اور خطرناک ریا ایمان کے اندر ریا کا ہونا ہے کہ دل میں ایمان نہیں ہے لیکن لوگوں کو اپنے ذاتی مقاصد حاصل کرنے کی خاطر، عبادت گذار بن کر دکھانا اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنا جس کو دوسرے الفاظ میں ''نفاق'' کہتے ہیں یعنی دل میں کچھ ہو اور ظاہر میں کچھ ہو۔ نفاق بھی ریا کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔ اور منافقین کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمایا ہے:

''منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے''(۱)

یعنی کفار سے زیادہ عذاب میں منافقین ہوں گے کیونکہ وہ کافر بھی ہیں اور دھوکہ بھی دے رہے ہیں جو کہ سب سے زیادہ خطرناک چیز ہے۔

ریا کا دوسرا درجہ

دوسرے درجے کی ریا کو ''فرائض کے اندر ریا'' کہا جاتا ہے کہ ویسے کسی شخص کو نماز پڑھنے کی

(۱) النساء: ۴۵

عادت نہیں ہے لیکن کسی موقع پر لوگوں میں پھنس گیا جہاں سوائے پڑھنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا، کیونکہ اگر نہیں پڑھتا تو لوگ ''بے نمازی'' کہیں گے تو لوگوں کے سامنے اپنے بے نمازی ہونے کو چھپانے کے لئے نماز میں شامل ہو گیا۔ تو ایک صورت تو یہ ہے کہ اس وقت خیال آیا کہ اگر اس وقت نماز کی توفیق مل رہی ہے تو پڑھ ہی لوں گا ایسی صورت میں اُمید ہے کہ انشاء اللہ ریا سے بچ جائے گا لیکن اگر دل میں بھاگنے کا ارادہ ہے مگر موقع نہ ملنے کی وجہ سے ادا کر لینا ''فرائض کے اندر ریا'' ہے۔ اگر چہ یہ شرک سے کم ہے لیکن صوفیاء کرام کے نزدیک پھر بھی شرک ہی ہے اس لئے کہ وہ خالق کے لئے نہیں پڑھ رہا بلکہ مخلوق کے لئے پڑھ رہا ہے۔ تو جو آدمی نماز کا پابند ہو گا وہ انشاء اللہ اس ریا میں شامل نہیں ہو گا۔

ریا کا تیسرا درجہ

تیسرا درجہ ''نوافل کی ریا'' کا ہے کہ ویسے تو نفل پڑھنے کی توفیق بھی نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ نفل پڑھنے کا عادی ہے اور نہ اس کا پڑھنے کا ارادہ ہے لیکن ایسے مجمع میں پھنس گیا کہ جہاں تمام لوگ نوافل پڑھ رہے ہیں تو اگر دل میں خیال آ گیا کہ پہلے تو توفیق نہیں ہوئی لیکن آج اللہ نے توفیق عطا فرمادی ہے تو پڑھ لیتا ہوں، یہ ریا نہیں ہے، بشرطیکہ اللہ کو راضی کرنا مقصود ہو اور موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے پڑھے۔ لیکن اگر اس فکر میں ہے کہ موقع ملے تو بھاگ جاؤں مگر موقع نہ ملا اور دکھاوے کے لئے پڑھ لی تو یہ ریا ہی ہے۔

ریا کا چوتھا درجہ

اسی طرح ''نماز کی کیفیت کی ریا'' بھی ہوتی ہے، یعنی عام حالات میں نماز بڑی بھاگ دوڑ میں پڑھتا ہے اور آداب وغیرہ کی رعایت نہیں کرتا لیکن کسی ایسی جگہ چلا گیا، جہاں اس نے دیکھا کہ اگر میں نے اسی طریقے پر نماز پڑھی تو لوگ اس کو برا سمجھیں گے تو یہ ''نماز کی کیفیت'' میں ریا ہے اور اس کا مقصود بھی لوگوں کو دکھانا ہی ہے تو یہ بھی باعثِ گناہ ہے۔

ریا کا پانچواں درجہ

ریا کا پانچواں درجہ ''نوافل کی کیفیات میں ریا'' کا ہے کہ کبھی اتنی لمبی قرات، رکوع اور سجدہ نہیں کرتا لیکن معتقدین کے سامنے نماز کو لمبا کر کے پڑھ رہا ہے تاکہ وہ بدظن نہ ہو جائیں تو لوگوں کے اس اعتقاد کو سامنے رکھتے ہوئے نماز میں طوالت کرنا بھی ریا کاری ہے۔

اور یہ معاملہ بکثرت ہر شخص کو پیش آتا ہے کہ کسی کو دیکھ کر نماز میں خشوع وخضوع پیدا ہو گیا تو

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ریا سے بچنے کے لئے کیا کیا جائے؟ آیا اس پیدا ہونے والے خشوع و خضوع کو ترک کر دے؟ یا اسی طرح نماز پڑھتا رہے اور صرف نیت درست کر لے۔

اس کے بارے میں حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ اس کے بارے میں محققین اور صوفیاء کی آراء مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسے آدمی کو پہلے طریقے ہی پر نماز پڑھنی چاہئے اور اس خشوع و خضوع کا دھیان نہ کرے جو دوسرے کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ خشوع و خضوع کی اس کیفیت کو ظاہر کر کے نیت خالص کر لینی چاہئے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہی بات زیادہ بہتر ہے اور اسی پر عمل کرنا چاہئے لیکن چونکہ ایسی حالت میں نیت درست کرنا عام طور پر بڑا مشکل ہوتا ہے اس لئے آسان تدبیر یہی ہے کہ اس میں تبدیلی پیدا نہ کرے اور اسی طریقے سے نماز پڑھتا رہے۔

یہ باتیں ایسی ہیں جو انسان خود حل نہیں کر سکتا اسی لئے ریا کا علاج یہ بتایا گیا ہے کہ اپنے اعمال کی اصلاح کسی شیخ یا مرشد سے کرواؤ اور اس سے مشورہ حاصل کر کے اس کی رائے پر عمل کرو۔

ریا ہر عبادت میں ہوسکتی ہے

اور یہ بھی یاد رکھیں کہ ریا صرف نماز کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام عبادات میں ریا ہوسکتی ہے۔ مثلاً ایک آدمی کسی کو صدقہ دے رہا تھا اس کا ارادہ پانچ روپے دینے کا تھا لیکن کسی ملنے والے کو سامنے سے آتا دیکھ کر دل میں خیال ہوا کہ طعنہ دے گا کہ اتنا امیر آدمی ہے اور پانچ روپے صدقہ دے رہا ہے اس لئے اس نے دس روپے صدقہ میں دے دیئے تو یہ اضافہ اللہ کے لئے نہ ہوا۔ اور اگر پانچ روپے دینے میں صدقہ کا داعیہ تھا تو وہ اللہ کے لئے ہوئے اور یہ زائد ریا ہوئے۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ریا ہر عبادت میں ہوسکتی ہے اور یہ شیطان کا بڑا موثر حربہ ہے، کیونکہ جب وہ انسان کے اندر اللہ کی طرف دھیان پیدا ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ بڑا گھبراتا ہے کہ اگر یہ ایسا ہی رہا تو پھر یہ میرے چنگل سے نکل جائے گا، لہٰذا اس وقت شیطان یہ حربہ استعمال کر کے اس کے عمل کو خراب کر دیتا ہے اور وہ عمل ریا میں شامل ہو جاتا ہے جو کہ حرام ہے۔

ریا کا ایک اور خفی درجہ

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ اگر ایک آدمی نے تنہائی میں اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے پورے اخلاص کے ساتھ کوئی عمل کیا لیکن بعد میں ایک آدمی آکر اس کے اس عمل کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے آپ کو اس وقت دیکھ لیا تھا، اللہ تعالیٰ مجھے بھی آپ جیسا اخلاص عطا فرمائے تو

وہ عمل کرنے والا شخص اس تعریفی جملے کو سن کر خوش ہو گیا اور مزے لینے لگا تو صوفیاء کرام کے نزدیک یہ بھی ریا کا ایک خفی درجہ ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس تعریفی جملے کی عادت پڑ جاتی ہے اور پھر انسان اسی کی خاطر عمل کرتا ہے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

ایک مرتبہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! بعض اوقات ہم بھرپور اخلاص سے کوئی عمل کرتے ہیں، بعد میں کسی کے منہ سے اپنی تعریف سن کر دل خوش ہو جاتا ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ))

''یہ مؤمن کے لئے فوری خوش خبری ہے''(۱)

چونکہ اس عمل میں محرک اللہ کی رضا تھی اس لئے اللہ تعالیٰ اس عمل پر دنیا ہی میں اپنے بندوں کے ذریعے خوشخبری دے دیتے ہیں کہ تمہارا یہ عمل اللہ کے یہاں قبول ہے لہٰذا یہ ریا نہیں۔ لیکن یہ اسی وقت ہے کہ وہ آدمی تعریف سنتے ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے میرا اچھا حال اس پر ظاہر کیا ہے، ورنہ اگر اس پر میری حقیقت ظاہر ہو جاتی تو یہ تعریف کرنے کے بجائے میرے اوپر لعنت بھیجتا تو اس خیال سے ان شاء اللہ وہ شیطان کے وار سے بچ جائے گا۔ لیکن اگر وہ مزے لے رہا ہے تو یہ کیفیت آئندہ چل کر اس کو حقیقی ریا میں مبتلا کر کے تباہ کر سکتی ہے۔ اسی لئے اس کو ''خفی ریا'' کہا گیا ہے۔

انسان کے تواضع کی پہچان

ایک مرتبہ حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے فرمایا کہ یہ جو ہم اکثر اوقات اپنے آپ کو حقیر، فقیر اور عاجز و ناکارہ کہہ دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ میری تواضع ہے لیکن درحقیقت یہ ''تواضع کی ریا'' ہوتی ہے اور کہنے والے کا مقصد ہوتا ہے کہ سننے والا اس کو عالم و فاضل کہے۔ اور علامت اس کی یہ ہے کہ اگر کسی نے اپنے آپ کو ایسا ظاہر کیا اور دوسرے نے اس کی تائید میں جواباً ''بیشک'' کہہ دیا تو اس وقت اس کی حالت دیکھنے والی ہوتی ہے اور اس کے دل پر زبردست گرانی ہوتی ہے۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ وہ اپنے بارے میں سچے دل سے یہ الفاظ نہیں کہہ رہا تھا بلکہ وہ ان عاجزانہ الفاظ سے تواضع کا دکھاوا کر رہا تھا۔

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب اذا أثني على الصالح فهي بشرى ولا تضره، رقم: ٤٧٨٠، مسند أحمد، حديث أبي ذر الغفاري، رقم: ٢٠٤١٦

تواضع کی حقیقت تو یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو فنا کر ڈالے اور اپنے آپ کو ناکارہ سمجھے اور اس کو اپنے اندر کسی فضیلت کا اعتقاد نہ ہو۔

ایک بزرگ کا قصہ

ایک بزرگ کا قصہ میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ سے سنا ہے کہ ایک بزرگ کی مجلس میں لوگ آتے اور ان کے وعظ کی تعریف بھی کیا کرتے تو یہ بزرگ اپنی تعریف سن کر بہت خوش ہوتے تھے۔ مریدین میں سے کسی نے کہا کہ حضرت! آپ کا عجیب معاملہ ہے کہ آپ تعریف سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ تو ان بزرگ نے فرمایا کہ دراصل بات یہ ہے کہ میرا اپنی تعریف پر خوش ہونا تعریف کی مسرت کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اس وقت میں اس بات پر خوش ہوتا ہوں کہ اللہ کتنا کریم ہے کہ مجھ جیسے آدمی کے لئے اس کے دل میں کیسا خیال اور گمان پیدا کر دیا۔ تو نہ انہوں نے ظاہری اعتبار سے اپنے آپ کو حقیر کہا اور نہ ہی اپنی تعریف کا رد کیا لیکن دل میں اللہ کے کرم کا احساس ہے۔ خلاصہ یہ کہ ریا کے شعبے جزئیات بیشمار ہیں، بسا اوقات ان کو پہچاننا بہت مشکل ہوتا ہے۔

ریا کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان

اور ریا اتنی خطرناک بیماری ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ أَشْرَكَ بِاللّٰهِ))(۱)

''جس شخص نے دکھاوے کے لئے نماز پڑھی تو اس نے مخلوق کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرایا''

اس لئے کہ حق تو اللہ کو راضی کرنا تھا لیکن تم نے مخلوق کو شریک کر لیا تو یہ شرک ہو گیا۔ آگے فرمایا:

((وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ أَشْرَكَ بِاللّٰهِ))(۲)

''جو شخص ریا کی خاطر روزہ رکھے تو اس نے مخلوق کو اللہ کا شریک ٹھہرایا''

تو یہ ایسی خطرناک بیماری ہے کہ جس کی حد شرک کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور عام اتنی ہے کہ قدم قدم پر اس کے شائبے پیدا ہوتے ہیں۔

ریا کا علاج اور اس کی مثال

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ کسی اللہ والے سے تعلق قائم کر کے اس سے

(۱) مسند أحمد، رقم: ١٦٥١٧ (۲) مسند أحمد، رقم: ١٦٥١٧

ہدایات حاصل کرے۔ اور بزرگوں نے اس کا علاج یہ بھی فرمایا ہے کہ اس بیماری کی جڑ اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت کی کمی ہے تو جتنی اللہ جل شانہ کی محبت پیدا ہوگی اتنی ہی ریا سے دوری ہوگی اور خالق کی طرف نگاہ رہے گی، مخلوق کی طرف نہیں جائے گی۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک بادشاہ کا دربار لگا ہوا ہے اور بادشاہ نے آپ کو اپنے دربار میں کسی کام سے بلایا، آپ اس کے سامنے جاکر کھڑے تو ہو گئے لیکن نہ نگاہ بادشاہ کی طرف ہے اور نہ دھیان اس کی طرف ہے۔ اور دوسری طرف ایک حبشی غلام کھڑا ہے، اس کی طرف دیکھ بھی رہا ہے اور متوجہ بھی ہے۔ تو آپ کا بادشاہ کی طرف سے بے توجہ ہونا، بادشاہ کی بڑی زبردست توہین ہے جو وہی شخص کر سکتا ہے جس کے دل میں بادشاہ کی کوئی وقعت نہ ہو، اس لئے اگر دل میں اس کی وقعت ہے تو اس کے علاوہ کسی اور کی طرف دھیان جا ہی نہیں سکتا۔ ایسے ہی جب اللہ جل شانہ کی محبت یا عظمت دل میں آجائے تو پھر مخلوق کی طرف نگاہ ہو ہی نہیں سکتی اور حبِ جاہ اور ریا جیسی بیماریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی محبت عطا فرما دیتے ہیں تو پھر وہ کسی کی طرف دھیان نہیں کرتے، اس کی مثال بالکل ایسے ہے کہ جب سورج نکل آتا ہے تو چونکہ تارے اس کے نور کو برداشت نہیں کر سکتے اس لئے وہ سورج کے احساس سے ہی غائب ہو جاتے ہیں، اسی طرح اللہ کی محبت کے آگے ساری محبتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

صوفیاء کرام نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ

جدھر دیکھتا ہوں، ادھر تو ہی تو ہے

اس بات کے لئے صوفیاء کرام نے ''وحدت الوجود'' والی بات کو بڑے اچھے پیرائے میں بیان فرمایا ہے کہ

جب مہر نمایاں ہوا، سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

منصور حلاج کا قصہ

منصور حلاج ایک بہت بڑے صوفی گزرے ہیں، ایک مرتبہ انہوں نے ''انا الحق'' کہہ دیا کہ میں ہی حق یعنی اللہ ہوں۔ اس پر دنیوی احکام قتل پھانسی وغیرہ کے جاری ہو گئے، لیکن ان کا مقصد خدائی کا دعویٰ نہ تھا بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں، وہ اپنی جگہ درست تھے لیکن اس پر علماء کرام کے فتووں کے مطابق احکامات جاری ہوئے، میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ سے سنا کہ جب علماء نے ان کے اس قول (انا الحق) کی وجہ سے ان پر فتویٰ لگایا کہ یہ تو ارتداد ہے اور مرتد واجب القتل ہوتا ہے لہٰذا اس کو قتل کر دیا جائے تو اسی وقت حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ

بھی موجود تھے اور فتوے کے اوپر دستخط کے وقت بھی موجود تھے۔ تو منصور نے جب ان کو کھڑے دیکھا تو کہا کہ جنید! جتنے بھی لوگوں نے میرے قتل کا فتویٰ دیا ہے، مجھے نہ ان سے کوئی شکایت ہے اور نہ ہی ان کی پرواہ ہے، لیکن تم نے علم رکھنے کے باوجود دستخط کیوں کیے اور تم کیوں آئے؟ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حقیقت چاہے کچھ ہو، لیکن حکم وہی ہے جو فقہاء کرام نے دے دیا، اس لئے میں نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے۔ حالانکہ ان کا مقصد یہ تھا جو کچھ ہے وہ اللہ کی ذات ہے اور بس، یہ بات درمیان میں آگئی تو کہہ دی لیکن یہ قابلِ تقلید نہیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی کبھار ایسا شدید احساس پیدا فرمادیتے ہیں کہ ایک اللہ کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔

کسی بزرگ سے ایک سوال

ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! یہ عجیب معاملہ ہے کہ جب فرعون نے "أَنَا الْحَقُّ" اور "أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلٰى" کہا تو قرآن نے بھی اس پر لعنت بھیجی ہے اور منصور نے بھی "أَنَا الْحَقُّ" کہا تھا لیکن منصور کا نام آنے پر رحمۃ اللہ علیہ کہا جاتا ہے تو ان دونوں کے کہنے میں کیا فرق ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ فرق یہ ہے کہ فرعون نے "انا الحق" کہا تھا تو اس نے اللہ کو مٹا کر کہا تھا اور منصور نے جب "انا الحق" کہا تو اپنے آپ کو مٹا کر کہا اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

تو عرض یہ کررہا تھا کہ ان ساری بیماریوں کو دور کرنے کی بنیاد اللہ کی محبت ہے اور مخلوق سے نگاہ کو ہٹا کر خالق کی طرف کرلینا ہے۔

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ایک دیہاتی

حضرت شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ دہلی کی جامع مسجد میں کئی گھنٹے تقریر کرنے کے بعد واپس ہورہے تھے تو ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ بڑی تیزی سے پسینہ میں شرابور مسجد کی سیڑھیاں چڑھتا چلا آرہا ہے۔ جب وہ اوپر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ لوگ تو جارہے ہیں تو اس کو بہت افسوس ہوا۔ اتفاق سے شاہ صاحب ہی اس کے سامنے آگئے تو اس نے اپنی لاعلمی کی بناء پر پوچھا کہ کیا مولوی اسماعیل کا وعظ ختم ہوگیا؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! ختم ہوگیا تو اس نے "إِنَّا لِلّٰه" کہا کہ میں تو بڑی دور سے اسماعیل کا وعظ سننے آیا تھا، گویا اس نے بڑی حسرت ظاہر کی تو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ تمہیں افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا ہی نام اسماعیل ہے، بیٹھ جاؤ! میں نے جو کچھ کہا ہے وہ میں تم کو دوبارہ سنائے دیتا ہوں، اور انہی سیڑھیوں میں بیٹھ کر وہ سارا وعظ اس اکیلے آدمی کو سنا دیا۔ بعد میں

کسی نے کہا کہ حضرت! آپ نے بھی کمال کر دیا کہ ایک آدمی کی خاطر گھنٹوں کا وعظ دوبارہ سنا دیا؟ حضرت شاہ صاحبؒ نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ میں نے یہ پہلے بھی ایک ہی کیلئے کہا تھا اور اب بھی ایک ہی کیلئے کہا ہے، مجھے مجمع اور اس کی پسند کی کوئی پرواہ نہیں، میرا مقصد تو اللہ کو راضی کرنا ہے۔

سہاگن وہ جسے پیا چاہے

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ فرماتے تھے کہ ہندی زبان کی ایک مثل مشہور ہے کہ ''سہاگن وہ جسے پیا چاہے''

تفصیل یہ بتائی کہ ایک لڑکی کی شادی ہوئی تو جیسا کہ شادی میں ہوتا ہے کہ عورتیں دلہن کا بناؤ سنگھار کرتی ہیں، ایسا ہی یہاں بھی ہو رہا تھا اور اس کی سہیلیاں اس سے مذاق کر رہی تھیں کہ آج تو تو بہت خوبصورت لگ رہی ہے اور تیرا بناؤ سنگھار تو بہت ہی اچھا ہے اور طرح طرح سے اس کی تعریفیں کر رہی ہیں۔ لیکن وہ کسی کا شکریہ بھی ادا نہیں کرتی اور خاموش بیٹھی ہے، تو کسی نے اس سے پوچھا کہ نہ تو نے ان کا شکریہ ادا کیا اور نہ ان کی تعریف پر خوشی کا اظہار کیا؟ تو اس نے کہا کہ بیشک یہ میری تعریف کر رہی ہیں لیکن یہ بتاؤ کہ مجھے ان کی تعریف سے کیا فائدہ ہوگا؟ بات تو جب بنے گی کہ جس کے لئے سنوارا جا رہا ہے وہ تعریف کرے، تو میرے والد ماجد فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو کچھ ہم دنیا میں کر رہے ہیں تو کسی کی تعریف سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ ایسا ہوگیا کہ وہ ہوا میں اُڑ گیا، ہاں جس کے لئے کیا جا رہا ہے وہ کہہ دے تب فائدہ ہے۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

اور اس کی طرف سے یہ خطاب آجائے:

﴿يٰٓأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ﴾(۱)

خالق کی پسند کی فکر کرو

ایک بزرگ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ کبھی ہنستے نہیں تھے، مسکراہٹ تک چہرے پر نہیں

(۱) الفجر: ۲۷ تا ۳۰، آیات مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''(البتہ نیک لوگوں سے کہا جائے گا کہ:) ''اے وہ جان جو (اللہ کی اطاعت میں) چین پا چکی ہے! اپنے پروردگار کی طرف اس طرح لوٹ کر آجا کہ تو اس سے راضی ہو، اور وہ تجھ سے راضی، اور شامل ہو جا میرے نیک بندوں میں، اور داخل ہو جا میری جنت میں''

آتی تھی۔ کسی نے پوچھا کہ حضرت! آپ کو کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا؟ تو فرمایا کہ کچھ پتہ نہیں، دنیا سے رخصت ہوتے وقت اس بارگاہ میں میرا کوئی عمل قبول ہوگا یا نہیں اس لئے میں نہیں ہنستا۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو فوراً ہی ان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی، جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو "يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ" والا خطاب مل گیا تھا۔ لہٰذا فکر اس بات کی ہونی چاہئے کہ جس کے لئے یہ کام کیا جارہا ہے اس کو پسند آجائے، خواہ مخلوق کو پسند آئے یا نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی ایسی محبت پیدا ہوگئی تو انشاء اللہ ہر قسم کی بیماریوں سے حفاظت ہوجائے گی۔ اور محبت پیدا کرنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ محبت کرنے والوں کے پاس بیٹھو تو اس محبت کی آگ کی تھوڑی سی تپش تم پر بھی اثر انداز ہوجائے گی۔

اللہ کی محبت پیدا کرنے کا طریقہ

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی محبت پیدا کرنے کا ایک کسبی طریقہ بھی ہے وہ یہ کہ اللہ کی نعمتوں کا استحضار اور دھیان ہو کہ اللہ نے مجھ پر کیسی کیسی نعمتوں کی بارش برسائی ہے۔ اور حضرت فرماتے تھے کہ رات کو سونے سے پہلے اس کے بارے میں مراقبہ کرلیا کرو۔ مراقبہ سے مراد یہ ہے کہ خالی الذہن ہوکر دھیان کرو کہ اللہ نے کیا کیا نعمتیں عطا فرمائی ہیں؟ اور دوسری طرف اپنی تقصیرات کا استحضار کرے کہ میں نے اللہ کی نعمتوں کا کیا حق ادا کیا؟ صرف آنکھ ہی ایسی نعمت ہے کہ اگر ایک آنکھ خراب ہوجائے تو انسان لاکھوں روپے خرچ کرنے کو تیار ہوجاتا ہے اور اللہ نے مجھے مفت میں دے رکھی ہے، میں نے اس کا کیا حق ادا کیا؟ تو ایک طرف سے اللہ کی نعمتوں کا استحضار اور دوسری طرف سے اپنی تقصیرات کا دھیان کرو اور سوچو کہ اللہ کتنا بردبار ہے؟

اللہ بہت حلیم اور بردبار ہے

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک بے یار و مددگار آدمی پھر رہا تھا جس کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہ تھی اور سر چھپانے کی جگہ نہ تھی، تم اس پر ترس کھا کر اس کو اپنے گھر لے آئے اور بھائیوں کی طرح رکھا اور کھانے کو روٹی، پینے کو پانی اور رہنے کو جگہ دی۔ لیکن پھر وہ تمہاری نافرمانی کرتا ہے اور چوری وغیرہ کے کاموں میں لگ جاتا ہے تو آخر تم کب تک برداشت کروگے؟ ایک نہ ایک دن تو اس کو نکال ہی دوگے۔ لیکن اس مالک بے نیاز کا کرم دیکھو کہ دن رات اس کی نافرمانیوں میں لگے رہتے ہو لیکن وہ تم سے نعمتیں چھینتا نہیں ہے۔ اگر تم اس خیال کے ساتھ اپنی تقصیرات اور اللہ کی نعمتوں کا استحضار کروگے تو اللہ کی محبت دل میں ضرور آئے گی۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چالیس دن کا چلہ کرو اور خیال کرو کہ جو منعمِ حقیقی ایسی عطا فرمانے والا ہے تو کیا وہ محبت کے لائق نہیں ہے؟ اس خیال سے اللہ کی محبت پیدا ہو جائے گی اور جب اللہ کی محبت پیدا ہو جائے گی تو مخلوق کی طرف سے نگاہ ہٹ جائے گی بایں معنی کہ انسان مخلوق کی خاطر کام نہیں کرے گا بلکہ مخلوق سے معاملات اس خیال کے ساتھ کرے گا کہ یہ میرے مالک کی پیدا کردہ مخلوق ہے، میرے ذمے اس کے کچھ حقوق ہیں لہٰذا میں وہ حقوق ادا کررہا ہوں لیکن وہ مخلوق سے اپنی تعریف نہیں چاہے گا۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ یہ نکلا کہ ریاء اور حبِ جاہ جیسی بیماریاں اللہ کی عظمت و محبت کی کمی سے پیدا ہوتی ہیں اور محبت میں اضافہ کا طریقہ یہ ہے کہ ہر روز اللہ کی نعمتوں کا استحضار کرو۔ بعض آنکھیں ناشکری ہوتی ہیں کہ محض مصیبتوں کو دیکھتی ہیں اللہ کی نعمتوں کی طرف ان کی توجہ نہیں ہوتی اور ہم لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اللہ کی نعمتوں کا پلڑا ہر آن بھاری رہے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ﴾(۱)

”اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔ انسان بڑا ظالم اور بڑا ناشکرا ہے“

ان آیات میں ہمارے لئے سبق ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کرنا چاہئے، اگر اللہ کی نعمتوں کی طرف نگاہ ہو تو تکلیفیں تو ویسے ہی دور ہو جاتی ہیں۔

بزرگوں کی نگاہ نعمت کی طرف ہوتی ہے

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ کے ایک استاذ حضرت مولانا سیّد اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے، ایک مرتبہ بیمار ہو گئے۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں عیادت کو گیا تو دیکھا کہ تیز بخار میں تپ رہے تھے۔ میں نے سلام عرض کر کے حال دریافت کیا تو فوراً فرمایا کہ الحمد للہ میری آنکھ، کان، ناک، پیٹ اور معدہ میں کوئی تکلیف نہیں اور جتنی بیماریاں نہیں تھیں، سب بیان کردیں اور فرمایا کہ بس ایک بخار ہے، وہ بھی انشاء اللہ ختم ہو جائے گا۔ تو بیماری کی حالت میں بھی ان کی نگاہ نعمتوں کی طرف تھی۔

---

(۱) ابراهيم: ٣٤

تکالیف کے مقابلے میں نعمتیں زیادہ ہیں

ایک مرتبہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو درمیان میں یہ بات نکل آئی کہ جب بچوں کے دانت نکلتے ہیں تو مختلف قسم کی تکلیفیں ان کو ہوتی ہیں۔ تو گھر ہی کی ایک خاتون بھی بیٹھی ہوئی تھیں، انہوں نے کہا کہ یہ دانت بھی عجیب چیز ہیں کہ آتے ہوئے بھی تکلیف دیتے ہیں اور جاتے ہوئے بھی! کیونکہ ان کے دانت ہل رہے تھے اور نکلنے والے ہو رہے تھے۔ تو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ کی بندی! تمہیں دانتوں کے متعلق صرف یہی دو باتیں یاد رہیں اور اپنی پچاس، ساٹھ سالہ زندگی میں منوں بلکہ ٹنوں کے اعتبار سے غذا چبا کر اپنے پیٹ میں اُتار گئیں وہ یاد نہیں رہی؟ تو اللہ والوں کی نگاہ نعمتوں کی طرف اور ہم جیسوں کی نگاہ تکلیفوں کی طرف ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ یقینی ہوتا کہ اگرچہ اس دنیا میں مظلوم ترین انسان ہے لیکن اگر فہرست بنا کر دیکھا جائے تو تکلیفوں کے مقابلے میں نعمتوں کا پلڑا ہزار ہا گنا بھاری ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد رکھو اور اس کے ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین فرمودہ دعا بھی پڑھتے رہا کرو جو کہ مناجات مقبول میں بھی ہے:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُكَ لِلنِّعَمِ الَّتِیْ تَقَوَّیْتُ بِھَا عَلٰی مَعْصِیَتِكَ))(۱)

''اے اللہ! میں مغفرت مانگتا ہوں ان نعمتوں پر کہ جن سے مجھے آپ کی نافرمانیوں پر تقویت ملی''

الفاظ یاد نہ رہیں تو معنی بھی کافی ہیں اور ان باتوں کو صرف سننے کی حد تک نہیں رکھیں بلکہ عملی زندگی میں لائیں اور وقت نکال کر اللہ کی نعمتوں کے بارے میں مراقبہ کریں جس سے اللہ کی محبت پیدا ہوگی اور یہ تمام بیماریاں ختم ہو جائیں گی، یہ سو علاجوں کا ایک علاج ہے، اس کے علاوہ جزوی علاج اور بھی ہیں لیکن بنیادی علاج یہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

(۱) پوری دعا کچھ یوں ہے: ((اللھم إنی أستغفرك لما تبت إلیك منه ثم عدت فیه وأستغفرك لما أعطیتك من نفسی ثم لم أوف لك به وأستغفرك للنعم التی أنعمت بها علی فتقویت بها علی معاصیك وأستغفرك لكل خیر أردت به وجهك فخالطنی فیه مالیس لك اللھم لا تخزنی فإنك بی عالم ولا تعذبنی فإنك علی قادر)) كنز العمال، رقم:۵۱۲۶ (۸۰۸/۲)، شعب الإیمان للبیھقی، رقم:۶۹۰۸ (۲۰۴/۱۵)

تکبر اور اس کا علاج ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ. وَعَلٰی آلِہٖ وَأَصْحَابِہٖ أَجْمَعِیْنَ. وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ. أَمَّا بَعْدُ!

کبر، یعنی تکبر بہت سی بیماریوں کی جڑ ہے۔ اس سے بہت سی باطنی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے اس کو ''اُمّ الامراض'' کہا جاتا ہے۔ اور سب سے پہلا گناہ جو کائنات میں سرزد ہوا، وہ کبر کا گناہ تھا۔ جب اللہ جل شانہ نے ابلیس سے کہا کہ (حضرت) آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، تو اس نے سجدہ کرنے سے انکار کردیا اور دلیل یہ دی:

﴿أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ﴾(۱)

میں اس سے بہتر ہوں، اپنے کو اس ابلیس نے بڑا سمجھا اور حضرت آدم علیہ السلام کو چھوٹا سمجھا۔ اس کی دلیل بھی بہت مضبوط پیش کی کہ آپ نے ان کو مٹی سے پیدا کیا ہے اور مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آگ مٹی سے افضل ہے۔

اگر دلیل کی طرف دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ یہ دلیل بڑی قوی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو نہ ماننے کے نتیجے میں کبر کا جو مظاہرہ ہوا، یہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی وہ نافرمانی تھی جو سب سے پہلے سرزد ہوئی، اور اسی تکبر کے نتیجے میں شیطان ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہوا۔

''تکبر'' تمام گناہوں کی جڑ ہے

اسی تکبر سے ''حسد'' پیدا ہوتا ہے، کیونکہ جب دل میں یہ خیال ہے کہ میں بڑا ہوں، اب اگر دوسرا آدمی اس سے آگے بڑھ گیا اور ترقی کرگیا تو دل میں یہ حسد پیدا ہوتا ہے کہ یہ آدمی کیوں آگے بڑھ گیا، مجھے آگے بڑھنا چاہئے تھا۔

اسی تکبر سے ''بغض'' پیدا ہوتا ہے، ''غصہ'' کی کثرت تکبر کی وجہ سے ہوتی ہے، ''غیبت'' کا

☆ اصلاحی مجالس (۱/۲۴۹ تا ۳۱۳)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دارالعلوم، کراچی

(۱) الاعراف: ۱۲

گناہ عموماً تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے، ''تجسس'' بھی تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے، غرض یہ کہ ''تکبر'' بیشمار امراض کی جڑ ہے۔ جس طرح جسمانی امراض کے ماہرین اور اسپیشلسٹ ہوتے ہیں، کوئی کان کا اسپیشلسٹ ہے، کوئی ناک کا اسپیشلسٹ ہے، کوئی حلق کا اسپیشلسٹ ہے، اسی طرح روحانی امراض کے اسپیشلسٹ بھی ہوتے ہیں، ان میں ایک امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، وہ اپنی کتاب ''احیاء العلوم'' میں فرماتے ہیں کہ یہ تکبر ''اُمّ الامراض'' ہے، یعنی تمام بیماریوں کی ماں ہے۔ اگر یہ ایک مرتبہ پیدا ہوجائے تو دوسری بیماریاں اس سے پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ لہٰذا اس بیماری کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں اس بیماری سے محفوظ فرمائے اور اگر یہ بیماری ہمارے اندر ہے تو اس کا علاج بھی فرمادے۔ آمین۔

کِبر کے معنی

''کِبر'' کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا یعنی افضل سمجھنا، اگر کسی کی عمر تیس سال ہے اور دوسرے کی عمر بیس سال ہے تو ظاہر ہے کہ تیس سال والا شخص اپنے آپ کو بیس سال والے سے عمر کے اعتبار سے بڑا سمجھے گا، یہ کِبر نہیں اور بری بات نہیں، اپنے آپ کو بڑا یعنی افضل سمجھنا کہ میں اس سے بہتر ہوں، میں اس سے اچھا ہوں، یہ کبر ہے۔

اور جب اپنی بڑائی دل میں ہوتی ہے تو پھر اپنے کسی انداز و ادا سے اس کا مظاہرہ بھی ہوجاتا ہے، مثلاً گفتگو سے، قول سے، فعل سے، اس کا نام ہے ''تکبر''، لہٰذا دوسرے کے مقابلے میں بڑائی جتلانا تکبر ہے۔ یہ فرق ہے ''تکبر'' اور ''کبر'' میں۔ گویا کہ ''کبر'' یہ ہے کہ دل میں اپنی بڑائی کا پیدا ہونا اور ''تکبر یہ ہے کہ دوسرے کے مقابلے میں اپنی بڑائی جتلانا، مثلاً دوسرے سے اس طرح گفتگو کرنا جس میں دوسرے کی تحقیر شامل ہو۔ یہ تکبر کبر کا نتیجہ ہوتا ہے، جسے ختم کرنے کی ضرورت ہے۔

تکبر ایک مخفی بیماری

یہ بیماری ایسی ہے کہ اکثر و بیشتر انسان کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ بیماری میرے اندر ہے یا نہیں۔ اور وہی بیماری سب سے زیادہ خطرناک ہے جو اندر ہی اندر بڑھتی چلی جائے، اور اس کا پتہ ہی نہ چلے۔ جیسے آج کل ڈاکٹر یہ کہتے ہیں کہ سب سے خطرناک بیماری ''کینسر'' کی ہے، اس لئے کہ یہ بیماری ایسی ہے کہ جب انسان کے بدن میں پیدا ہوجاتی ہے تو اندر ہی اندر بڑھنے لگتی ہے، اس وقت نہ بیمار کو پتہ چلتا ہے، نہ ڈاکٹر کو پتہ چلتا ہے کہ اندر کیا ہورہا ہے، کیونکہ جب بیماری میں انسان کو تکلیف ہوتی ہے اُس وقت پتہ چلتا ہے کہ میرے اندر یہ بیماری ہے۔ اس لئے بیماری کے اندر تکلیف کا ہونا یہ بھی اللہ

تعالیٰ کی رحمت ہے، کیونکہ تکلیف اس بات کا سگنل ہوتا ہے کہ اندر کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے، لہٰذا آدمی ڈاکٹر کے پاس اس کے علاج کے لئے جاتا ہے اور اپنا علاج کرالیتا ہے اور ٹھیک ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر بیماری تو اندر پیدا ہوگئی اور اس کی تکلیف نہیں ہوئی تو اب اس کے علاج کی طرف بھی دھیان نہیں جائے گا اور اس کے تدارک کی فکر نہیں ہوگی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بیماری اندر ہی اندر بڑھتی چلی جاتی ہے، اور انسان کو اس وقت پتہ چلتا ہے جب وہ ناقابلِ علاج ہوجاتی ہے اور اس کے بعد کوئی علاج ممکن نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔

اسی طرح کبر کی بیماری بھی ایسی ہی ہے، آدمی اپنے آپ کو یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں ٹھیک ہوں، لیکن حقیقت میں وہ کبر اور تکبر کا شکار ہوتا ہے، اور یہ بیماری اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔ کبھی آپ نے یہ سنا کہ کسی متکبر نے یہ کہا ہو کہ میں تکبر کرتا ہوں، آج تک کسی نے یہ اقرار نہیں کیا۔

ٹخنوں سے نیچے شلوار لٹکانا

ایک بات ہمارے معاشرے میں بہت مشہور ہوگئی ہے، وہ یہ کہ ٹخنوں سے نیچے پاجامہ، شلوار وغیرہ پہننے کی جو ممانعت حدیث شریف میں آئی ہے، اس کے بارے میں لوگوں نے یہ حیلہ نکالا ہے کہ حدیث شریف میں تو یہ آیا ہے کہ جو شخص تکبر کی وجہ سے پاجامہ یا شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹکائے گا تو وہ حصہ جہنم میں جائے گا، اب لوگ یہ کہتے ہیں کہ دیکھئے! اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے تکبر کی قید لگائی ہے، لہٰذا تکبر کی وجہ سے شلوار کو نیچے لٹکانا تو ناجائز ہے، لیکن اگر تکبر کے بغیر ویسے ہی فیشن کے طور پر لٹکا لیا، یا اس لئے لٹکا لیا کہ ہمیں اس طرح لٹکانا اچھا لگتا ہے تو پھر کوئی گناہ نہیں، اور ہم تکبر سے نہیں لٹکاتے۔ یہ بات لوگوں نے بہت زیادہ مشہور کر رکھی ہے۔ میرا یورپ اور امریکہ جانا ہوا تو دیکھا کہ وہاں کے مسلمانوں میں یہ بات بہت مشہور ہے اور جس سے بھی پوچھا جائے تو وہ یہی کہتا ہے کہ ہم یہ کام تکبر کی وجہ سے نہیں کرتے۔

میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ اچھا تم مجھے کوئی ایک آدمی بھی ایسا دکھا دو جو کہتا ہو کہ میں تکبر کی وجہ سے شلوار نیچے لٹکاتا ہوں۔ کوئی آدمی ایسا نہیں ملے گا، کیونکہ تکبر ایسی چیز ہے کہ اگر متکبر کو پتہ چل جائے کہ میں تکبر کرتا ہوں تو بس تکبر ختم ہوجائے۔ تکبر تو پیدا ہی اس طرح ہوتا ہے کہ جس کے اندر تکبر ہے اس کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ میں کبر اور تکبر کے اندر مبتلا ہوں، یہ شیطان کا دھوکہ ہے کہ آدمی یہ کہے کہ میں یہ کام تکبر کی وجہ سے نہیں کرتا ہوں، لہٰذا میرے لئے یہ عمل جائز ہے۔

حضور ﷺ کے ازار کی کیفیت

حالانکہ دنیا میں کسی شخص کے بارے میں یہ گارنٹی نہیں ہے کہ وہ تکبر سے پاک ہوگا، سوائے حضورِ اقدس نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ گرامی کے، آپ کے بارے میں یہ گارنٹی ہے کہ آپ ﷺ تکبر سے پاک تھے، اب جس ذاتِ اقدس کے بارے میں یہ گارنٹی ہے کہ وہ تکبر سے پاک تھے، وہ تو اپنا ازار ٹخنوں سے نیچے نہیں لٹکاتے بلکہ آپ اپنا ازار نصف ساق تک رکھتے تھے، کیونکہ ٹخنوں سے نیچے لٹکانا تکبر والا کام ہے، اور ہم لوگ جن کے اندر تکبر پیدا ہونے کا ہر وقت خطرہ ہے، لیکن ازار نیچے لٹکا کر یہ کہتے ہیں کہ ہم تکبر سے نہیں لٹکاتے، اس سے زیادہ شیطان کا دھوکہ اور کیا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ تکبر ایک ایسا امر مخفی ہے کہ متکبر کو پتہ نہیں لگتا کہ میں تکبر کر رہا ہوں۔

ظاہری تواضع میں مخفی تکبر

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات ایک آدمی ایسا کام کر رہا ہوتا ہے جو بظاہر تواضع کا ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ سراسر تکبر ہوتا ہے۔ جیسے آج کل یہ رواج ہے کہ لوگ اپنے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ میں بالکل ناکارہ ہوں، میں گیا گزرا جاہل ہوں۔ اب یہ الفاظ تو بظاہر تواضع کے ہیں کہ وہ شخص اپنے آپ کو ناکارہ اور جاہل کہہ رہا ہے، لیکن بسا اوقات یہ سراسر تکبر ہوتا ہے، کیونکہ وہ شخص یہ الفاظ اس لئے کہتا ہے تاکہ سامنے والا پلٹ کر یہ کہے کہ جناب! آپ جاہل کہاں، آپ تو بہت بڑے علامہ ہیں۔ اس کا آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں، وہ اس طرح کہ جو شخص اپنے آپ کو یہ کہہ رہا ہے کہ میں جاہل ہوں، میں ناکارہ ہوں، اس کے جواب میں کوئی دوسرا شخص یہ کہہ دے کہ بیشک آپ جاہل اور ناکارہ ہیں، بس اس وقت اس کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ سچے دل سے یہ الفاظ نہیں کہہ رہا تھا بلکہ اس لئے کہہ رہا تھا تاکہ سامنے والا پلٹ کر اس کے لئے تعریفی کلمات کہے، یہ تواضع نہیں بلکہ تکبر ہے۔

لہٰذا یہ تکبر بڑا دقیق اور باریک ہوتا ہے، اس کے وجود کا پتہ نہیں چلتا، اس لئے کسی معالج کی ضرورت ہوتی ہے جو یہ پہچان کر بتائے کہ اس کے اندر تکبر ہے۔

بظاہر تکبر حقیقت میں تکبر نہیں

بعض اوقات بظاہر دیکھنے میں تکبر نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں نہیں ہوتا، جیسے حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ))

''میں آدم کے تمام بیٹوں کا سردار ہوں''(۱)

یہ کون کہہ رہا ہے؟ نبی پاک ﷺ، اگر کوئی دوسرا آدمی یہ بات کہے تو یہ اس کے حق میں بڑائی کا جملہ ہے۔ لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ فرما رہے ہیں کہ میں آدم کے بیٹوں کا سردار ہوں، لیکن یہ بات کسی فخر اور تکبر کی وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے آدم کے بیٹوں کی سرداری عطا فرمائی ہے۔ اب ظاہر میں یہ الفاظ بڑائی کے ہیں، حقیقت میں بڑائی نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا تعریف پر ہنسنا

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ جب کوئی شخص ان کے پاس آکر ان کی تعریف کرتا کہ حضرت! آپ نے بڑا اچھا وعظ فرمایا، فلاں بات بڑی اچھی ارشاد فرمائی، تو وہ بہت خوش ہوتے اور ہنستے تھے۔ اب دیکھنے والا یہ سمجھتا کہ یہ بزرگ اپنی تعریف سن کر خوش ہو رہے ہیں، اور جس شخص کے دل میں عجب اور کبر ہوتا ہے اس کی تو خواہش ہی یہ ہوتی ہے کہ دوسرا آدمی میری تعریف کرے اور تعریف سن کر اس کو بہت خوشی ہوتی ہے۔ کسی شخص نے حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضرت! آپ کو اپنی تعریف سن کر بڑا مزہ آتا ہے، کیونکہ جب کوئی آپ کے کسی کام کی تعریف کرتا ہے تو آپ بہت خوش ہوتے ہیں۔ حضرت نے جواب میں فرمایا: ہاں بھائی! میں بہت خوش ہوتا ہوں، اس لئے کہ کوئی شخص میرے کسی عمل کی تعریف کرتا ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرا تو کوئی عمل نہیں ہے، وہ تو میرے اللہ نے مجھے توفیق دی تو میں نے وہ عمل کرلیا، تو درحقیقت میرے اللہ کی تعریف ہوتی ہے، اور میں اللہ کی تعریف پر خوش ہوتا ہوں کہ میرے اللہ نے مجھ سے یہ کام کرادیا اور مجھے اس کام کی توفیق عطا فرمادی، میں اس پر خوش ہوتا ہوں۔ اب دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ صاحب عجب اور کبر میں مبتلا ہیں، لیکن حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کے شکر کے مقام پر ہیں۔

---

(۱) صحیح مسلم، كتاب الفضائل، باب تفضيل نبينا على الخلائق، رقم: ٤٢٢٣، سنن الترمذی، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، باب ومن سورة بنی إسرائيل، رقم: ٣٠٧٣، سنن أبی داؤد، كتاب السنة، باب فی التخيير بين الأنبياء، رقم: ٤٠٥٣، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر الشفاعة، رقم: ٤٢٩٨، مسند أحمد، رقم: ٢٤١٥

لہٰذا بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ تکبر کی بیماری ہوتی ہے، لیکن انسان کو پتہ نہیں لگتا، اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دیکھنے میں بیماری معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں بیماری نہیں ہوتی۔ اس لئے صرف یہ کہہ دینا کہ ہمارے اندر تکبر نہیں ہے، اس سے بات نہیں بنتی، اس لئے کہ جب تمہارے اندر تکبر ہوگا تو تمہیں پتہ بھی نہیں ہوگا کہ تمہارے اندر تکبر ہے یا نہیں۔

متکبر کی بہترین مثال

کسی نے عربی زبان میں متکبر کی ایک بہت اچھی مثال بیان کی ہے، کہ متکبر کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو اور نیچے کی طرف دیکھ رہا ہو، اب نیچے جو لوگ اس کو نظر آرہے ہیں، وہ ان سب کو چھوٹا سمجھتا ہے، کیونکہ وہ سب اس کو چھوٹے چھوٹے نظر آتے ہیں، اور نیچے والے اس کو چھوٹا دیکھتے ہیں، اس لئے وہ اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں، لہٰذا وہ دوسروں کو چھوٹا سمجھتا ہے اور دوسرے اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس متکبر کو اپنے تکبر کا پتہ نہیں ہے، لہٰذا اپنے آپ کو ان سے افضل سمجھ کر ان کو چھوٹا سمجھ رہا ہے، اور دوسرے لوگ جن کو یہ معلوم ہے کہ یہ متکبر ہے، وہ چاہے منہ پر اس کی تعریف کریں، لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بیوقوف آدمی ہے اور تکبر کے اندر مبتلا ہے۔ اس لئے معالج کے بغیر تکبر کا پتہ نہیں چلتا۔ لہٰذا یہ دھوکہ مت کھانا کہ ہم تو تکبر کی وجہ سے ٹخنوں سے نیچے ازار نہیں کرتے، کیونکہ ازار کو نیچے کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہے، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔

تکبر کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ ملفوظات ہیں۔ ان کی مختصر تشریح عرض کرتا ہوں۔

عالم کا اپنے کو جاہل سے اچھا سمجھنے کا علاج

ایک صاحب نے حضرت والا سے پوچھا:

''اکثر بلا قصد یہ خیال آتا ہے کہ فلاں جاہل ہے، میں عالم ہوں، میں اس سے اچھا ہوں''(۱)

ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے واقعۃً علم عطا فرمایا ہے، عالم ہے، اور دوسرا شخص عالم نہیں ہے، اب اس عالم کو یہ خیال آہی جاتا ہے کہ مجھے الحمد للہ علم حاصل ہے جو دوسرے کو حاصل نہیں ہے، اور علم جہل سے اچھا ہے، اس لئے اپنے اچھے ہونے کا خیال دل میں آگیا۔ آیا یہ خیال تکبر ہے یا نہیں؟ حضرت والا نے جواب دیا:

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۴

''نفس سے کہے کہ کیا معلوم خدا تعالیٰ کے یہاں کون اچھا ہے، ممکن ہے کہ اس کا باطن اچھا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں خدا تعالیٰ کے نزدیک بڑا ذلیل و خوار ہوں، اور خدا تعالیٰ نے تجھ کو دو چار حرف ظاہری سکھلا دیئے ہیں، اس لئے تو بڑائی کرتا ہے، اگر وہ چاہے تو آج چھین لے تو کیا کرے گا، اسی کا استحضار بہ تکرار کرے اور دعا بھی کرے''(۱)

ایک اشکال

یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہئے، بعض اوقات دل میں یہ خیال آتا ہے کہ آدمی کسی حقیقت سے تو انکار نہیں کرسکتا، اگر ایک آدمی کے پاس علم ہے اور دوسرے کے پاس وہ علم نہیں ہے، اب جس کے پاس علم ہے وہ یہ کیسے کہہ دے کہ میرے پاس علم نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ علم جہل کے مقابلے میں بہتر ہے، قرآن کریم کی آیت ہے:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾(۲)

یعنی علم رکھنے والا بہتر ہے اس کے بنسبت جو علم نہیں رکھتا۔ لہٰذا جس کے پاس علم ہے وہ کیسے جھٹلا دے کہ میرے اندر یہ وصف نہیں ہے۔ یا مثلاً ایک آدمی زیادہ صحتمند ہے، اس کے مقابلے میں دوسرا آدمی کمزور ہے، اب ظاہر ہے کہ صحتمند یہ سوچے گا کہ اس کے مقابلے میں میری صحت اچھی ہے، میں اس کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہوں، مضبوط ہوں۔

یا مثلاً ایک آدمی کے پاس پیسہ زیادہ ہے اور اس کے مقابلہ میں دوسرے آدمی کے پاس پیسہ نہیں ہے، تو وہ یہ خیال کرے گا کہ میں اس کے مقابلے میں مالدار ہوں، اس کے پاس پیسہ نہیں ہے، میرے پاس پیسہ ہے۔ یا ایک آدمی بڑا افسر ہے، کسی بڑے عہدے پر فائز ہے، دوسرا آدمی چپراسی اور مزدور ہے، تو بڑے منصب اور عہدے والا اپنے آپ کو اس چپراسی سے بڑا سمجھے گا یا نہیں؟ اب اگر وہ اپنے کو بڑا سمجھے تو تکبر ہوگیا، اور اگر بڑا نہ سمجھے تو جھوٹ ہوگیا۔ مثلاً اگر وہ یہ سمجھے کہ میں افسر نہیں ہوں، بلکہ میں تو ایک مزدور ہوں، یہ تو بالکل جھوٹ ہوگیا، یا مثلاً ایک آدمی طاقتور ہے، صحتمند ہے، وہ یہ کہے کہ میں طاقتور نہیں ہوں، بلکہ میں کمزور ہوں، یا مثلاً ایک عالم ہے، وہ یہ کہے کہ میں عالم نہیں ہوں، بلکہ جاہل ہوں، یہ تو جھوٹ ہوگیا۔ اب سوال یہ ہے کہ دونوں باتوں کے درمیان کیسے تطبیق ہوگی کہ تکبر بھی نہ ہو اور جھوٹ بھی نہ ہو۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۴

(۲) الزمر: ۹، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''کہو کہ: ''کیا وہ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے سب برابر ہیں؟''

اس اشکال کا جواب

ایک اور جگہ پر حضرت والا نے ایک اور جملہ ارشاد فرمایا ہے، اس کو یاد رکھنا چاہئے، اس سے یہ مسئلہ آسان ہو جاتا ہے وہ یہ کہ

''اپنے آپ کو اکمل سمجھنا تکبر نہیں، افضل سمجھنا تکبر ہے''

اکمل سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی یہ سمجھے کہ دوسرے کے پاس بظاہر علم کم ہے اور میرے پاس علم زیادہ ہے، اس کی صحت اچھی نہیں ہے اور میری صحت اچھی ہے، اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں میرے پاس الحمدللہ اتنے پیسے ہیں، اس کے پاس چھوٹا مکان ہے اور میرے پاس بڑا مکان ہے، اس کی اولاد کم ہے اور میری اولاد زیادہ ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں میں مقدار کے اعتبار سے اپنے آپ کو زیادہ سمجھنا تکبر نہیں۔ البتہ افضل سمجھنا کہ میں اس سے افضل ہوں، یہ تکبر ہے۔ اور اس کا علاج حضرت والا نے یہ بتادیا کہ آدمی یہ سوچے کہ کیا معلوم خدا تعالیٰ کے یہاں کون اچھا ہے۔

اس نعمت پر شکر ادا کرے

یہ جو اوپر بیان کیا کہ اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلے میں اکمل سمجھنا اور علم میں زیادہ سمجھنا تکبر نہیں، یا عمر میں زیادہ سمجھنا، یا صحت میں زیادہ سمجھنا، یا مال میں زیادہ سمجھنا تکبر نہیں، اس میں بھی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ دل میں جس زیادتی کا خیال آرہا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، اور یہ کہے کہ یہ زیادتی میری قوتِ بازو کا کرشمہ نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ جل جلالہ کی عطا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی عطا کا تصور کرے گا تو اس سے تکبر پیدا نہیں ہوگا۔

افضل سمجھنا بے بنیاد ہے

اور اپنے آپ کو دوسرے سے افضل سمجھنا بالکل بے بنیاد ہے، کیا معلوم کہ آخر میں جا کر کیا انجام ہونا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے یہاں کون مقرب ہے اور کون مقرب نہیں ہے، نہ وہاں علم کی بڑائی کام آئے گی، نہ عمر کی بڑائی کام آئے گی، نہ وہاں مال و دولت کی کثرت کام آئے گی، نہ اس کی گارنٹی ہے کہ جس کے پاس علم زیادہ ہے وہ ضرور افضل ہوگا، جبکہ حدیث شریف میں ہے کہ سب سے پہلے جہنم جس کے ذریعہ سلگائی جائے گی وہ ایک عالم ہوگا۔ لہٰذا صرف علم کے بھروسے پر یا اس بنا پر کہ لوگ دنیا میں میرے ہاتھ چومتے ہیں، یا مجھے بڑا سمجھتے ہیں، یا علامہ سمجھتے ہیں، میں افضل ہوں۔ یاد رکھئے! اس پر کوئی بھروسہ نہیں ہے، جب حساب کتاب کا منظر سامنے ہوگا تو بڑے بڑے علامہ دھرے رہ جائیں

گے، لہٰذا علم کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے سے کیا افضل سمجھے۔

اسی طرح مال کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے سے کیا افضل سمجھے، جبکہ قیامت کے دن بڑے بڑے مالدار جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ لہٰذا جب کسی بات کا بھروسہ نہیں تو پھر کس بنیاد پر آدمی اپنے آپ کو دوسرے سے افضل سمجھے۔

ایک بزرگ کا واقعہ

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ ایک آدمی نے ان سے یہ کہہ دیا کہ تم تو میرے کتے سے بدتر ہو۔ ان بزرگ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ ابھی میرا کچھ پتہ نہیں کہ میں کتے سے بدتر ہوں یا نہیں، جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی اور وہاں پر میں حساب کتاب کے مرحلے کو پار کر گیا تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کتے سے افضل ہوں، اور اگر میں وہاں حساب کتاب کے مرحلے سے نہ گزر پایا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق ہو گیا تو پھر بیشک تم ٹھیک کہتے ہو کہ میں کتے سے بدتر ہوں، اس لئے کہ کم از کم اس کتے کو حساب کتاب نہیں دینا پڑے گا اور اس کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا سامنا نہیں ہوگا۔

یہ خیال دل سے نکال دیں

یہ ہیں حقیقی معنی میں اللہ والے، دوسرا شخص گالی دے رہا ہے، لیکن یہ اپنے حقائق اور معارف میں گم ہیں، اور اپنی حقیقتِ حال کو دیکھ رہے ہیں کہ میری حقیقت تو یہ ہے۔ لہٰذا دماغ سے افضل ہونے کا خیال نکال دو۔ نفس سے کہے کہ تمہیں کیا معلوم کہ خدا تعالیٰ کے یہاں کون اچھا ہے، ممکن ہے کہ اس کا باطن اچھا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں خدا تعالیٰ کے نزدیک بڑا ذلیل و خوار ہوں، اور خدا تعالیٰ نے تجھ کو دو چار حرف ظاہری سکھا دیئے ہیں، اس لئے تو بڑائی کرتا ہے، اگر وہ چاہے تو آج چھین لے۔ کس چیز پر تو اکڑتا ہے اور اتراتا ہے؟ کیا یہ علم تجھے ماں کے پیٹ سے حاصل ہو گیا تھا؟ کسی نے اپنے فضل و کرم سے عطا فرما دیا، اور جس نے عطا فرمایا ہے وہ جب چاہے سلب کر لے۔ جب چاہے واپس لے لے۔

کیا تو مال پر اکڑتا ہے، کیا یہ مال تجھے ماں کے پیٹ سے ملا تھا؟ کسی دینے والے نے مال دیا ہے، اور جس نے دیا ہے وہ جب چاہے واپس لے لے۔ کیا تو صحت پر اکڑتا ہے؟ بڑے بڑے تندرست اور توانا لوگ ایسے گزرے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان سے صحت واپس لی تو وہ بتاشے کی طرح پچک گئے۔

سبق آموز واقعہ

ہمارے ایک عزیز تھے، جن کا ابھی ایک دو سال پہلے انتقال ہوا۔ ان کے بارے میں سارے دیوبند میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ برف کی سلی کو مُکّا مار کر توڑ دیتے تھے، اتنے طاقتور تھے، انہوں نے کبھی بھی زندگی میں تربوز کو چاقو سے نہیں کاٹا، بس مُکّا مارا اور توڑ دیا، اور اس کے ساتھ ساتھ بڑے عابد وزاہد آدمی تھے۔ بعد میں لاہور میں مقیم ہو گئے تھے، چار پانچ سال پہلے لاہور میں ان سے ملاقات کے لئے گیا تو دیکھا کہ کھانا کھانے کے لئے ہاتھ منہ تک نہیں اُٹھ رہا تھا، دوسرے لوگ کھانا کھلا رہے تھے، جب میں ان کے پاس پہنچا تو مجھے دیکھ کر رو پڑے، اور کہنے لگے کہ یہ وہی "حامد" ہے جو برف کی سلی مُکّے مار کر توڑ دیا کرتا تھا، اور اب یہ حال ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھا سکتا۔

تم کس بات پر اِتراتے ہو؟

ارے تم کس بات پر اتراتے ہو؟ صحت پر اتراتے ہو؟ قوت پر اتراتے ہو؟ کیا مال پر اتراتے ہو؟ کیا علم پر اتراتے ہو؟ ارے ان میں سے کوئی چیز ایسی ہے جس کی ہمیشہ تمہارے پاس رہنے کی گارنٹی ہو؟ بلکہ کسی دینے والے نے دی ہے، وہ جب چاہے واپس لے لے۔ اس لئے یہ دو چار حرف اس نے سکھا دیئے ہیں، وہ اگر آج چھین لے تو تم کیا کرلو گے؟ بس اس کا استحضار اور تکرار کیا جائے، جب کبھی دل میں بڑائی کا خیال آئے، بس اس کا دھیان کرلے کہ کسی دینے والے نے یہ وصف اپنے فضل سے دیا ہے، اپنے انعام سے دیا ہے، تیرا کوئی استحقاق نہیں تھا، کتنے لوگ ہم میں ایسے ہیں جو جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں، اور جس طرح دیا ہے وہ اسی طرح واپس بھی لے سکتا ہے۔ لہٰذا تیرے لئے اترانے اور اکڑنے کا اور دوسروں پر بڑائی جتلانے کا اور اپنے آپ کو افضل سمجھنے کا کوئی موقع نہیں، ہاں، شکر کا موقع ہے کہ اے اللہ! آپ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی، میں اس کا مستحق نہیں تھا، اور میرے قبضۂ قدرت میں نہیں تھا، آپ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے عطا فرمائی، اے اللہ! آپ کا شکر ہے۔

"اَللّٰھُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ"

"شکر" بے شمار بیماریوں کا علاج

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ شکر ایسی چیز ہے کہ یہ بیشمار روحانی بیماریوں کا علاج ہے۔ جو آدمی شکر کرے گا، وہ کبھی تکبر میں مبتلا نہیں ہوگا، انشاء اللہ۔ اس لئے کہ شکر

کے معنی کیا ہیں؟ شکر کے معنی یہ ہیں کہ یہ نعمت جو مجھے ملی ہوئی ہے، میں اس کے لائق نہیں تھا، میں اس کا مستحق نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے دی ہے، اس کا شکر و احسان ہے۔

قرض کی ادائیگی شکر کا موقع نہیں

شکر کب کیا جاتا ہے؟ اگر کوئی شخص اپنا فریضہ ادا کرے یا قرضہ ادا کرے، تو کیا قرض خواہ کے ذمے شکر ادا کرنا واجب ہے؟ نہیں۔ مثلاً ایک آدمی مجھ سے ایک ہزار روپے قرض لے گیا، اور یہ کہا کہ دو مہینے بعد واپس کروں گا، یہ احسان تو میں نے کیا کہ میں نے ایک ہزار روپے بطور قرض دیئے، اس کو چاہئے کہ میرا شکریہ ادا کرے، پھر جب دو ماہ بعد وہ ایک ہزار روپے مجھے واپس لا کر دے گا، تب بھی احسان دینے والے کا رہا کہ اس نے ایک ہزار روپے دیئے تھے اور دو ماہ تک اس ہزار روپے سے اپنے آپ کو محروم رکھا، لہٰذا وہ قرض دار جب واپس لا کر دے رہا ہے تو وہ کوئی احسان نہیں کر رہا ہے، لہٰذا وہ شکریہ کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔

شکر کا موقع یہ ہے

شکریہ اس وقت ادا کیا جاتا ہے جب آدمی اپنے فریضہ سے زیادہ کام کرے، مثلاً ایک ہزار روپے دوسرے کے ذمے واجب تھے، واپس کرتے وقت اس نے ایک ہزار کے بجائے بارہ سو روپے اپنی طرف سے خوشدلی کے ساتھ واپس کر دیئے۔ چونکہ اس نے زیادہ دے کر احسان کیا، لہٰذا اس کا شکریہ واجب ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذمے یہ کام ضروری اور واجب نہیں تھا، اور میں اس کا مستحق تو نہیں تھا لیکن اللہ جل جلالہ نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی۔ لہٰذا شکر کے اندر خود یہ اعتراف پنہاں ہے کہ میں اس کے لائق نہیں تھا، اور جو شخص لائق نہ ہونے کا اعتراف کرے کیا وہ تکبر میں مبتلا ہو سکتا ہے؟ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جب بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت ملے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، انشاء اللہ تکبر کی جڑ کٹتی جائے گی

شیطان کے داؤ سے بچنے کا طریقہ

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ جب شیطان راندۂ درگاہ ہو گیا اور اس نے اللہ تعالیٰ سے کہا:

﴿ثُمَّ لَآتِيَنَّهُمْ مِنْۢ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ﴾(۱)

---

(۱) الاعراف:۱۷

چونکہ ابنِ آدم نے مجھے تباہ کیا ہے، اس لئے اس کا بدلہ لینے کے لئے اس کے پاس دائیں سے آؤں گا، بائیں طرف سے آؤں گا، آگے سے آؤں گا، پیچھے سے آؤں گا، اور ابن آدم کو گمراہ کروں گا۔ (آخر میں کہتا ہے کہ) آپ ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائیں گے۔

ہمارے حضرت والا فرماتے تھے کہ شیطان چونکہ بڑا اخرانٹ ہے، اس کو یہ معلوم ہے کہ جو آدمی شکر کرنے والا ہوگا، اس کے سامنے میری نہیں چلے گی، اس پر میرا داؤ نہیں چلے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا ہو، اس پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا۔

عین پریشانی میں نعمتوں کو یاد کرو

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی جو نعمت حاصل ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور ایک وقت میں صرف ایک نعمت نہیں ہے بلکہ ہر لمحے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بارش برس رہی ہے۔

﴿وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا﴾(۱)

"اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو گے تو شمار نہیں کر سکو گے"

انسان چونکہ ناشکرا ہے، اس لئے اگر ذرا سی کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے یا پریشانی آجاتی ہے تو اس کو ہر وقت گاتا رہتا ہے، اور عین اس تکلیف اور پریشانی کے وقت میں اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں متوجہ اور مبذول ہیں، ان کا کوئی ذکر نہیں، ان کی طرف ذرا سا دھیان نہیں، ورنہ عین تکلیف اور پریشانی کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کی اتنی نعمتیں ہماری طرف متوجہ ہوتی ہیں کہ ہم ان کا شمار نہیں کر سکتے۔

"شکر" کا ایک انوکھا انداز

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک نانا تھے، حضرت والا کی تربیت میں ان کو بھی بڑا دخل رہا ہے، بڑے فاضل اور بزرگوں کے صحبت یافتہ تھے، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں بچپن میں رات کو سونے کے وقت ان کو دیکھتا تو مجھے عجیب نظر آتا تھا، وہ یہ کہ میرے نانا رات کو سونے کے وقت بستر پر بیٹھ جاتے اور بڑے والہانہ انداز میں پڑھنا شروع کر دیتے:

"اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ"

مسلسل جھوم جھوم کر کافی دیر تک یہ پڑھتے رہتے۔ جب میں نے کچھ ہوش سنبھالا تو میں نے ایک دن ان سے پوچھا کہ یہ رات کو سونے سے پہلے آپ کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب میں فرمایا

(۱) ابراھیم: ۳٤

کہ بات دراصل یہ ہے کہ سارا دن تو غفلت میں گزر جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں ہوتا، اس لئے میں رات کو سونے سے پہلے بستر پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی ایک ایک نعمت کا تصور کر کے اس پر شکر ادا کرتا ہوں۔

یا اللہ! آپ نے یہ مکان عطا فرمایا۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ
آپ نے صحت عطا فرمائی ـــــ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ
آپ نے رزق عطا فرمایا ـــــ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ
آپ نے یہ آرام دہ بستر عطا فرمایا۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ
آپ نے عافیت عطا فرمائی ـــــ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ
آپ نے بیوی عطا فرمائی ـــــ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ
آپ نے بچے عطا فرمائے ـــــ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

ایک ایک نعمت کا تصور کر کے اس پر شکر ادا کرتا ہوں تاکہ ان نعمتوں کے شکر کا ہزارواں یا لاکھواں حصہ زبان سے ادا ہو جائے۔

سونے سے پہلے شکر ادا کرلو

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ تم بھی ایسا ہی کیا کرو، رات کو سونے سے پہلے تمام نعمتوں کا شکر ادا کرلیا کرو۔ ذرا سا دھیان کرو گے تو سینکڑوں نعمتوں کا استحضار ہو جائے گا۔ ارے صرف ایک نعمت کو سوچنا شروع کرو گے تو وہ بھی اتنی زیادہ نظر آئے گی کہ ساری عمر بھی سجدے میں پڑے رہو گے تب بھی اس ایک نعمت کا شکر ادا نہیں ہوگا۔ یہ دو آنکھیں اللہ تعالیٰ نے دی ہیں، ایک آنکھ کو لے لو اور اس کے بارے میں سوچو کہ یہ کیسی نعمت ہے؟ ذرا سا اس میں بال آجائے تب اندازہ ہوگا کہ کیسی نعمت ہے، اسی ایک نعمت کو سوچنا شروع کر دو گے تو حق شکر ادا نہیں ہو سکے گا۔

تکبر سے بچنے کا ایک نسخہ

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میاں! یہ تکبر بڑی خراب چیز ہے، بڑے بڑے معالجوں کو چکر دے دیتی ہے، اس کا علاج کرنا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن میں تمہیں ایک چٹکلہ بتا رہا ہوں، اس چٹکلے پر عمل کرلو تو انشاء اللہ پھر اس تکبر کی بیماری میں مبتلا ہی نہیں ہو گے، اور اگر ہو گئے تو انشاء اللہ جلدی نکل جاؤ گے، وہ چٹکلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو۔ ہر وقت، ہر لمحے، چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کے شکر کی رٹ لگاؤ۔ موسم اچھا ہے......

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

ہوا چل رہی ہے......

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

جو اچھی بات سامنے آئے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو، جتنا جتنا شکر ادا کرو گے، انشاء اللہ تکبر سے اتنی ہی حفاظت رہے گی۔ کہنے کو تو یہ چھوٹا سا چٹکلہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بڑے کانٹے کی بات ہے، اور عمل کرنا بھی اس پر مشکل نہیں، صرف دھیان کرنے اور مشق کرنے کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تکبر کی اقسام

فرمایا:

''اقسام کبر کے اس کثرت سے ہیں کہ لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی۔ اور اکثر ان میں ادق اور اغمض اس قدر ہیں کہ بجز محقق کے کسی کی بھی نظر وہاں نہیں پہنچتی، اور اس میں علماء ظاہر کو بھی اس محقق کی تقلید بلا تفحص حقیقت کرنا پڑتی ہے''(۱)

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ یہ کبر کی بیماری ایسی ہے کہ خود بیمار کو پتہ نہیں ہوتا کہ میں اس بیماری میں مبتلا ہوں اور کبر کی بعض قسمیں اتنی دقیق اور باریک ہیں کہ اکثر اوقات بیمار کو اس کا پتہ نہیں چلتا، ایسا شیخ جو محقق بھی ہو، وہی پتا لگاتا ہے کہ اس کو یہ بیماری ہے یا نہیں ہے، اور اس بیماری کا علاج کیا ہے؟

کبر کے مختلف علاج

ایک مثال کے ذریعہ اس کو سمجھئے! وہ یہ کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں یہ معمول تھا کہ جب کوئی شخص اپنی اصلاح کرانے کے لئے آتا تو ''کبر'' کا علاج سب سے پہلے کیا جاتا تھا، حضرت والا مختلف لوگوں کے لئے مختلف علاج تجویز فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً کسی کے اندر دیکھا کہ اس کے اندر ''تکبر'' ہے تو آپ نے اس سے فرمایا کہ تم ہر نماز کے بعد مسجد میں یہ اعلان کیا کرو کہ بھائیو! میرے اندر تکبر کی بیماری ہے، میرے لئے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے نجات عطا فرمائے۔ اب ظاہر ہے کہ ایک متکبر آدمی جس کے دل میں تکبر اور اپنی بڑائی ہے، اس کو جب بھرے مجمع میں یہ اعلان کرنا پڑے کہ میرے اندر تکبر ہے تو اس اعلان کے نتیجے میں اس کے دل پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۴

لیکن جب شیخ کے حکم سے کرتا ہے تو دل پر اتنی زور کی ضرب پڑتی ہے کہ وہ سارا تکبر ختم ہو جاتا ہے۔

یا مثلاً کسی متکبر کے لئے یہ علاج تجویز کیا کہ تم نمازیوں کے جوتے سیدھے کیا کرو۔ ہر ایک کو مختلف علاج بتائے، کیونکہ ہر آدمی کے لئے ایک علاج نہیں ہوتا، چونکہ بیماریاں مختلف ہوتی ہیں، ان کے انداز مختلف ہوتے ہیں، اسباب مختلف ہوتے ہیں، حالات مختلف ہوتے ہیں، اس لئے ایسا نہیں ہے کہ ایک علاج سب کے لئے تجویز کردو، جیسے حکیم صاحب نے ایک ہی جوشاندہ سب کے لئے تجویز کردیا۔ یا کوئی شخص یہ سوچے کہ چونکہ حضرت والا نے فلاں شخص کو فلاں بیماری میں یہ علاج تجویز کیا تھا، لہٰذا میں بھی وہی علاج کرلوں، یہ ٹھیک نہیں ہے، بلکہ شیخ دیکھتا ہے کہ اس کے لئے کیا مناسب ہے۔

خود اپنا علاج کرنا

ایک صاحب نے یہ دیکھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فلاں شخص کو یہ علاج بتایا ہے کہ تم نمازیوں کے جوتے سیدھے کیا کرو۔ اب بجائے اس کے کہ اپنے علاج کے لئے خود رجوع کرتے اور اپنے لئے علاج تجویز کراتے، ان صاحب کو دیکھ کر خود اپنا علاج شروع کردیا اور نمازیوں کے جوتے سیدھے کرنے شروع کردیئے۔ حضرت کو پتہ چلا کہ فلاں صاحب نے خود سے یہ کام شروع کردیا ہے، آپ نے اس کو بلایا، اور اس سے فرمایا کہ اس طرح علاج نہیں ہوا کرتا، اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمہارے اس طرح لوگوں کے جوتے سیدھے کرنے سے تمہارے تکبر میں اور زیادہ اضافہ ہوگا، اس تکبر میں کمی نہیں ہوگی، اس لئے کہ دماغ میں شیطان یہ بات بٹھائے گا کہ دیکھ تو کتنا متواضع ہے۔ لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا کہ آدمی خود اپنے تکبر کا علاج کرنے بیٹھ جائے، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس کو یہ علم عطا کیا ہو، وہی یہ کام کرسکتا ہے۔

کسی شیخ سے تربیت حاصل کرنا

عام طور پر یہ علم عطا نہیں ہوتا جب تک اس نے اپنے آپ کو پامال نہ کیا ہو، شیخ تھوڑے رگڑے دیتا ہے، اس رگڑے کھانے کے نتیجے میں وہ کبر دل سے نکلتا ہے اور اس وقت حقیقت کھلتی ہے کہ کس کبر کا کیسے علاج کیا جائے۔ ہمارے یہ جتنے بزرگ جن کا نام لے کر ہم زندہ ہیں: حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، یہ حضرات رگڑے کھائے ہوئے تھے، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو خود ساختہ پیر بن کر بیٹھ گیا ہو، بلکہ ان سب نے رگڑے کھائے تھے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ جب نئے نئے درسِ نظامی سے فارغ ہوئے اور عالم بن گئے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ علم تکبر پیدا کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے، اس لئے کہ عالم بننے کے بعد دماغ میں یہ بات آجاتی ہے کہ میں نے بہت کچھ پڑھ لیا، مجھے بہت کچھ آتا ہے۔ بہرحال، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، یہ ہمارے تمہارے جیسے عالم نہیں تھے کہ بس کچے پکے پڑھ کر عالم بن گئے بلکہ ان کی استعداد بڑی پختہ تھی۔ اس وقت تھانہ بھون کی خانقاہ میں تین بزرگ بیٹھتے تھے، ایک حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، دوسرے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور تیسرے حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ، ان کو "اقطابِ ثلاثہ" کہا جاتا ہے، یہ تین اولیاء اللہ خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ عالم تھے، ان کا ایک رسالہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر سے گزرا، اس رسالے میں کوئی ایسی بات لکھی ہوئی تھی جو علمی طور پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو صحیح معلوم نہیں ہورہی تھی، چنانچہ انہوں نے ارادہ کیا کہ حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے اس مسئلہ پر مناظرہ کروں۔ چنانچہ مناظرہ کی نیت سے گنگوہ سے تھانہ بھون کی طرف روانہ ہوئے۔

جب تھانہ بھون پہنچے تو چونکہ پہلے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کمرہ تھا، اور حضرت حاجی صاحب سے پہلے سے شناسائی تھی، اس لئے سلام کرنے کے لئے حاجی صاحب کے پاس رکے۔ حضرت حاجی صاحب نے پوچھا کہ کہاں جارہے ہو؟ کہا کہ شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جارہا ہوں۔ کیوں جارہے ہو؟ ان سے مناظرہ کرنا ہے۔ توبہ توبہ، وہ اتنے بڑے عالم، اور تم ابھی نئے نئے فارغ ہوئے ہو، اور ابھی ابھی مولوی بنے ہو، اور اتنے بڑے عالم سے مناظرہ کرنے جارہے ہو، جو اللہ والے بھی ہیں۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ حضرت! انہوں نے ایک رسالے کے اندر ایسی غلط بات لکھ دی ہے۔ حضرت حاجی صاحب نے حضرت مولانا کو ٹھنڈا کیا، اور اسی ٹھنڈا کرنے میں اللہ تعالیٰ نے ان کی کایا پلٹ دی، حاجی صاحب کی ان پر ایسی نظر پڑی کہ مناظرہ کرنے کا جو ارادہ تھا وہ تو ختم کردیا، اور وہیں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوگئے۔

تمہیں سب کچھ دے دیا

پھر چالیس دن وہاں رہے، حالانکہ جب گنگوہ سے چلے تھے اس خیال سے چلے تھے کہ تھوڑی دیر بعد واپس آجاؤں گا، اس لئے کوئی کپڑا وغیرہ بھی ساتھ نہیں لیے تھے، بلکہ جو جوڑا پہن کر آئے تھے،

اسی کو دھو کر سکھا کر دوبار پہن لیتے، اس طرح چالیس دن وہاں گزار دیئے۔ اس قیام کے دوران حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خوب رگڑے کھلائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب چالیس دن کے بعد واپس جانے لگے تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے فرمایا:

''میاں رشید احمد! جو کچھ میرے پاس امانت تھی، وہ ساری میں نے تمہارے حوالے کر دی''

یہ کوئی معمولی مقام ہے کہ شیخ یہ کہے کہ جو کچھ میرے پاس تھا، وہ سب کچھ میں نے چالیس دن میں تمہیں دے دیا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ مقام عطا فرمایا تھا۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی عجیب حالت

پھر جب آپ واپس گنگوہ پہنچے تو ایک عرصے تک عجیب استغراق کی حالت طاری رہی، حتیٰ کہ بہت عرصے تک حضرت حاجی صاحب کو خط بھی نہیں لکھا، تو حضرت حاجی صاحب نے خود خط لکھا کہ

''مدت سے آں عزیز کی خیریت معلوم نہیں ہوئی، کس حالت میں ہیں، خط کے ذریعہ اپنے حالات سے مطلع کریں''

اب دیکھئے! یہ خط شیخ اپنے مرید کو لکھ رہا ہے۔ جواب میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ

''حضرت! بہت دن سے خط نہیں لکھ سکا، کوتاہی رہی، لیکن اس لئے نہیں لکھا کہ اپنی حالت لکھتے ہوئے شرم معلوم ہوتی تھی کہ کیا اپنا حال لکھوں، آپ سے تعلق بھی ہو گیا، اس کے باوجود اپنی بے حالی کو کیا لکھوں۔ اس لئے شرم معلوم ہوتی تھی، البتہ آپ کی دعاؤں اور توجہ سے اتنا فرق ضرور معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) شریعت طبیعت بن گئی ہے۔

یعنی جس طرح انسان کے اندر طبعی تقاضے بھوک اور پیاس کے ہوتے ہیں اور جب تک انسان ان تقاضوں کو پورا نہ کرلے، انسان کو اس وقت تک چین نہیں آتا، اسی طرح شریعت کے تقاضوں پر جب تک عمل نہ کرلوں، اس وقت تک چین نہیں آتا۔

(۲) مادح اور ذام یکساں ہو گئے ہیں۔

یعنی تعریف کرنے والا اور برائی کرنے والا دونوں برابر ہو گئے ہیں، کوئی تعریف کرے تو، اور کوئی برائی کرے تو، دونوں کے اندر کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا کہ یہ تعریف کر رہا ہے اور یہ برائی کر رہا ہے، نہ تعریف سے طبیعت میں کوئی حرکت پیدا ہوتی ہے اور نہ برائی سے طبیعت میں کوئی تغیر آتا ہے۔

(۳) کسی مسئلہ شرعی میں کوئی اشکال باقی نہیں رہا۔

جب یہ خط تھانہ بھون میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچا تو آپ نے وہ خط اپنے سر پر رکھ لیا اور فرمایا کہ

''یہ حال جو انہوں نے لکھا ہے، یہ تو اب تک ہمیں بھی حاصل نہیں ہوا''

بہرحال! یہ کیسے شیخ اور کیسے مرید تھے۔ یہ ایسے ہی نہیں بن جاتے، بلکہ کچھ رگڑے کھانے پڑتے ہیں۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور واقعہ

انہی چالیس دن کے قیام کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک دن حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرید حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو بلایا کہ آج تم ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ چنانچہ کھانے کے وقت تشریف لے آئے۔ دستر خوان پر سالن کے دو پیالے تھے۔ ایک میں کوفتے ایک میں دال تھی۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کوفتے کے سالن کا پیالہ اپنے پاس رکھا اور دال کا پیالہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ اشارہ اس طرح کر دیا کہ دال تم کھاؤ، کوفتے ہم کھائیں گے۔ کھانے کے دوران حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ پہنچ گئے۔ حافظ صاحب نے فرمایا کہ

''حضرت! یہ کیا آپ کر رہے ہیں کہ خود تو کوفتے کھا رہے ہیں اور اس کو دال کھلا رہے ہیں؟''

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ

''ارے یہ تو میرا احسان ہے کہ اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلا رہا ہوں، حق تو یہ تھا کہ روٹی پر دال رکھ کر ہاتھ میں دے دیتا کہ باہر سیڑھیوں پر بیٹھ کر کھالے''

یہ الفاظ کہنے کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے چہرے کی طرف دیکھا کہ اس بات سے ان کے چہرے پر کوئی تغیر آیا یا نہیں؟ دیکھا کہ کوئی تغیر نہیں آیا۔ معلوم ہوا کہ الحمد للہ کبر کی بیماری نکل گئی ہے۔ بہرحال! اس طرح رگڑے دیئے جاتے ہیں، تب جاکر علاج ہوتا ہے، ہر ایک کے بس کا کام نہیں کہ وہ اپنے بارے میں خود فیصلہ کرلے کہ میرا کیا علاج ہے۔

شیخ سے علاج تجویز کراؤ

ایک صاحب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا کرتے تھے، وہ اپنا علاج خود تجویز کرلیا کرتے تھے، خود ہی فیصلہ کرلیا کہ میرے اندر تکبر کی بیماری ہے اور پھر خود ہی اپنا علاج تجویز کرلیا۔ ایک مرتبہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو پکڑلیا اور فرمایا کہ اس طریقے سے تمہارا نفس اور زیادہ موٹا

ہو رہا ہے، اور تمہارے اندر اور زیادہ تکبر بڑھ رہا ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ اس ''تکبر'' کی بیشمار قسمیں ہیں، ہر ایک کا حکم الگ ہے، ہر ایک کا علاج الگ ہے۔ اس لئے اس کے علاج کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ اپنے آپ کو کسی شیخ کے حوالے کر دو۔ وہ شیخ پہلے یہ دیکھے گا کہ تکبر ہے یا نہیں؟ کیونکہ بعض اوقات حقیقت میں تکبر نہیں ہوتا، بلکہ تکبر کا شبہ اور دھوکہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات تکبر ہوتا ہے مگر اسے تکبر نہیں سمجھا جاتا۔ اس لئے شیخ پہلے تشخیص کرے گا کہ اس کے اندر تکبر ہے یا نہیں؟ تشخیص کرنے کے بعد وہی اس کا علاج بھی تجویز کرے گا۔

شیخ کی تقلید محض کرو

حتیٰ کہ جو شخص بظاہر عالم اور فارغ التحصیل ہے، قرآن و حدیث اور فقہ و تفسیر سب کچھ پڑھا ہوا ہے، بظاہر تو وہ سب کچھ جانتا ہے، لیکن ایسے عالم کو بھی شیخ محقق کی تقلید محض کرنی پڑتی ہے۔ جب شیخ یہ کہہ دے کہ تمہارے اندر کبر ہے تو سمجھ لے کہ ہاں میرے اندر کبر ہے، اور پھر اس کا علاج کرائے۔ چوں چرا کی گنجائش نہیں، اگر چوں چرا کرے گا تو مارا جائے گا۔

کسی نے خوب کہا ہے کہ

''تلمیذے کہ چون و چرا نکند و مریدے کے چون و چرا کند، ہر دو را بصحرا باید فرستاد''

یعنی وہ شاگرد جو علم ظاہر حاصل کر رہا ہے، اگر وہ چوں و چرا نہ کرے، اس کو باہر نکال دو، وہ شاگرد بننے کے لائق نہیں، اس کا کام ہی یہ ہے کہ سمجھنے کے لئے سوال کرے، جو شبہ پیدا ہو جائے اسے پیش کرے۔ اور جو شخص کسی شیخ کا مرید ہو، وہ چوں و چرا کرے کہ یہ آپ نے کیوں کیا؟ ایسا کیوں کیا؟ ایسے مرید کو جنگل بھیج دینا چاہئے، وہ مرید بنائے جانے کے قابل نہیں ہے۔ لہٰذا شاگرد کا وظیفہ یہ ہے کہ چون و چرا کرے اور سوال کرے، جو شاگرد سبق میں خاموش بیٹھا ہے اور کبھی کچھ پوچھتا ہی نہیں، وہ احمق ہے، وہ سبق کا حق ادا نہیں کر رہا، اور مرید کا کام یہ ہے کہ وہ خاموش بیٹھے، وہ چون و چرا نہ کرے، وہ اگر چوں و چرا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر خرابی ہے۔

لہٰذا جو عالم ظاہر ہو، اس کو اس بات کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ وہ بلا چوں و چرا شیخ کی بات کو تسلیم کرے، اس لئے کہ علم کے اندر خود رفعت کی شان موجود ہے، لہٰذا جس شخص کو کوئی علم حاصل ہو جاتا ہے، اس کے اندر خود بخود ترفع اور بڑائی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ میرے اندر یہ کمال حاصل ہوا۔ اس لئے اکثر و بیشتر علم کے ساتھ تکبر آ ہی جاتا ہے، جب تک اس کی تربیت نہ ہو اور رگڑے نہ کھائے۔

بھائی ذکی کیفی مرحوم رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

میرے سب سے بڑے بھائی محمد ذکی کیفی مرحوم رحمۃ اللہ علیہ تھے، جو شاعر بھی تھے۔ بچپن میں انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں کافیہ اور شرح جامی تک کتابیں پڑھی تھیں، اس کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا، پھر تجارت وغیرہ میں لگ گئے۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ بھائی جان! آپ نے تعلیم مکمل کیوں نہیں کی تھی، درمیان میں کیوں چھوڑ دیا تھا؟ جواب میں فرمایا کہ بڑے میاں نے ہمارا معاملہ ختم کر دیا تھا۔ ''بڑے میاں'' سے مراد حضرت میاں سیّد اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے، اور صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے۔ میں نے پھر سوال کیا کہ قصہ کیا ہوا تھا؟ فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ میں گھر سے دارالعلوم دیوبند پڑھنے کے لئے جا رہا تھا، راستے میں حضرت میاں صاحب کا مکان تھا، اور حضرت میاں صاحب گھر میں تشریف فرما تھے۔ ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت کا یہ اثر تھا کہ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ میاں صاحب کے گھر کے پاس سے گزریں اور میاں صاحب سے سلام کر کے اور دعا کرا کے نہ جائیں۔ میں نے سوچا کہ حضرت میاں صاحب موجود ہیں، چلو ان کو سلام کر کے دعا کرالوں پھر مدرسہ جاؤں۔ میاں صاحب اپنے پاس بادام وغیرہ بھی رکھا کرتے تھے، جب کوئی بچہ ان کے پاس ملاقات کے لئے آتا تو اس کو بادام وغیرہ بھی دیا کرتے تھے۔

''علم'' تعلّی کا سبب

بہر حال! میں ان کے پاس گیا اور جا کر سلام کیا۔ حضرت میاں صاحب نے جواب دیا۔ پھر میں نے دعا کی درخواست کی ''حضرت! میرے لئے دعا فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے علم عطا فرما دے'' بڑے میاں نے جواب دیا: نا بھائی نا، علم بڑی خراب چیز ہے، میں تمہارے واسطے دعا نہیں کرتا۔ میں بڑا پریشان ہوا کہ یا اللہ! یہ فرما رہے ہیں کہ علم بڑی خراب چیز ہے۔ پھر اپنے بارے میں فرمانے لگے کہ میاں صاحب پہلے دارالعلوم میں مولسری کے درخت کے نیچے پھٹی پرانی چٹائی پر بیٹھا کرتا تھا، اور اب چوکی پر بیٹھ کر پڑھاتا ہے، اور اب میاں صاحب سے کہو کہ نیچے بیٹھ کر پڑھا دو تو میاں صاحب کے مزاج میں فرق آجاتا ہے۔ میاں! علم تو تکبر پیدا کرتا ہے، اس واسطے میں تمہارے واسطے علم کی دعا نہیں کرتا۔ بھائی جان کہتے ہیں کہ مجھے اسی دن خطرہ ہوگیا تھا کہ بڑے میاں نے ہمارا تو پتہ صاف کر دیا، اب یہ علم پورا ہونے والا نہیں۔ بہر حال! وہ تو صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان پر منکشف فرمایا ہوگا کہ اس علم کی تکمیل انکے حق میں مقدر نہیں ہے، اسلئے مناسب طریقے سے بچے کو بتا دیا

لیکن بات جو ارشاد فرمائی وہ یہ تھی کہ علم تکبر پیدا کرتا ہے، لہٰذا اگر علم کی وجہ سے تکبر پیدا ہو گیا، تو پھر اس علم سے ہزار درجہ بہتر یہ تھا کہ آدمی جاہل رہتا، اور ایک ان پڑھ دیہاتی کی طرح زندگی گزارتا تو کم از کم اللہ تعالیٰ کے یہاں جا کر علم کے اس تکبر اور بڑائی کا عذاب نہ ہوتا۔ اس لئے علم کے ساتھ اکثر و بیشتر یہ چیز جمع ہو جاتی ہے اور اس کا حل اس کے علاوہ کوئی اور نہیں کہ اپنی لگام کسی کے حوالے کرے، وہ یہ دیکھے کہ کیا بیماریاں اس کے اندر پیدا ہو رہی ہیں، اور جو بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں، ان کا علاج کرے۔

علم دو دھاری تلوار ہے

ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ علم دو دھاری تلوار ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس علم میں نور عطا فرمادے، اس میں برکت عطا فرمادے اور اس کو نافع بنادے تو پھر سبحان اللہ، یہ علم کیا عجیب و غریب چیز ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ اس علم میں نور اور برکت نہ ہو، اس میں نافعیت نہ ہو، اور یہ انسان کو کبر اور گھمنڈ میں مبتلا کردے تو پھر اس علم سے زیادہ مہلک چیز بھی کوئی نہیں ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جتنی مرغن اور شاندار اور مزیدار غذا ہوتی ہے، سڑنے کے بعد وہ اتنی ہی زیادہ بدبودار بن جاتی ہے۔ اگر معمولی غذا ہے، جس میں روغن نہیں ہے، اس کے سڑنے سے تھوڑی بہت بدبو پیدا ہوگی، لیکن مرغن غذا سڑنے کے بعد سارے محلے کو متعفن کردے گی۔ اسی طرح جتنے اونچے سے انسان گرتا ہے، اتنی ہی چوٹ زیادہ لگتی ہے، اسی طرح یہ علم اگرچہ اعلیٰ درجے کی چیز ہے، لیکن اگر یہ خراب ہو جائے اور انسان کو تکبر اور گھمنڈ میں مبتلا کردے تو یہ علم انسان کے لئے اتنا ہی مہلک ہے، اس لئے خاص طور پر عالم کو اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ وہ کسی سے اپنی اصلاح کرائے۔

شیطان کا واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ سے سنا کہ کسی شخص نے خواب میں شیطان کو دیکھا کہ وہ بہت ساری گٹھڑیاں اپنی کمر پر اٹھائے لے جا رہا ہے۔ جیسے بنجارہ ایک شہر سے دوسرے شہر سامان اٹھا کر لے جاتا ہے اور بیچتا ہے، اسی طرح وہ بھی سامان لے جا رہا ہے۔ اب گٹھڑیوں کو دیکھا تو کسی گٹھڑی میں پاخانہ بھرا ہوا ہے، کسی میں لید، کسی میں گوبر، اور کسی میں پیشاب بھرا ہوا ہے۔ اس نے شیطان سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے؟ شیطان نے ایک گٹھڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ تکبر ہے، دوسری گٹھڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ حبِ جاہ ہے، کسی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ حسد ہے،

وغیرہ، لیکن یہ سب چیز نجاستوں کی شکل میں تھیں۔ ان صاحب نے پھر شیطان سے پوچھا کہ ان کو کہاں لے جارہا ہے؟ شیطان نے جواب دیا کہ ان کو لے جاکر فروخت کروں گا۔ ان صاحب نے پھر پوچھا کہ پیسے دے کر تجھ سے یہ نجاستیں کون خریدے گا؟ شیطان نے جواب دیا کہ اپنے مال کی منڈی میں جانتا ہوں، اور اس کے گاہک اور خریداروں کو میں جانتا ہوں۔ یہ ''تکبر'' اور ''حب جاہ'' یہ دو نجاستیں میں مولویوں کے پاس جاکر بیچوں گا، وہ ان دونوں کے بڑے شوقین ہیں، ان کو ان دونوں کے کھانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ حبِ جاہ کا کیا مطلب ہے؟ ''حبِ جاہ'' کے معنی ہیں ''شہرت'' کہ لوگ میرے آگے جھکیں، لوگ میرے معتقد بنیں، لوگ میری تعریف کریں، میری شہرت ہو، یہ سب ''حبِ جاہ'' ہے۔ ''حبِ جاہ'' کو بیچنے کی سب سے بہترین منڈی ''مولوی صاحبان'' ہیں، وہاں جاکر اس کو بیچوں گا، وہ خوب مزے لے کر اس کو کھائیں گے۔

''ہم بھی کچھ ہیں'' کا خیال

بہرحال! یہ علم ایک تو بذاتِ خود فی نفسہ طالبِ علو ہے، اس لئے صاحبِ علم کے اندر تکبر پیدا کرتا ہے۔ دوسری آفت اس علم میں یہ ہے کہ لوگ حاملِ علمِ دین کی عزت کرتے ہیں، کوئی اس کے ہاتھ چوم رہا ہے، کوئی اس کے پاؤں چوم رہا ہے، کوئی اس کے لئے عزت سے کھڑا ہو رہا ہے، کوئی اس کے لئے ہدیہ لا رہا ہے، کوئی دعوت کر رہا ہے، ان افعال کے نتیجے میں وہ حاملِ علم اپنے بارے میں یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ہم بھی کچھ ہیں، یہ اتنی ساری مخلوق جو ہماری عزت کر رہی ہے، ہمارے پیچھے پھر رہی ہے، آخر کچھ تو ہمارے اندر کمال ہوگا۔

ایک لالچی کا واقعہ

چنانچہ اہلِ علم کی ایک مثال دیتے ہوئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ''اشعب طمّاع'' ایک بہت لالچی انسان تھا۔ ایک مرتبہ راستے سے گزر رہا تھا، بچے اس کو چھیڑنے کے لئے اس کے پیچھے لگ گئے، ان بچوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے اس نے بچوں سے کہا کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو، فلاں جگہ جاؤ، وہاں مٹھائی تقسیم ہو رہی ہے، چنانچہ بچے اس طرف بھاگے تو خود بھی بچوں کے پیچھے بھاگنے لگا۔ لوگوں نے پوچھا کہ تم کیوں بھاگ رہے ہو؟ اس نے کہا کہ سب بچے بھاگ رہے ہیں تو ضرور مٹھائی تقسیم ہو رہی ہوگی۔ ہماری مثال بھی ایسی ہے کہ پہلے اپنے علم کے ذریعہ مخلوق کو دھوکہ دیا، اس دھوکہ دینے کے نتیجے میں جب مخلوق ہماری معتقد ہوگئی، اب کوئی ہاتھ چوم رہا ہے، کوئی دعوت کر رہا ہے، کوئی ہدیہ لا رہا ہے، کوئی علامہ کا لقب دے رہا ہے، تو اب دماغ میں یہ خیال آیا کہ جب اتنی ساری

مخلوق ہمارے پیچھے چل رہی ہے اور ہماری معتقد ہو رہی ہے تو ہمارے اندر ضرور کوئی وصف ہوگا جس کی وجہ سے یہ ساری مخلوق ہماری معتقد ہو رہی ہے ع

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

اس کے نتیجے میں وہ عالم اور زیادہ تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

علم پر شکر ادا کریں

لہٰذا جو حضرات علمِ دین سے وابستہ ہیں، یا جن کو اللہ تعالیٰ نے کوئی اور وصف عطا فرمایا ہے، ان کو اس کی بہت زیادہ فکر رکھنے کی ضرورت ہے کہ کہیں یہ بیماری پیدا نہ ہو جائے۔ اور اگر پیدا ہو جائے تو اس کا فوری علاج ضروری ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ اس علم پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کریں کہ یا اللہ! میں اس علم کا مستحق نہیں تھا، پھر بھی آپ نے عطا فرمادیا، اے اللہ! آپ کا شکر ہے۔ اور اس بات کا استحضار کرے کہ یہ علم ان کی عطا ہے، اور وہ جب چاہیں واپس لے لیں، میرا اس پر کوئی کنٹرول نہیں ــــ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا﴾(۱)

سب کچھ پہلے معلوم تھا، بعد میں سب رخصت ہو گیا، اور اب کچھ بھی باقی نہیں۔ اگر انسان کے دماغ کا ذرا سا اسکرو ڈھیلا ہو جائے، تو ایک سیکنڈ کے اندر سارا علم، ساری معرفت، ساری تحقیقات، سب ختم ہو جائیں، لہٰذا انسان کس بات پر اترائے؟ کس بات پر ناز کرے؟ کس بات پر اکڑے؟

عالم اور شیخ کے درمیان فرق

اسی وجہ سے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو اپنے وقت میں علم کے پہاڑ تھے، لیکن اپنی اصلاح کے لئے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گئے، جو ضابطے کے پورے عالم بھی نہیں تھے۔ لوگوں نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضرت! یہ کیا قصہ ہوا کہ اُلٹا معاملہ ہو گیا؟ ان کو چاہئے تھا کہ وہ آپ کے پاس آتے، اس لئے کہ آپ عالم ہیں، وہ عالم نہیں ہیں، لیکن آپ ان کے پاس چلے گئے۔

---

(۱) النحل: ۷۰

ایک مثال

جواب میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہماری اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کو مٹھائی کے بارے میں پورا علم اور پوری تحقیق حاصل ہے، مثلاً اس کو گلاب جامن کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ یہ سب سے پہلے کس نے ایجاد کی، اس کا موجد کون ہے، کہاں کہاں یہ متعارف ہوئی، کن ملکوں میں یہ کھائی جاتی ہے، کن چیزوں سے اس کو بنایا جاتا ہے، اس کے اجزاء ترکیبی کیا کیا ہیں، اور اس کی کتنی قسمیں ہیں، اور اس کو کیسے پکایا جاتا ہے، اور کیسے تلا جاتا ہے، اور اگر اس سے کہا جائے تو وہ گلاب جامن کے فضائل پر ایک تقریر کردے اور ایک مقالہ لکھ دے لیکن اس سے پوچھا جائے کہ تم نے کبھی گلاب جامن کھائی ہے؟ تو وہ جواب میں کہے میں نے کبھی نہیں کھائی۔ ایک دوسرا شخص ہے جس کو گلاب جامن کی تاریخ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ کس نے ایجاد کی، کون اس کا موجد ہے، کس طرح پکائی جاتی ہے، لیکن روزانہ صبح و شام گلاب جامن کھاتا ہے۔ پھر فرمایا کہ بتاؤ ان دونوں میں سے کون بہتر ہے؟ وہ بہتر ہے جس میں گلاب جامن پر مقالہ لکھنے کی صلاحیت ہے یا وہ بہتر ہے جو روزانہ صبح و شام گلاب جامن کھاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ بہتر ہے جو روزانہ صبح و شام کھاتا ہے، اگرچہ اس کی تعریف بیان نہیں کرسکتا۔

پھر فرمایا کہ ہماری مثال اس شخص کی سی ہے جس کو گلاب جامن کی پوری تاریخ معلوم ہے، اس کی لغوی اور اصطلاحی تعریف جانتا ہے، لیکن کھائی کبھی نہیں، اور حاجی صاحب وہ ہیں جو روزانہ کھاتے ہیں۔ جب ہم حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں گئے تو ہم نے صرف گلاب جامن کی تاریخ ہی پڑھی تھی، انہوں نے گلاب جامن اُٹھا کر ہمارے منہ میں رکھ دی کہ لو گلاب جامن کھالو۔ اس لئے ہم حاجی صاحب کی خدمت میں گئے تھے۔ بہرحال! علم والے کو خاص طور پر اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ باطن کی اصلاح کرائے اور کسی شیخ سے تربیت حاصل کرے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

کبر کا ایک علاج

فرمایا کہ ''کبر کا ایک علاج یہ ہے کہ عظمتِ حق سبحانہ کو پیشِ نظر رکھے، جس موقع پر کبر کا اندیشہ ہو اس وقت تو ضرور ورنہ اور بھی بہتر یہ ہے کہ روزانہ ایک وقت اس کے لئے نکال لے''

کبر کا ایک علاج یہ ہے کہ انسان اللہ جل جلالہ کی عظمت کا استحضار کرے، اور اس کے ساتھ

اپنی بے وقعتی کا استحضار کرے۔ اس کے علاوہ ایک بزرگ کے جواب کا استحضار کرے جو جواب ان بزرگ نے ایک متکبر کو دیا تھا۔ ایک متکبر نے ان بزرگ سے کہا کہ جانتے نہیں ہم کون ہیں؟ ان بزرگ نے فرمایا کہ میں جانتا ہو تو کون ہے؟ تیری حقیقت یہ ہے کہ

"أَوَّلُكَ نُطْفَةٌ مَذِرَةٌ، وَآخِرُكَ جِيْفَةٌ قَذِرَةٌ وَ أَنْتَ فِيْمَا بَيْنَ ذٰلِكَ تَحْمِلُ الْعَذِرَةَ"

یعنی تیری ابتداء تو ایک گندہ نطفہ ہے، اور تیری انتہاء بدبودار مردار پر ہونے والی ہے، تو ایسی حالت میں پہنچنے والا ہے کہ تیرے عزیز و اقارب اور رشتہ دار بھی تجھے اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں ہوں گے، بلکہ تجھے گڑھے میں پھینک آئیں گے، اس لئے کہ اگر تجھے اور زیادہ گھر میں رکھا گیا تو گھر میں بدبو پھیلا دے گا۔ لہٰذا تیری ابتداء اور انتہاء تو یہ ہے، اور دونوں کے درمیان کا جو زمانہ ہے، اس میں تو ہر وقت نجاست اُٹھا کر پھر رہا ہے۔

کھال کے ذریعہ پردہ پوشی

اللہ تعالیٰ نے اس کھال کے ذریعہ پردہ پوشی فرما رکھی ہے، یہ کھال اگر کسی جگہ سے چھیل دی جائے تو اندر سے گندگی برآمد ہو جائے گی، کہیں سے خون نکل آئے گا، کہیں سے پیپ نکل آئے گی، کہیں سے پیشاب نکل آئے گا، کہیں سے پاخانہ نکل آئے گا۔ پورے جسم میں گندگی ہی گندگی بھری ہوئی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کھال کے ذریعہ پردہ پوشی فرما رکھی ہے جس کی وجہ سے وہ نجاست نظر نہیں آتی۔ حضرت والا فرماتے ہیں: جب کبھی تمہارے دل میں اپنی بڑائی کا احساس پیدا ہو تو ذرا اس بات کو سوچ لیا کرو کہ میری ابتداء کہاں سے ہوئی اور میرا انجام کیا ہونا ہے۔

قضاء حاجت کی حالت کا تصور

حضرت فرماتے ہیں: ایک کارآمد نسخہ اور بتاتا ہوں۔ وہ یہ کہ جب دل میں تکبر پیدا ہو، اس وقت اپنی اس حالت کا تصور کر لیا کرو جب قضاء حاجت کے لئے بیٹھتے ہو، اس وقت کیا حالت ہوتی ہے اور کیا شان ہوتی ہے۔ بس سارا تکبر دھرا رہ جائے گا اور پتہ چل جائے گا کہ میری حقیقت تو یہ ہے۔

بہرحال اللہ جل جلالہ کی عظمت کا استحضار اور اپنی بے وقعتی کا استحضار کرے۔ کس بات پر انسان ناز کرے؟ کس چیز پر فخر کرے؟ نہ کوئی چیز اپنی ہے، نہ اپنی طاقت سے حاصل ہوئی، نہ اپنے بل بوتے پر باقی رہ سکتی ہے، جو کچھ حاصل ہے، وہ سب کسی کی عطا ہے۔

ایک اور علاج

فرمایا کہ ''علاج ہی کا ایک جزو یہ ہے کہ قصداً ایسے افعال اختیار کرے جو عرفاً موجبِ ذلت سمجھے جاتے ہیں۔ اور بدون اس کے دوسرے علاج ناکافی ہیں''

یعنی قصداً ایسا کام اختیار کرے جس کو عام طور پر لوگ ذلت کا کام سمجھتے ہیں، بطور علاج کے وہ کام کرے۔ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیا کرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا علاج کرنا

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک شاندار جبہ پہن کر خطبہ دیا۔ وہ جبہ بہت پسند آیا اور اپنا سراپا اچھا معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ جبہ اُتارا اور مشک اُٹھا کر کمر پر لادی، اور پانی بھر کر لوگوں کے گھروں میں پہنچانا شروع کر دیا۔ کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ فرمانے لگے کہ چونکہ میرے دل میں عُجب کا خیال آ گیا تھا، اس لئے اس کے ذریعہ میں اس عُجب کا علاج کر رہا ہوں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور گورنری

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ درس و تدریس کے کام میں لگے رہتے تھے، ان کو سیاست سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ایک مرتبہ بحرین کے گورنر چھٹی پر جا رہے تھے، ان کی جگہ پر ان کو گورنر بنا دیا گیا۔ چونکہ درویش آدمی تھے، ساری عمر قال اللہ و قال الرسول میں گزاری تھی۔ سارا دن گورنری کے کام میں مشغول رہتے، شام کو لکڑیوں کا ایک گٹھڑ سر پر رکھتے اور بازار کے درمیان سے اس طرح گزرتے کہ آواز لگاتے جاتے کہ ہٹو! امیر المؤمنین آ رہے ہیں، ہٹو! امیر المؤمنین آ رہے ہیں۔ گویا کہ راستے میں لوگوں کو متنبہ بھی کرتے جاتے کہ یہ امیر المؤمنین آ رہا ہے جس کے سر پر لکڑی کا گٹھڑ ہے۔ یہ کام اس لئے کرتے کہ کہیں گورنری کی شان کی وجہ سے دماغ میں تکبر پیدا نہ ہو جائے، اس طرح سے اپنا علاج خود کیا۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا طلبہ کے جوتے اُٹھانا

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، جو ''قطب الارشاد امام وقت اور ابو حنیفہ عصر'' کے لقب سے مشہور ہیں، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''ارواحِ ثلاثہ'' میں ان کا واقعہ لکھا ہے کہ حضرت والا

ایک دفعہ سبق پڑھا رہے تھے اور بارش شروع ہوگئی اور طلبہ سے فرمایا کہ اندر چلیں۔ طلبہ اپنی اپنی کتابیں لے کر اندر جانے لگے، اور حضرت والا طلبہ کے جوتے سمیٹ کر اندر لے جانے لگے تا کہ وہ بارش میں بھیگ کر خراب نہ ہو جائیں۔

یہ طلبہ کے جوتے دو وجہ سے اُٹھا رہے تھے: ایک اپنے علاج کی غرض سے کہ کہیں میرے اندر تکبر کا شائبہ پیدا نہ ہو جائے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جب انسان یہ علاج کر لیتا ہے تو اس کا نفس مزکی اور مجلی ہو جاتا ہے اور جب اللہ والے کا نفس مزکی اور مجلی ہو جاتا ہے تو اس کو یہ بات غیر معمولی معلوم نہیں ہوتی کہ میں طلبہ اور شاگردوں کے جوتے اُٹھا رہا ہوں بلکہ یہ کام بھی اس کے معمول کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو نصیحت

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حضرت سیّد سلیمان ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے گئے۔ پورے ہندوستان میں جن کے علم کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ''سیرۃ النبی'' کے مصنف، محققِ وقت، اور سیاسی اعتبار سے بھی لوگوں کے اندر مشہور و معروف۔ حضرت سیّد صاحب خود بیان فرماتے ہیں کہ میں جب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سے رخصت ہونے لگا تو میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت! کوئی نصیحت فرما دیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! یہ اتنے بڑے عالم ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں نصیحت کروں۔ یا اللہ! ایسی نصیحت دل میں ڈال دیجئے جو ان کے حق میں فائدہ مند ہو۔ تو اس وقت بیساختہ میرے دل میں یہ بات آئی کہ ہمارے یہاں اوّل و آخر ایک ہی چیز ہے، وہ یہ کہ اپنے آپ کو مٹا دینا۔ حضرت سیّد صاحب فرماتے ہیں کہ یہ بات کہتے ہوئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا، وہ جھٹکا میرے دل پر ایسا لگا کہ اسی وقت گریہ طاری ہو گیا۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس کے بعد حضرت سیّد صاحب نے اپنے آپ کو ایسا مٹایا، ایسا مٹایا کہ میں نے ایسی بہت کم نظیریں دیکھی ہیں کہ اتنے بڑے عالم نے اپنے آپ کو ایسا مٹایا ہو۔ اس طرح مٹایا کہ میں نے ایک دن حضرت سیّد صاحب کو دیکھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس کے باہر حاضرینِ مجلس کی جوتیاں سیدھی کر رہے ہیں۔

علوم تو ان بڑے میاں کے پاس ہیں

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سہ دری میں بیٹھ کر تصنیف کا کام کر رہے تھے، اور حضرت سیّد صاحب دور ایسی جگہ پر کھڑے ہو کر

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے جہاں سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ان کو نہ دیکھ سکیں۔ میں اچانک پیچھے سے ان کے قریب پہنچا اور کہا کہ حضرت! یہاں کیا کر رہے ہیں؟ کیا دیکھ رہے ہیں؟ میرے سوال پر اچانک چونک پڑے اور کہا کہ کچھ نہیں۔ میں نے جب اصرار کیا تو فرمایا کہ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ ساری زندگی جن چیزوں کو علوم سمجھتے رہے، وہ تو جہل ثابت ہوئے، علوم تو ان بڑے میاں کے پاس ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت سید صاحب کو وہ مقام بخشا کہ خود ان کے شیخ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بارے میں یہ شعر کہا۔

از سلیمان گیر اخلاصِ عمل
داں تو ندوی را منزہ از دغل

یہ شعر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سیّد صاحب کے بارے میں کہا۔ بہر حال، اپنے آپ کو مٹانا پڑتا ہے، تب جا کر کچھ بنتا ہے۔

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

کسی کے در پر رگڑے کھائے بغیر یہ چیز حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ شیخ کی نگرانی میں یہ عمل کرے۔

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مطب ابتداء میں رابسن روڈ پر تھا۔ اسی زمانہ میں میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا اسی مطلب کے کچھ فاصلے پر مکان تھا۔ حضرت ڈاکٹر صاحب خود بیان فرماتے ہیں کہ ایک دن میں مطب میں بیٹھا ہوا تھا اور میرے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب کے پاس ظاہری بیماریوں کے مریض بھی آتے تھے اور باطنی بیماریوں کے مریض بھی آیا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہاتھ میں دودھ کی پتیلی لیے ہوئے سڑک پر سامنے سے گزر رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یا اللہ! یہ مفتی اعظم اس طرح سڑک پر پتیلی ہاتھ میں لیے جا رہا ہے۔ جو لوگ مطلب میں بیٹھے ہوئے تھے، ان سے میں نے پوچھا کہ یہ شخص جو پتیلی ہاتھ میں لیے جا رہا ہے، جانتے ہو یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ ہم نہیں جانتے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ پاکستان کے مفتی اعظم ہیں، اور ہاتھ میں پتیلی لیے ہوئے اس طرح جا رہے ہیں جس طرح ایک عام آدمی جاتا ہے۔

کبھی بڑائی کا تصور ہی نہیں آیا

اللہ تعالیٰ نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تواضع کا وہ مقام عطا فرمایا تھا کہ سچی بات یہ ہے کہ میں نے ایسا متواضع آدمی کوئی نہیں دیکھا۔ ایک تو آدمی بتکلف تواضع کرتا ہے، لیکن ان کے یہاں تواضع کیلئے کوئی تکلف نہیں تھا، کیونکہ ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ میں تو بالکل بے حقیقت ہوں، اور اپنے بارے میں دماغ کے اندر کبھی بڑائی کا تصور کبھی آیا ہی نہیں، اسی وجہ سے ان کو معمولی سے معمولی کام کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ آپ کرتے کے دامن میں بازار سے آلو خرید کر لے آتے تھے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نصیحت

دیوبند میں بھی ایک دن اسی طرح دودھ لینے کے لئے پتیلی لے کر جا رہے تھے، حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو دیکھ لیا۔ اگلے دن جب آپ دارالعلوم دیوبند میں پہنچے تو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مفتی صاحب سے فرمایا کہ دیکھو بھائی مولوی شفیع صاحب! اللہ تعالیٰ نے آپ کو تواضع کا بہت اونچا مقام عطا فرمایا ہے، لیکن اتنی تواضع بھی نہ کیا کرو، اس لئے کہ اب آپ دارالعلوم کے مفتی ہوگئے ہیں، اور اس طرح کے کام کرنے سے بعض اوقات عوام کی نگاہوں میں وقعت کم ہو جاتی ہے، اس لئے اتنی بھی تواضع نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ سمجھتے تھے کہ میں تو کچھ ہوں ہی نہیں، اس لئے میں کیا اہتمام کروں کہ فلاں کام کروں اور فلاں کام نہ کروں۔ اللہ تعالیٰ نے تواضع کا یہ مقام عطا فرمایا تھا۔

کبھی ننگے پاؤں بھی چلا کرو

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کبھی کبھی ننگے پاؤں بھی چلا کرو، اور کبھی کبھی دوسروں کے جوتے سیدھے کر دیا کرو۔

"ارواحِ ثلاثہ" میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ جب کسی طالب علم کو دیکھتے کہ اس کے اندر تکبر ہے، اور اس کے تکبر کا علاج کرنا ہے تو اس کو مامور کرتے تھے کہ تم درسگاہ کے باہر طلبہ کے جوتے روزانہ سیدھے کیا کرو۔ اور جب کسی طالب علم کو دیکھتے کہ اس کے اندر کوئی خرابی نہیں ہے تو اس کے جوتے خود سیدھے فرما دیا کرتے تھے۔

شیخ کے بتانے پر ذلت کے کام کرے

یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس راستے میں بعض اوقات ذلت کے کام کرنے پڑتے ہیں، وہ ذلت کے کام بھی اپنی خودرائی سے نہ کرے، خودرائی سے کرنے سے بعض اوقات تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور دماغ اور سڑ جاتا ہے بلکہ شیخ کی نگرانی میں کرے۔ جب شیخ کہے تو وہ کام کرے اور جب شیخ نہ کہے تو وہ کام نہ کرے۔

ایک صاحب نے کسی کتاب میں پڑھ لیا تھا کہ دوسروں کے جوتے سیدھے کرنے سے تکبر دور ہوتا ہے، چنانچہ وہ صاحب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں آئے اور دوسروں کے جوتے سیدھے کرنے شروع کر دیئے۔ حضرت والد صاحب نے ان کو منع کیا کہ یہ کام نہ کرو۔ پھر منع کرنے کی وجہ بتائی کہ اس شخص کے حالات ایسے ہیں کہ اگر یہ جوتے سیدھے کرے گا تو اور زیادہ اس کے دماغ میں تکبر پیدا ہوگا کہ میرے اندر اتنی تواضع پیدا ہوگئی ہے کہ میں لوگوں کے جوتے سیدھے کرتا ہوں۔ اس لئے حضرت فرماتے ہیں کہ اس راستے میں کسی کی نگرانی میں چلنا پڑتا ہے۔

کبر اور شکر کا فرق

فرمایا:

"نعمت پر فخر کرنا "کبر" ہے اور اس کو عطا حق سمجھنا اور اپنی نااہلی کو متحضر رکھنا "شکر" ہے"

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ "تکبر" کی بیماری کا بہترین علاج کثرتِ شکر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی عادت ڈالنا۔ وہی بات حضرت نے اس ملفوظ میں ارشاد فرمائی کہ کسی نعمت کے حصول پر فخر کرنا کہ اس کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسروں کو کمتر سمجھنا، تکبر ہے، لیکن یہ سمجھنا کہ میں تو اس نعمت کا مستحق نہیں تھا، اللہ جل شانہ نے محض اپنے فضل سے یہ نعمت عطا فرمادی ہے۔ یہ استحضار "شکر" ہے اور یہی شکر کبر کا علاج ہے۔

یہ "تحدیثِ نعمت" ہے

اسی کو "تحدیثِ نعمت" کہا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا ذکر کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے، نہ صرف یہ کہ یہ چیز تکبر نہیں بلکہ عبادت ہے۔ اور اپنی بڑائی کا ذکر کر کے اپنا کوئی وصف بیان کرنا تکبر ہے اور زبردست گناہ ہے۔

باطن کے یہ گناہ بہت باریک ہیں، اور ان کی سرحدیں آپس میں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ ایک طرف ''تحدیثِ نعمت'' ہے، اگر تحدیثِ نعمت کی غرض سے انسان اپنا کوئی وصف بیان کر رہا ہے، یا اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کا اور اس کی عطا کا اظہار کر رہا ہے تو یہ ''عبادت'' ہے، اور اگر اپنی بڑائی کے خیال سے اس کا اظہار کر رہا ہے تو یہ گناہِ کبیرہ ہے۔ لیکن دونوں کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنا کہ کیا بات تکبر ہے اور کیا بات ''تحدیثِ نعمت'' ہے، یہ ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔

''تحدیثِ نعمت'' کا حکم

''تحدیثِ نعمت'' تو وہ چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ جناب رسول اللہ ﷺ کو اس کا حکم دے رہے ہیں، فرماتے ہیں:

﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾(۱)

یعنی آپ پر آپ کے رب کی جو نعمتیں ہوئی ہیں، ان کو لوگوں کے سامنے بیان کیا کریں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی ہے۔ اسی ''تحدیثِ نعمت'' کے طور پر آپ ﷺ نے بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں۔ ایک موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا:

((أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخَرَ))

''میں آدم کے تمام بیٹوں کا سردار ہوں''(۲)

یہ ''تحدیثِ نعمت'' کے طور پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ مقام عطا فرمایا کہ مجھے تمام آدم کے بیٹوں کا سردار بنا دیا۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ''تحدیثِ نعمت'' کبر کی حد میں داخل ہو جائے۔ اس لئے فوراً اگلا جملہ ارشاد فرما دیا ''وَلَا فَخَرَ'' یعنی میں اس پر کسی فخر کا اظہار نہیں کرتا، جس سے دوسروں کی تحقیر ہو۔ اب دیکھئے کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنے اُوپر ہونے والی نعمتوں کا ذکر فرما رہے ہیں، لیکن دھڑکا یہ لگا ہوا ہے کہ کہیں حدود سے متجاوز نہ ہو جاؤں، اس لئے فوراً فرمایا ''وَلَا فَخَرَ'' میں فخر نہیں کرتا۔

---

(۱) الضحی: ۱۱، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جو تمہارے پروردگار کی نعمت ہے، اس کا تذکرہ کرتے رہنا''

(۲) صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب تفضيل نبينا على الخلائق، رقم: ٤٢٢٣، سنن الترمذي، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، باب ومن سورة بني إسرائيل، رقم: ٣٠٧٣، سنن أبي داؤد، كتاب السنة، باب في التخيير بين الأنبياء، رقم: ٤٠٥٣، سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر الشفاعة، رقم: ٤٢٩٨، مسند أحمد، رقم: ٢٤١٥

تحدیثِ نعمت کی علامت

پھر ''تحدیثِ نعمت'' کی ایک علامت ہے، وہ یہ کہ ''تحدیثِ نعمت'' کے نتیجے میں سر اور زیادہ جھکتا ہے، اور تواضع پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے حضور مزید عاجزی اور انکساری پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ یا اللہ! میں اس نعمت کا مستحق نہیں تھا، اور میں اس نعمت کو حاصل کرنے سے عاجز تھا، لیکن آپ نے محض اپنے فضل سے یہ نعمت عطا فرمادی۔ اس استحضار اور اقرار کے نتیجے میں اور زیادہ عاجزی پیدا ہوگی۔

فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ کی انکساری

فتح مکہ کے موقع پر جناب رسول اللہ ﷺ فاتح بن کر مکہ مکرمہ میں داخل ہو رہے ہیں، اور اس شہر میں فاتح بن کر داخل ہو رہے ہیں جس شہر کے لوگوں نے آپ کو ہجرت کرنے پر مجبور کیا، جس شہر کے لوگوں نے آپ کو قتل کرنے کے منصوبے بنائے، جس شہر کے لوگوں نے آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے، جس شہر کے لوگوں نے آپ کے اوپر غلاظتیں ڈالنے کی کوشش کی، جہاں کے لوگوں نے آپ پر پتھر برسانے کی کوشش کی۔ اس شہر کے لوگوں پر فاتح بن کر تشریف لا رہے ہیں، صرف آٹھ سال کی مدت کے بعد تشریف لا رہے ہیں۔ آپ کے علاوہ کوئی اور اس شہر میں فاتح بن کر داخل ہوتا تو اس کا سینہ تنا ہوا ہوتا، گردن اکڑی ہوئی ہوتی، ''أنا ولا غیری'' کے نعرے لگا رہا ہوتا۔ لیکن آپ مکہ مکرمہ میں اس شان سے داخل ہوئے کہ آپ کی گردن مبارک جھکی ہوئی ہے، یہاں تک کہ سینہ مبارک سے آپ کی ٹھوڑی لگ رہی ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، اور زبانِ مبارک پر قرآن کریم کی یہ آیات ہیں:

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۙ لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا﴾(۱)

یہ ہے ''تحدیثِ نعمت'' کیونکہ "إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا" کی آیات تلاوت کر کے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا ذکر فرما رہے ہیں کہ یا اللہ! آپ نے یہ فتح مجھے عطا فرمائی۔ اور اس نعمت کے استحضار کے نتیجے میں عاجزی اور انکساری پیدا ہو رہی ہے، اور شکستگی پیدا ہو رہی ہے، اور رجوع الی اللہ زیادہ ہو رہا ہے۔ یہ ''تحدیثِ نعمت'' کی علامت ہے۔

---

(۱) الفتح: ۱-۲، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''(اے پیغمبر!) یقین جانو، ہم نے تمہیں کھلی ہوئی فتح عطا کر دی ہے، تاکہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی تمام کوتاہیوں کو معاف کر دے، اور تاکہ اپنی نعمت تم پر مکمل کر دے، اور تمہیں سیدھے راستے پر لے چلے''

تکبر کی علامت

اور تعلّی اور تکبر کی علامت یہ ہے کہ اس سے گردن اکڑتی ہے، سینہ تنتا ہے، اور انسان اپنے آپ کو دوسروں سے بالا سمجھتا ہے، اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے، اور ان کے ساتھ حقارت کا معاملہ کرتا ہے۔ ورنہ کم از کم یہ تو ہوتا ہی ہے کہ وہ دل سے اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا اور افضل سمجھتا ہے۔ اب دونوں کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنا کہ کہاں ''تحدیثِ نعمت'' ہے، اور کہاں ''تکبر'' شروع ہو گیا، یہ حد قائم کرنا آسان کام نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شیخ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ شیخ یہ بتاتا ہے کہ تم جو نعمت کا اظہار کر رہے ہو، یہ ''تحدیثِ نعمت'' نہیں ہے بلکہ یہ تکبر ہے، لیکن اس کا نام تم نے ''تحدیثِ نعمت'' رکھ دیا، حالانکہ حقیقت میں وہ تکبر اور شیطانی عمل تھا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے نفس کی نگرانی کی توفیق عطا فرماتے ہیں، وہ قدم قدم پر اپنے نفس کا جائزہ لیتے رہتے ہیں کہ کہیں یہ نفس صحیح راستے سے نہ ہٹ جائے۔ میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ سنا کہ ایک مرتبہ حضرت تھانوی ایک مسجد میں وعظ فرما رہے تھے، بڑا مجمع وعظ سن رہا تھا، اور شرح صدر کے ساتھ وعظ ہو رہا تھا، علوم و معارف کے دریا بہہ رہے تھے۔ اسی وعظ کے دوران کوئی بات حضرت والا کے ذہن میں آئی۔ آپ نے فرمایا کہ اب میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں، اور میں ''تحدیثِ نعمت'' کے طور پر کہتا ہوں کہ یہ بات آپ مجھ ہی سے سنیں گے، کسی اور سے یہ بات آپ کو سننے میں نہیں آئے گی۔

ابھی وہ بات کہی نہیں تھی، بلکہ اسی وقت سر جھکایا اور فرمایا: استغفر اللہ، میں نے یہ کیا کہہ دیا، میں نے اس کو تحدیثِ نعمت کا نام دے دیا، حالانکہ یہ تو تعلّی ہو گئی اور اپنی بڑائی کا بیان ہو گیا کہ یہ بات آپ مجھ ہی سے سنئے گا اور کسی سے نہیں سنئے گا، میں استغفار کرتا ہوں، یا اللہ! مجھے معاف فرما ــــ یہ عمل وہی شخص کر سکتا ہے جس کے دل میں میٹر لگا ہوا ہے، اور وہ میٹر یہ تول رہا ہے کہ کونسا کلمہ حد سے متجاوز ہو گیا اور کونسا حد کے اندر ہے۔ لہٰذا اتنے بڑے انسان، بزرگ، محقق یہ فرما رہے ہیں کہ میں نے تحدیثِ نعمت کا لفظ تو استعمال کیا، لیکن حقیقت میں تو یہ تعلّی اور تکبر ہو گیا، تو ہم اور آپ کس شمار و قطار میں ہیں۔ ہم لوگ نہ جانے کتنی مرتبہ ''تحدیثِ نعمت'' کے عنوان سے اپنے اوصاف بیان کرتے ہیں جبکہ حقیقت میں وہ تعلّی اور تکبر میں داخل ہوتا ہے۔

نعمتوں میں اضافے سے رجوع الی اللہ میں اضافہ

لہٰذا ''تحدیثِ نعمت'' کی جو علامت ہے، اس کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ اس ''تحدیثِ نعمت'' کے نتیجے میں عاجزی پیدا ہو رہی ہے یا نہیں؟ خشوع پیدا ہو رہا ہے یا نہیں؟ رجوع اِلی اللہ میں اضافہ ہو رہا ہے یا نہیں؟ اگر یہ چیزیں پیدا ہو رہی ہیں تو پھر سمجھ لیجئے کہ یہ ''تحدیثِ نعمت'' ہے۔ اور ایک مؤمن کی علامت ہی یہ ہے کہ اس کو جتنا جتنا نعمتوں سے نوازا جاتا ہے، وہ اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے آگے سجدہ ریز ہوتا چلا جاتا ہے، اپنی بے حقیقتی اس پر عیاں ہوتی چلی جاتی ہے، اپنی عاجزی، اپنی فروما ئیگی، اپنی عبدیت اور اپنی بندگی کا احساس اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے، اور اس کو اپنے بندہ ہونے کا احساس ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ اس کو جس نعمت سے بھی نوازتے ہیں، وہ پکار اُٹھتا ہے کہ یا اللہ! میں تو اس نعمت کے قابل نہیں تھا، آپ نے اپنی رحمت سے عطا فرمادی ہے۔ لہٰذا جتنی نعمت بڑھتی ہے، رجوع الی اللہ میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام اور نعمتوں پر شکر

حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کی اولاد میں حضرت سلیمان رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں عطا فرمائیں۔ مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایسی حکومت عطا فرمائی جو تاریخ انسانیت میں کسی کو بھی ایسی حکومت نہ تو پہلے نصیب ہوئی اور نہ بعد میں نصیب ہوئی۔ وہ یہ کہ انسانوں پر حکومت، جنات پر، چرندوں پر، پرندوں پر، فضاؤں پر اور ہواؤں پر حکومت عطا فرمائی۔ یہ نعمتیں دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا:

﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ۝﴾(۱)

''اے آلِ داؤد! شکر کا عمل اختیار کرو، اور میرے بندوں میں بہت کم لوگ شکر گزار ہیں''

روایت میں آتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ طے کر رکھا تھا کہ چوبیس گھنٹے میں کوئی لمحہ ایسا نہ گزرے جس میں ہمارے گھر میں کوئی شخص بھی اللہ کا ذکر یا شکر نہ کر رہا ہو، چنانچہ آپ نے اوقات کو تمام گھر والوں پر تقسیم کر دیا تھا کہ اس وقت سے لے کر اس وقت تک فلاں ذکر میں لگا رہے گا، اس وقت سے اس وقت تک فلاں صاحب ذکر کریں گے۔ دیکھئے! جس طرح نعمتوں سے نوازا جا رہا ہے تو اسی طرح رجوع الی اللہ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور یہ دعا فرما رہے ہیں:

---

(۱) سبا: ۱۳

﴿رَبِّ أَوْزِعْنِيْ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَأَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ۝﴾(۱)

''اے میرے رب! مجھ کو اس پر ہمیشگی دیجئے کہ میں آپ کی ان نعمتوں پر شکر کیا کروں، جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں، اور میں نیک کام کیا کروں جس سے آپ خوش ہوں، اور مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل رکھئے''

لہٰذا ایک مؤمن کی خاصیت یہ ہے کہ جوں جوں اس کو نعمتوں سے نوازا جائے گا، اس کے اندر عاجزی اور انکساری پیدا ہوگی، تواضع پیدا ہوگی، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع میں اضافہ ہوگا۔

شریر آدمی کی خاصیت

دوسری طرف شریر آدمی کی خاصیت یہ ہے کہ اس کو جتنی زیادہ نعمتیں ملیں گی، اتنا ہی اس کی رعونت میں اضافہ ہوگا، اس کی فرعونیت بڑھے گی۔ متنبّی شاعر بھی کبھی کبھار بڑی حکیمانہ باتیں کہہ دیتا ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے کہ ؎

إِذَا أَنْتَ أَكْرَمْتَ الْكَرِيْمَ مَلَكْتَهُ
وَ إِنْ أَنْتَ أَكْرَمْتَ اللَّئِيْمَ تَمَرَّدَا

''اگر تم ایک شریف آدمی کی عزت کرو گے، اس کے ساتھ اچھا معاملہ کرو گے تو تم اس کے مالک بن جاؤ گے، وہ تمہارا غلام بن جائے گا، اس لئے کہ شریف آدمی تمہارا احسان نہیں بھولے گا، اس کے نتیجے میں وہ تمہارا غلام اور تم اس کے مالک بن جاؤ گے۔ اور اگر تم کمینے آدمی کا اکرام کرو گے، تو چونکہ وہ کمینہ آدمی تھا، وہ اکرام کے قابل نہیں تھا، مگر تم نے اس کی عزت کر کے اس کو سر پر چڑھا دیا، تو اس کے نتیجے میں وہ سرکش بن جائے گا''

یہی معاملہ ہر انسان کا ہے کہ اگر کسی انسان کو نعمتیں ملتی جائیں اور اس کے نتیجے میں اس کا سر اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکتا چلا جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ بندہ شکر گزار ہے، اور اب اگر وہ نعمت کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ الحمدللہ مجھے فلاں نعمت حاصل ہے اور یہ بات وہ ڈرتے ڈرتے کہتا ہے کہ کہیں تکبر اور تعلّی نہ ہو جائے، تو معلوم ہوا کہ یہ ''تحدیثِ نعمت'' کے طور پر یہ بات کہہ رہا ہے۔ اور اگر نعمت ملنے کے بعد وہ منہ اُٹھا کر اپنی بڑائی بیان کر رہا ہے کہ میں تو ایسا ہوں، میں نے ایسا

(۱) النمل: ۱۹

کیا، میں نے ایسا کیا، تو اس صورت میں وہ چاہے ''تحدیثِ نعمت'' کے الفاظ استعمال کرے، لیکن حقیقت میں وہ ''تحدیثِ نعمت'' نہیں بلکہ وہ تکبر ہے۔

شیخ کی ضرورت

یہ تو ''تحدیثِ نعمت'' کی علامت ہے، لیکن انسان خود سے اس علامت کو اپنے اوپر منطبق نہیں کرسکتا، اس لئے شیخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا جب کسی نعمت کا اظہار کرے تو اپنے شیخ سے پوچھے کہ فلاں موقع پر میں نے فلاں نعمت کا اظہار کیا تھا، آیا یہ حدود سے متجاوز ہوا یا نہیں؟ وہ شیخ بتائے گا کہ اس حد تک ٹھیک ہے اور اس حد کے بعد غلط ہے۔ اور جب پندرہ بیس مرتبہ شیخ کو بتایا اور شیخ نے اس کی اصلاح کردی تو اس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ خود ذہن کے اندر ایک ترازو قائم ہو جائے گا، پھر انسان کو خود اس بات کا ادراک ہونے لگے گا کہ کہاں میرا قدم صحیح ہے اور کہاں غلط ہے، اور کہاں تکبر ہے اور کہاں ''تحدیثِ نعمت'' ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

خود پسندی اور اس کا علاج ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ. وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ. وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ. أَمَّا بَعْدُ!

گزشتہ کئی روزے سے ''تکبر'' کا بیان چل رہا تھا، الحمدللہ اس کے بارے میں کافی تفصیل سے بیان ہوگیا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس ''تکبر'' سے محفوظ رکھے۔ آگے حضرت مولانا عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''عُجب'' کا عنوان لگایا ہے اور اس کے تحت بھی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات بیان فرمائے ہیں۔ دیکھئے! تصوف اور طریقت کی اصطلاح میں تین الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ ایک عُجب، دوسرے کبر، تیسرے تکبر، بظاہر دیکھنے میں یہ تینوں ایک جیسے الفاظ ہیں لیکن تینوں کے مصداق میں باریک فرق ہے۔

''عُجب'' کی تعریف

سب سے پہلے انسان کے اندر ''عُجب'' پیدا ہوتا ہے اور اس عُجب کی انتہا تکبر پر ہوتی ہے۔ ''عُجب'' کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے کسی وصف کی طرف نگاہ کرکے اس کے نتیجے میں اپنے آپ کو دوسرے سے اچھا سمجھے اور اس وصف کے سلسلے میں عطاءِ حق تعالیٰ کی طرف نگاہ نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص عالم ہے، اب اس کے دل میں اپنے عالم ہونے کا احساس پیدا ہوا کہ میں عالم ہوں اور عالم ہونے کی بنیاد پر اپنے آپ کو دوسروں سے اچھا سمجھا اور اس علم کے اللہ تعالیٰ کی عطا اور نعمت ہونے کی طرف نگاہ نہیں کی، چاہے اس کے ساتھ دوسروں کی تحقیر ہو یا نہ ہو، دونوں صورتیں عُجب میں داخل ہیں۔ لہٰذا محض اپنے کسی اچھے وصف کا استحضار اللہ تعالیٰ کی عطا اور نعمت ہونے کے استحضار کے بغیر کرنا یہ ''عُجب'' ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ''عُجب'' کے اندر دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا صرف اپنی ذات سے تعلق ہوتا ہے۔

☆ اصلاحی مجالس (۴/۳/۷ تا ۸۴ء) بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دارالعلوم، کراچی

عُجب، کِبر اور تکبر میں فرق

اسی "عُجب" کے نتیجے میں انسان کے اندر "کِبر" پیدا ہو جاتا ہے۔ "کبر" کا مطلب یہ ہے کہ دل میں یہ خیال آنا کہ چونکہ میرے اندر یہ وصف موجود ہے، لہٰذا میں بڑا ہوں۔ "عُجب" کے اندر اپنی اچھائی کی طرف نگاہ ہوتی ہے اور "کبر" کے اندر اپنی بڑائی کی طرف نگاہ ہوتی ہے، لہٰذا دوسروں سے اپنے کو بڑا سمجھ لینا "کبر" ہے۔ پھر اس بڑا سمجھنے کے نتیجے میں دوسروں پر اپنی بڑائی کا اظہار کرنا "تکبر" ہے، مثلاً اپنی اکڑ دکھا رہا ہے اور دوسروں کو حقیر سمجھ رہا ہے اور دوسروں کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کر رہا ہے، یہ سب "تکبر" کے اندر داخل ہے۔

چوتھی چیز "استکبار"

پھر اس کے بعد ایک چوتھا درجہ ہے جس کو قرآن کریم نے "استکبار" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ "استکبار" کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان "تکبر" کے نتیجے میں دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے تو اب ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ کرتا ہے کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا اور خود اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے فیصلے کرتا ہے اور بعض اوقات ظلم کے فیصلے بھی کر گزرتا ہے، یہ "استکبار" ہے۔ قرآن کریم نے یہ لفظ فرعون وغیرہ کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس "استکبار" کے اندر حق کو قبول کرنے سے عِناد پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

عُجب کا علاج

بہر حال! سب سے پہلے انسان کے اندر "عُجب" پیدا ہوتا ہے اور یہی عُجب آگے ترقی کر کے کبر اور تکبر اور استکبار پیدا کرتا ہے۔ اس لئے جب عُجب انسان کے اندر پیدا ہو تو پہلے ہی مرحلے میں اس کا علاج کرے۔ اس کے علاج کے سلسلے میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں:

> "عمل میں دو حیثیتیں ہیں، ایک اپنا کمال، اس اعتبار سے (یعنی اپنا کمال سمجھ کر) اس پر نظر نہ کرنی چاہئے، دوسرا یہ کہ یہ خدا کی نعمت ہے، اس اعتبار سے اس پر مسرت مامور بہ ہے ﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾ (۱)

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۶۲، یونس: ۵۸، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "(اے پیغمبر!) کہو کہ: "یہ سب کچھ اللہ کے فضل اور رحمت سے ہوا ہے، لہٰذا اسی پر تو انہیں خوش ہونا چاہئے"

علم کو عطا حق سمجھو

اگر کوئی شخص کوئی عمل کر کے اس عمل کو اپنا کمال سمجھ کر خوش ہو رہا ہے کہ یہ میرا کمال ہے اور عطا حق تعالیٰ پر نظر نہیں تو "عُجب" ہے اور گناہ ہے، اور اگر اس عمل کو اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھ کر خوش ہو رہا ہے کہ میرے اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے تو یہ خوشی محمود اور مطلوب ہے جس کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾(۱)

گویا کہ اس کے دل میں یہ خیال آرہا ہے کہ میرا تو کوئی کمال نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ چیز عطا فرمادی اور اس فضل پر خوش ہو رہا ہے تو یہ خوشی نہ صرف یہ کہ عُجب اور کبر نہیں بلکہ یہ خوشی مامور بہ ہے، کیونکہ اس آیت میں فَلْيَفْرَحُوْا امر کا صیغہ ہے۔

نیک کام کرنے پر خوشی ایمان کی علامت ہے

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَأَنْتَ مُؤْمِنٌ))(۲)

یعنی جب تمہیں اپنے کسی اچھے عمل پر خوشی ہو اور برے عمل پر رنج ہو تو یہ تمہارے مؤمن ہونے کی علامت ہے۔ لہٰذا اگر نماز پڑھ کر خوشی ہوئی اور کہا کہ یا اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ ایمان کی علامت ہے، اسی طرح روزہ رکھ کر خوشی ہوئی کہ الحمد للہ! اللہ تعالیٰ نے مجھ سے روزہ رکھوالیا، یا اعتکاف کر کے خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اعتکاف کرنے کی توفیق عطا فرمادی تو یہ خوشی پسندیدہ ہے، اس میں کوئی خرابی نہیں۔

یہ خوشی نقد خوشخبری ہے

ایک صحابیؓ نے حضورِ اقدس ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! جب میں کوئی اچھا عمل کرتا ہوں تو دل میں خوشی ہوتی ہے، اس خوشی پر مجھے خیال ہوا ہے کہ کہیں یہ عُجب تو نہیں ہے؟ جواب میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) یونس: ۵۸، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: "(اے پیغمبر!) کہو کہ: "یہ سب کچھ اللہ کے فضل اور رحمت سے ہوا ہے، لہٰذا اسی پر تو انہیں خوش ہونا چاہیے"

(۲) مسند أحمد بن حنبل، حديث أبي أمامة الباهلي، رقم: ۲۱۱٤٥

((لَا تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ)) (۱)

''یہ خوشی مؤمن کے لئے نقد خوشخبری ہے''

یعنی یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نقد انعام مل گیا کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے بشاشت پیدا کردی، یہ کوئی عُجب اور تکبر نہیں، اس سے نہیں گھبرانا چاہئے جب تک اس عمل کو حق تعالیٰ کی عطا سمجھتے رہو، جیسے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا تھا:

لَوْ لَا اللّٰهُ مَا اهْتَدَيْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَ لَا صَلَّيْنَا(۲)

''اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق نہ ہوتی تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے، نہ ہم ہدایت یافتہ ہوتے، نہ صدقہ خیرات کرتے، نہ نماز پڑھتے۔ لہٰذا ان اعمال کو عطا حق سمجھتے رہو اور ان پر خوش ہوتے رہو تو اس میں کوئی حرج نہیں''

اور اگر اس بات پر خوشی ہورہی ہے کہ میں تو کمال تک پہنچ گیا اور اس عمل کے کرنے میں اللہ تعالیٰ کی عطا پر نظر نہیں بلکہ اس کو اپنا استحقاق اور اپنا کمال سمجھتا ہے اور اس کے نتیجے میں دوسروں کی تحقیر کرتا ہے تو یہ خوشی وہ ہے جس کو قرآن کریم میں ''لَا تَفْرَحْ'' کے الفاظ کے ذریعہ منع کیا گیا ہے۔

خوشی مطلوب، خوشی ممنوع

اور اس آیت میں فرمایا: فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا، خوش ہونے کا حکم دیا گیا تو ایک خوشی مطلوب اور مقصود اور مامور بہ ہے اور ایک خوشی ممنوع عنہ اور حرام ہے، جو خوشی مامور بہ ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عمل کی جو توفیق عطا فرمائی، اس پر نظر کر کے خوش ہونا لیکن اپنے کمال پر خوش ہونا کہ میرا یہ کمال ہے کہ میں نے یہ عمل سرانجام دیا تو یہ اتراہٹ ہے اور ممنوع عنہ اور حرام ہے۔

فرق کے لئے ''شیخ'' کی ضرورت

لیکن ان دونوں خوشیوں میں فرق انسان خود نہیں کرسکتا، بلکہ اس کے لئے کسی شیخ کی اور معالج کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بتاتا ہے کہ یہاں پہلی قسم کی خوشی ہے، اس لئے فکر کی بات نہیں،

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب اذا أثنى على الصالح فهي بشرى ولا تضره، رقم: ٤٧٨٠، مسند أحمد، حديث أبي ذر الغفاري، رقم: ٢٠٤١٦

(۲) صحيح البخاري، كتاب الجهاد والسير، باب حفر الخندق، رقم: ٢٦٢٥، صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب غزوة خيبر، رقم: ٣٣٦٣، سنن النسائي، كتاب الجهاد، باب من قاتل في سبيل الله فارتد عليه سيفه، رقم: ٣٠٩٩، مسند أحمد، رقم: ١٥٠٠٥

جیسا کہ ان صحابی رضی اللہ عنہ کے دل میں شک پیدا ہوا کہ یہ خوشی جو میرے دل میں پیدا ہو رہی ہے، یہ پہلی خوشی ہو رہی ہے یا دوسری خوشی ہو رہی ہے، مامور بہ خوشی ہو رہی ہے یا منہی عنہ خوشی ہو رہی ہے؟ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیا۔ آپ نے فرمایا:

((لَا تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ))

''یہ خوشی مؤمن کے لئے نقد خوشخبری ہے''

یہ پہلی قسم کی خوشی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب پر اطمینان ہو گیا کہ الحمد للہ یہ خوشی بری نہیں ہے۔ اگر دوسری قسم کی خوشی ہوتی تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس کا علاج فرماتے۔

آج کل ''شیخ'' بنانے کے مقاصد

شیخ کی ضرورت ان کاموں میں پڑتی ہے، لیکن آج کل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شیخ اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ اس سے وظیفے پوچھے جائیں کہ کیا پڑھیں؟ اگر کوئی خواب دیکھو تو اس کی تعبیر شیخ سے پوچھو، اور اس سے یہ پوچھو کہ قرض ادا کرنے کی کیا دعا ہے؟ اور رزق بڑھانے کے لئے اور روزگار ملنے کی کیا دعا ہے؟ بس شیخ ان کاموں کے لئے ہوتا ہے۔ صبح سے لے کر شام تک انہی کاموں کے چکر ہوتے ہیں اور اسی کا نام پیری مریدی رکھ لیا ہے۔

یاد رکھئے! ان کاموں کا پیری مریدی سے کوئی تعلق نہیں، نہ تعویذ گنڈے، نہ دعائیں نہ وظیفے اور نہ خواب کی تعبیر، ان کا شیخ سے کوئی تعلق نہیں، اصل چیز پوچھنے کی یہ ہے کہ عمل کرنے پر مجھے جو خوشی ہو رہی ہے، یہ میری خوشی مقبول ہے یا نہیں؟ یہ خوشی عُجب اور گناہ تو نہیں ہے؟ اور پھر شیخ کے بتانے پر عمل کرو، پیری مریدی کا اصل مقصد یہ ہے۔ آج کل لوگ یہ باتیں تو پوچھتے نہیں، لیکن وظیفے اور ذکر اذکار پوچھتے رہتے ہیں۔

توفیقِ الٰہی پر شکر کرنا چاہئے

چنانچہ آگے حضرت والا فرماتے ہیں:

''کام کرنے والوں کو چاہئے کہ اپنے اعمال کو اپنا کمال نہ سمجھیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان سمجھ کر شکر کریں کہ انہوں نے ہم سے کام لے لیا ورنہ ہماری کیا طاقت تھی۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی

منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت (۱)

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۶۲

جو کچھ بھی کام ہو رہا ہے، مثلاً عبادت ہو رہی ہے، خدمتِ خلق ہو رہی ہے، کوئی علمی خدمت ہو رہی ہے، کوئی وعظ ہے، کوئی تبلیغ ہے، کوئی فتویٰ ہے، کوئی تصنیف ہے، کوئی تدریس ہے، جو کوئی خدمت ہو رہی ہے، اس کو اپنا کمال نہ سمجھو بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق پر شکر ادا کرو کہ اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے اس کی توفیق عطا فرمادی، ورنہ کتنے لوگ ہیں جو جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں، میری حقیقت ہی کیا تھی کہ میں یہ عمل کرتا، جب انسان یہ سوچتا ہے تو اس سے تکبر اور عُجب پیدا نہیں ہوتا۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی

منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

یہ کیا احسان جتاتے ہو کہ میں نے فلاں خدمت انجام دے دی، یا فلاں خدمت انجام دے دی، فلاں تقریر کردی، فلاں فتویٰ لکھ دیا، فلاں کتاب لکھ دی، احسان تو اللہ تعالیٰ کا مانو کہ اس نے تمہیں اس خدمت پر لگا دیا۔ ارے کتنے لوگ ہیں جن کو ان اعمال کی توفیق نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کام پر لگا دیا، کیا یہ ناز کی بات ہے؟ یہ کوئی فخر کرنے کی بات ہے؟ یا دوسروں پر بڑائی جتانے کی بات ہے؟ ارے یہ تو اللہ جل شانہ کا کرم ہے کہ اس نے تمہیں اس کام پر لگا دیا، اس لئے اس کام پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

مثلاً کوئی عبادت انجام دے لی، نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا، اعتکاف کرلیا، تراویح پڑھ لی، تلاوت کرلی، ذکر کرلیا، تو ان عبادات کے کرنے پر احسان کس لئے جتاتے ہو؟ ارے یہ تو اس کا کرم ہے کہ اس نے تمہیں ان عبادات کی توفیق دے دی، اس توفیق پر اس کا شکر ادا کرو۔

شکر کے نتیجے میں مزید توفیق ہوگی

لہٰذا اس عبادت کی ناقدری نہ کرو اور ناشکری بھی مت کرو بلکہ شکر ادا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کی توفیق عطا فرمادی اور یہ سوچو کہ اگر اس کی توفیق نہ ہوتی تو میں نہ جانے کس حال میں ہوتا۔ جب یہ سوچو گے اور شکر ادا کرو گے تو پھر نہ تو عُجب قریب آئے گا اور نہ تکبر قریب آئے گا اور شکر ادا کرنے کی بدولت اللہ تعالیٰ مزید عبادات کی اور اچھے کاموں کی توفیق عطا فرمائیں گے۔

''شکر ادا کرنا'' قلندری عمل ہے

لیکن اس کام کی مشق کرنی پڑتی ہے، لہٰذا جب بھی کسی نیک کام کی توفیق ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ چنانچہ ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ بعض اعمال قلندری ہوتے ہیں اور یہ ''شکر'' بھی قلندری عمل ہے یعنی شکر ایسا عمل ہے کہ دیکھنے میں کوئی بڑا عمل نہیں، آپ نے چپکے سے کہہ دیا

"الحمد للہ" کسی کو پتہ چلا کہ آپ نے کیا عمل کیا؟ یا یہ کہہ دیا:

"اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ"

کسی کو پتہ بھی نہیں چلا کہ آپ نے کیا کیا، لیکن اندر ہی اندر ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہو گیا اور اس کے نتیجے میں تمہارا درجہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور دیکھنے والوں کو پتہ بھی نہیں چلا۔

میان عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

شکر ادا کرنے کی مشق کرو

ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ زبان پر شکر کا رٹا لگایا کرو، مثلاً گرمی لگ رہی تھی، ایک ہوا کا جھونکا آیا تو کہو......

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

گھر میں داخل ہوئے اور بچہ کھیلتا ہوا اچھا معلوم ہوا اور اس سے دل خوش ہوا تو کہو......

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

بھوک لگ رہی تھی، کھانا سامنے آیا تو کہو......

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

دل ہی دل میں کہتے جاؤ اور اس کی عادت ڈالو کہ ہر وقت تمہارا دل اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی نعمت پر شکر کر رہا ہو۔ جب بار بار اس کی مشق کرو گے تو یہ بات حاصل ہو جائے گی۔ پھر یہ ہوگا کہ آدمی کام بھی کر رہا ہے اور دل اللہ تعالیٰ کے شکر میں مشغول ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

جگر پانی کیا ہے مدتوں غم کی کشاکش میں
کوئی آسان ہے کیا خوگرِ آزار ہو جانا

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں نے سالہا سال مشق کی ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی نعمت پر شکر ادا ہوتا رہے، اندر ہی اندر اپنے مالک سے اپنے خالق سے اپنے آقا سے رشتہ جڑا ہوا ہے اور کسی دوسرے کو پتہ بھی نہیں ہے۔

شکر رذائل کی جڑ کاٹتا ہے

یہ "شکر" ایسا تریاق ہے جو بے شمار رذائل کی جڑ کاٹتا ہے اور بے شمار فضائل اس کے ذریعہ

حاصل ہوتے ہیں، اس لئے اس ''شکر'' کی عادت ڈالو، یہ قلندری عمل ہے، اس کے اندر بہت بڑے مجاہدات اور ریاضتیں نہیں ہیں، بہت مختصر سا کام ہے کہ صبح سے لے کر شام تک ہر عمل پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے چلے جاؤ، مثلاً آپ مسجد سے باہر نکلے اور دروازے پر جوتے آسانی سے مل گئے تو کہو......

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

کسی سے ملاقات کے لئے گئے اور اس شخص سے ملاقات ہوگئی تو دل ہی دل میں کہو......

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

جو بھی مقصد حاصل ہو جائے، چاہے وہ چھوٹے سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، اس پر اللہ جل شانہ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو۔ لوگ اس شکر کی قدر نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ بہت معمولی سا عمل ہے، لیکن یہ عظیم تریاق ہے، اس پر عمل کر کے دیکھو، جوں جوں انسان اس کی مشق کرے گا اور اس پر عمل کرے گا تو پھر یہ عجب اور تکبر پاس نہیں پھٹکے گا۔ اور شیطان بھی یہ گُر جانتا تھا کہ جو بندہ شکر کرتا رہے گا وہ میرے قبضے میں نہیں آئے گا، اسی وجہ سے اس نے کہا تھا:

﴿وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ﴾(۱)

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے اور آپ کو بھی اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(۱) الأعراف: ۱۷، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور تو ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر گذار نہیں پائے گا''

دوسرے کو حقیر سمجھنے کا علاج ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ. أَمَّا بَعْدُ!

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

"اگر کسی بات میں دوسرے کو گھٹا ہوا دیکھو تو اس وقت یہ سوچو کہ ہم بھی کسی بات میں اس سے گھٹے ہوئے ہیں یا نہیں؟ ہر شخص میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور برائیاں بھی، اگر اس شخص میں ایک برائی ہے تو ممکن ہے کہ ہم میں بہت سی برائیاں ہوں، یا ہم میں ایک ہی برائی ہو لیکن اس برائی سے بدتر ہو جو اس کے اندر ہے، پھر کس طرح ہم اس کو گھٹا ہوا سمجھتے ہیں اور کیوں دوسرے کو اپنے آپ سے کم درجہ سمجھتے ہیں اور کیوں سلام میں ابتداء کرنے سے عار آتی ہے؟"(۱)

غیر اختیاری خیال کے آنے پر مؤاخذہ نہیں

کبھی کسی شخص کے بارے میں خیال آجائے، اور یہ خیال بعض اوقات آجاتا ہے کہ یہ شخص فلاں چیز میں مجھ سے گھٹا ہوا ہے اور میں اس سے بڑھا ہوا ہوں، تو تنہا اس خیال کا آجانا کوئی بری بات نہیں اور اس غیر اختیاری خیال پر اللہ تعالیٰ کے یہاں مؤاخذہ بھی نہیں ہے، لیکن بار بار اس خیال کا لانا اور اس خیال کا دل میں بٹھانا اور پھر اس خیال کے مقتضیٰ پر عمل کرنا، یہ سب تکبر میں داخل ہیں، لہٰذا اس کا علاج بھی ضروری ہے۔

ذہین طالب علم کے دل میں اپنی برتری کا خیال

مثلاً چند طلباء ایک جماعت میں پڑھتے ہیں، ایک طالب علم بڑا ذہین اور زیرک ہے، اچھی استعداد کا مالک ہے اور ہر امتحان میں اوّل نمبر پر آتا ہے، دوسرا طالب علم کند ذہن ہے، پڑھائی میں

☆ اصلاحی مجالس (۲/۴۶ تا ۵۹)، بعد از نمازِ ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دارالعلوم، کراچی۔

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۵۸

کمزور ہے، اب جو طالب علم پڑھائی میں تیز ہے، ذہین ہے، زیرک ہے، اس کے دل میں یہ خیال آئے گا کہ میں اس کے مقابلے میں اچھی استعداد والا ہوں، لیکن ساتھ ہی وہ یہ سوچے کہ اگرچہ اس ایک وصف میں یہ مجھ سے گھٹا ہوا ہے اور میں اس سے بڑھا ہوا ہوں، لیکن نہ جانے اس کے اندر کتنے اوصاف ایسے ہوں جس میں یہ مجھ سے فائق ہو، اور یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کونسا وصف زیادہ مقبول ہو جائے اور میں اس سے پیچھے رہ جاؤں، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میرے اندر بہت سی خرابیاں ہوں اور ان کے بارے میں مجھے پتہ بھی نہ ہو، یا میرے اندر ایک خرابی ہو، لیکن وہ خرابی اس طالب علم کی استعداد کی کمزوری کے مقابلے میں زیادہ سنگین ہو۔

کمزور طالب علم میں نیکی کی برتری حاصل ہے

دیکھئے، اگر ایک طالب علم پڑھائی میں کمزور ہے، لیکن نیک ہے اور اپنے فرائض و واجبات کو ٹھیک ٹھیک بجالاتا ہے، گناہوں سے بچتا ہے، اور ایک طالب علم بڑا ذہین، بڑا زیرک اور بڑا صاحبِ استعداد ہے اور ہر امتحان میں اوّل آتا ہے، لیکن گناہوں کے اندر مبتلا ہے یا وہ نمازوں میں کوتاہی کرتا ہے، ایسے طالب علم کے جو اچھے اوصاف ہیں وہ اکارت اور بیکار ہیں، اس لئے کہ جب عمل صحیح نہیں تو علمی استعداد موجود ہونے سے کیا حاصل؟ اگرچہ یہ طالب علم علمی استعداد کے وصف میں دوسروں سے بڑھا ہوا ہے، لیکن اس کے اندر ایک خرابی ایسی ہے جس نے اس کے اچھے وصف پر پانی پھیر دیا۔

اصل خرابی ''بے دین'' ہونا ہے

آج کل لوگ دینی خرابی کو خرابی ہی نہیں سمجھتے، العیاذ باللہ، حالانکہ اصل خرابی اور کمزوری یہی ہے۔ ایک صاحب اپنے بیٹے کا تعارف مجھ سے کرا رہے تھے، کہنے لگے کہ میرا یہ بیٹا بڑا ذہین اور بڑا زیرک ہے، پڑھائی میں بہت تیز تھا، اور اب اس کو فلاں ملک میں اعلیٰ درجے کی ملازمت مل گئی ہے، اور وہاں پر اس نے سارے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مبارک کرے۔ پھر کہنے لگے، البتہ یہ تھوڑا سا بے دین ہو گیا ہے۔ ان صاحب نے بے دین ہونے کی خرابی کو اس طرح بیان کیا کہ جیسے یہ کوئی بڑی خرابی نہیں ہے، گویا کہ اصل معاملات میں تو یہ ٹھیک ہے، بس یہ ذرا سی کمزوری ہو گئی ہے۔

''بے دین'' ہونے کی مثال

میں نے کہا کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گاؤں کے لوگ ایک حکیم صاحب کو ایک شخص

کے معائنے کے لئے لائے۔ وہ حکیم صاحب آئے اور اس کا سر سے لے کر پاؤں تک چاروں طرف سے معائنہ کیا۔ دیکھنے کے بعد حکیم صاحب کہنے لگے کہ یہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک آدمی ہے، اس کے سارے اعضاء بالکل ٹھیک ہیں، اس کے ہاتھ بھی ٹھیک ہیں، کان بھی ٹھیک ہے، ناک بھی ٹھیک ہے، بس ذرا سی روح نکل گئی ہے۔ میں نے ان صاحب سے کہا کہ آپ نے اپنے بیٹے کے بارے میں جو تعریف کی، اس پر یہ مثال بالکل صادق آتی ہے کہ اس کے اندر سب باتیں تو ٹھیک ہیں، بس ذرا سا بے دین ہو گیا ہے۔ العیاذ باللہ۔

حالانکہ دین کی خرابی اور بدعملی کی خرابی ایسی ہے جو ساری خرابیوں پر بھاری ہے۔ لہٰذا جس شخص کو تم گھٹیا سمجھ رہے ہو، کیا پتہ تمہارے اندر ایک خرابی ایسی ہو جو اس کی خرابی پر بھاری ہو جائے۔

کمتر لوگ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوں گے

اور اگر بالفرض اس کے مقابلے میں تمہارے اندر عیوب کم بھی ہوں، لیکن کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کون مقبول ہے۔ جو لوگ بظاہر دیکھنے میں معمولی قسم کے لوگ نظر آتے ہیں، لیکن بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ حدیث شریف میں حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((رُبَّ أَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْأَبْوَابِ، لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ))(۱)

"ایسا شخص جس کے بال پراگندہ ہیں اور ایسا ہے کہ اگر وہ لوگوں کے دروازوں پر جائے تو لوگ دھکے دے کر نکال دیں، لیکن اگر وہ شخص اللہ تعالیٰ پر قسم کھالے، مثلاً وہ یہ کہے کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ ایسا ضرور ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم پوری فرمادیتے ہیں"

اگرچہ عام لوگوں کی نظروں میں وہ شخص بے حقیقت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی بات کو نہیں ٹالتے ہیں کہ جب میرے بندے نے قسم کھالی ہے تو اب میں اس کو جھوٹا نہیں کروں گا۔

جنت کے اعلیٰ درجات والے لوگ

جنت میں جن لوگوں کو اعلیٰ ترین درجات ملنے والے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے حدیث شریف میں یہ الفاظ ہیں کہ

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البرّ والصلة والآداب، باب فضل الضعفاء والخاملين، رقم: ٤٧٥٤، سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول اللّٰه، باب مناقب البراء بن مالك، رقم: ٣٧٨٩

((اَلَّذِیْنَ إِذَا غَابُوْا لَمْ یُفْتَقَدُوْا))(۱)

''وہ ایسے لوگ ہیں جب وہ کہیں چلے جائیں اور غائب ہو جائیں تو ان کو کوئی ڈھونڈنے والا بھی نہ ہو اور کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہو''

مثلاً ایک شخص روزانہ نماز پڑھنے مسجد میں آتا تھا، اگر کسی دن نہ آئے تو کوئی یہ نہ پوچھے کہ فلاں شخص روزانہ آتا تھا، آج کہاں چلا گیا؟ اور اگر وہ کہیں نکاح کا رشتہ لے کر چلے جائیں تو لوگ رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیں کہ یہ تو مولوی آدمی ہے۔ ایسے لوگوں کو جنت میں اعلیٰ ترین درجات ملنے والے ہیں۔

کسی کے ظاہر پر مت جاؤ

لہٰذا کسی شخص کے ظاہر پر مت جاؤ کہ ظاہری اعتبار سے یہ شخص کیسا ہے، کچھ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی کیا قدر و قیمت ہو۔ اس لئے فرمایا کہ کسی انسان کو حقیر مت سمجھو، اور یاد رکھو کہ کسی مسلمان پر حقارت کی نگاہ ڈالنا گناہِ کبیرہ اور حرام ہے اور یہ ایسا ہی حرام ہے جیسے شراب پینا اور زنا کرنا حرام ہے۔ اس لئے اگر کبھی اپنے کسی کمال کا خیال آئے اور دوسرے شخص کے کسی نقص کا خیال آئے تو فوراً اس کا علاج اس طرح کرو کہ یہ سوچو کہ کیا معلوم اس کے اندر اور کوئی خوبیاں ہوں جو مجھے معلوم نہیں، کیا معلوم کہ میرے اندر ایسی برائیاں ہوں جو اس کی برائی سے زیادہ سنگین ہوں، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ شخص کتنا مقبول ہو۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض لوگ

اور جو لوگ بظاہر دیکھنے میں بڑے باعزت اور باوقعت نظر آتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک پرکاہ کے برابر بھی ان کی وقعت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کا مصداق بننے سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ أَبْغَضَکُمْ إِلَیَّ وَأَبْعَدَکُمْ مِنِّیْ مَجْلِسًا یَوْمَ الْقِیَامَةِ الثَّرْثَارُوْنَ وَالْمُتَشَدِّقُوْنَ وَالْمُتَفَیْهِقُوْنَ))(۲)

وہ لوگ جن سے مجھے نفرت ہے اور جو قیامت کے دن مجھ سے دور ہوں گے یہ وہ لوگ ہیں جو

---

(۱) سنن ابن ماجة، کتاب الفتن، باب من ترجی له السلامة من الفتن، رقم: ۳۹۷۹

(۲) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ما جاء فی معالی الأخلاق، رقم: ۱۹۴۱، مسند أحمد، رقم: ۱۷۰۶۶

زیادہ بولنے والے ہیں اور باچھیں چیر کر بات کرنے والے اور تکبر کرنے والے ہیں، یعنی جو مجلسیں گرم کرنے والے اور بڑے فصیح و بلیغ مشہور ہیں، جو شعلہ بیان اور آتش نوا مشہور ہیں، لوگ ان کے اردگرد جمع ہیں، اور وہ لوگ باچھیں چیر چیر کر لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں، اور وہ لوگ جو لوگوں سے اپنی فصاحت و بلاغت کا لوہا منوائے ہوئے ہیں اور فصاحت و بلاغت اور حسنِ کلام کی وجہ سے لوگوں میں مقبولیت ہے، عام لوگ ان کو پسند کرتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہیں کہ یہ بڑے عالم، بڑے فقیہ، بڑے واعظ ہیں، بڑے خطیب ہیں، بڑے باغ و بہار اور مجلسی ہیں، لیکن ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین ہیں۔ العیاذ باللہ

کسی پر کوئی حکم مت لگاؤ

لہٰذا اللہ تعالیٰ کے یہاں نہ تو ظاہری خوبیاں مقبولیت کے لئے معیار ہیں اور نہ ہی ظاہری نقائص اللہ تعالیٰ کے یہاں غیر مقبول ہونے کی علامت ہیں۔ کس بات پر انسان فیصلہ کرے؟ کس چیز پر حکم لگائے؟ اس لئے ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہئے اور کسی بھی انسان کی ظاہری حالت دیکھ کر کوئی حکم مت لگاؤ۔ نہ تو کسی کی تعریف کرو اور نہ کسی کی برائی کرو۔

کافر کو بھی حقیر مت سمجھو

انسان ابتداء میں جب دین پر چلنا شروع کرتا ہے تو اس وقت اس کے اندر جوش و خروش ہوتا ہے، اس کے نتیجے میں ساری مخلوق پر لعنت ملامت شروع کر دیتا ہے، ساری مخلوق کو یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب جہنمی ہیں، بس میں ہی جنتی ہوں، یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ ارے مسلمان تو مسلمان، کسی کافر کو بھی قطعی طور پر جہنمی مت کہو، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ اس کو اسلام کی توفیق دیدے اور ایک لمحے میں اس کا بیڑہ پار ہو جائے۔

کافر پر ''مخلّد فی النار'' ہونے کا حکم مت لگاؤ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور باریک بات ارشاد فرمائی جو سمجھنے کی ہے، فرمایا کہ اگر کسی شخص کے ظاہری اقوال سے ایسی باتیں صادر ہو رہی ہیں جو کفر کی حد تک پہنچ رہی ہیں، تو مفتی کا کام یہ ہے کہ اس کے اوپر فتویٰ دیدے کہ یہ باتیں کفر کی ہیں اور دنیا میں اس کے ساتھ کافروں جیسا معاملہ کیا جائے گا، بشرطیکہ مفتی نے پوری احتیاط سے کام لیا ہو، وہ احتیاط یہ ہے کہ اگر کسی کے کلام میں ننانوے احتمالات کافر ہونے کے ہوں اور ایک احتمال مسلمان ہونے کا ہو،

تب بھی کافر ہونے کا فتویٰ نہیں دینا چاہئے۔ لیکن اس کے بارے میں کفر کا فتویٰ دیئے جانے کے باوجود یہ مت کہو کہ اس کی وجہ سے وہ "مخلد فی النار" ہوگیا، اس لئے کہ بیشک ظاہری اعتبار سے اس کی بات کفر تھی، لیکن کیا معلوم کہ باطنی طور پر اس کے قول کی ایسی تاویل ہو جو اس کو اللہ تعالیٰ کے یہاں کفر سے بری کردے۔

ایک شخص کی مغفرت کا واقعہ

اس کی مثال میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ صحیح بخاری کی حدیث پیش فرماتے ہیں، جس میں پچھلی اُمتوں کے ایک شخص کا واقعہ مذکور ہے کہ پچھلی اُمتوں میں ایک شخص تھا، جب اس کے انتقال کا وقت قریب آیا تو اس نے وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو میری لاش کو آگ میں جلا دینا اور لاش جلنے کے بعد جب راکھ ہو جائے تو جس دن بہت تیز ہوا چل رہی ہو، اس دن اس راکھ کو ہوا میں اُڑا دینا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ ایسی وصیت کیوں کر رہے ہو؟ اس نے کہا کہ بات یہ ہے کہ میں بہت گناہ گار آدمی ہوں، اور میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ نہ آؤں، کیونکہ اگر میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ آ گیا تو اللہ تعالیٰ مجھے سخت سزا دیں گے، اس لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ نہ آؤں۔ چنانچہ اس کے مرنے کے بعد اس کی وصیت کے مطابق عمل کر لیا گیا۔

جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ شخص اولاً ہمارے وجود پر ایمان لایا، دوسرے یہ کہ یہ شخص ہم سے ڈر بھی گیا اور ایسا ڈرا کہ اس نے لوگوں سے کہا کہ اگر میں اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ گیا تو وہ مجھے سخت عذاب دیں گے، اس کی ان باتوں کی وجہ سے ہم اس کی مغفرت کرتے ہیں۔(۱)

ظاہری کفر کے باوجود مغفرت کی وجہ

اب بظاہر تو اس کی یہ وصیت کفر تک پہنچتی ہے، اس لئے کہ اس نے کہا تھا کہ میں یہ وصیت اس لئے کر رہا ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ نہ آؤں، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار کر رہا ہے کہ اگر ہوا میں میرے جسم کی راکھ اُڑا دی جائے گی تو پھر اللہ تعالیٰ مجھے جمع نہیں کر سکیں گے، یہ کھلا کفر ہے۔ لیکن چونکہ اس وصیت کا منشا اللہ تعالیٰ کا ڈر اور خوف تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ یریدون أن یبدلوا کلام اللہ، رقم: ۶۹۵۲، صحیح مسلم، کتاب التوحید، باب فی سعة رحمة اللہ تعالیٰ وأنها سبقت غضبه، رقم: ۴۹۴۹، سنن النسائی، کتاب الجنائز، باب أرواح المؤمنین، رقم: ۲۰۵۲، مسند أحمد، رقم: ۳۵۹۷

کی مغفرت فرمادی۔

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس شخص سے ظاہراً کفر بھی صادر ہوگیا ہو، اس کے اوپر فتویٰ بھی کفر کا ہوگا، اس لئے کہ مفتی کا کام ہی یہ ہے کہ اس کے اوپر کفر کا حکم لگائے، لیکن اس کے ''مخلّد فی النار'' ہونے کا حکم نہ لگائے۔

''منصور حلاّج'' پر کفر کا فتویٰ

دیکھئے! ''منصور حلاّج'' جن کا ''انا الحق'' کہنے کا واقعہ مشہور ہے، یہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد بلکہ شاید ان کے خلیفہ بھی تھے، جب ان سے ''انا الحق'' کا کلمہ صادر ہوا جو ظاہراً کفر کا کلمہ تھا تو علماء نے ان کے اوپر کفر کا فتویٰ دے دیا، حالانکہ اندرونی طور پر وہ ہرگز کافر نہیں تھے، ان پر تو کفر کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی، بلکہ غلبۂ حال میں ان سے ایسا کلام صادر ہوا تھا اور اس کی تاویلیں موجود تھیں، لیکن چونکہ فتنہ پھیل رہا تھا، اس لئے علماء کرام نے کفر کا فتویٰ دے دیا۔

پھانسی کے وقت حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے گفتگو

جب ان کو پھانسی دینے کا وقت آیا تو بہت بڑی مخلوق ان کی پھانسی دینے کا نظارہ کرنے کے لئے آئی تھی، ان میں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل تھے، جب منصور حلاّج نے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا تو ان سے کہا کہ یہ ساری مخلوق جو جمع ہے یہ تو حقیقتِ حال سے بے خبر ہے، ان کو تو کچھ معلوم نہیں ہے، اس لئے میں ان کو معذور سمجھتا ہوں، لیکن اے جنید! آپ کو تو حقیقت کا پتہ ہے کہ میں کیا کہتا ہوں اور میری مراد کیا ہوتی ہے، اس لئے آپ کیوں آئے؟ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ تمہارے خلاف جو فتویٰ دیا گیا ہے وہ صحیح ہے اور تمہارا یہی انجام ہونا چاہئے۔ حالانکہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ جانتے تھے کہ اندر سے منصور کی مراد کچھ اور ہے۔

علماء دین کے چوکیدار ہیں

لیکن اللہ تعالیٰ نے مفتی صاحبان اور فقہاء کو دین کا پاسبان بنایا ہے، ان کا فرض ہے کہ جو بات حق ہے وہ بتادیں، اگر کسی نے کفر کی بات کی ہے تو وہ کہہ دیں گے کہ یہ کفر ہے۔ ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ لوگ دین کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں، جس کو چاہا کافر بنادیا اور جس کو چاہا مسلمان بنادیا۔ میں نے کہا: ہم ٹھیکیدار تو نہیں ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دین کا چوکیدار ضرور بنایا ہے، اور

چوکیدار کا کام یہ ہے کہ وہ شناخت کے بغیر کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ دے، حتیٰ کہ اگر وزیر اعظم بھی آ جائے گا تو اس کو بھی روک لے گا کہ پہلے شناختی کارڈ دکھاؤ اور اپنی شناخت کراؤ کہ آپ وزیر اعظم ہیں، تب اندر جانے دوں گا ورنہ اندر نہیں جانے دوں گا۔ حالانکہ وہ وزیر اعظم ہے اور یہ چوکیدار ہے۔ اسی طرح ہم بھی دین کے چوکیدار ہیں، لہٰذا اگر کوئی دین کے اندر داخل ہونا چاہے لیکن وہ ان صفات کا حامل نہ ہو تو ہمارا حق ہے کہ اس کو دین کے اندر داخل ہونے سے روک دیں۔

کفر کے فتویٰ کے بعد جہنمی ہونے کا حکم مت لگاؤ

لہٰذا جو مفتیانِ کرام کسی شخص کے بارے میں صحیح طور پر کفر کا فتویٰ دے رہے ہیں، ان پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن فتویٰ دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اس شخص کے ساتھ کیا معاملہ فرمائیں گے؟ وہ جنت میں جائے گا یا جہنم میں جائے گا؟ اگر وہ جہنم میں جائے گا تو وہاں پر ہمیشہ رہے گا یا اللہ تعالیٰ اس کو کسی وقت جہنم سے نکال دیں گے؟ یہ فیصلے ہم نہیں کر سکتے اور ان فیصلوں میں ہمیں پڑنا بھی نہیں چاہئے۔ کیا معلوم کہ ایک شخص ظاہری اعتبار سے کافر نظر آ رہا ہے، لیکن اس کے پاس کوئی ایسی تاویل ہو جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس پر فضل کا معاملہ فرما دیں۔ اس لئے کسی بھی انسان کو کسی بھی لمحے حقیر سمجھنا تکبر کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

بخل کی حقیقت ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ. وَعَلٰی آلِہٖ وَأَصْحَابِہٖ أَجْمَعِیْنَ. وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ. أَمَّا بَعْدُ!

بخل مال کی محبت کا نتیجہ ہے

مختلف باطنی بیماریوں کا بیان چل رہا ہے، یہاں سے حضرت والا نے ''بخل'' کا بیان شروع فرمایا ہے۔ یہ ''بخل'' بھی باطنی بیماریوں میں سے ایک بیماری ہے، جسے عرفِ عام میں کنجوسی کہتے ہیں۔ جب انسان کے دل میں مال کی اتنی محبت ہو جاتی ہے کہ پیسے ہاتھ سے جاتے ہوئے جان نکلتی ہے تو یہ بخل ہے۔ اور یہ بڑا مذموم وصف ہے۔ قرآن کریم میں جگہ جگہ اس کی مذمت وارد ہوئی ہے۔ اس بخل کے نتیجے میں انسان اپنے فرائض و واجبات میں غفلت برتتا ہے اور گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔

بخل کے نتائج

''بخل'' انسان کے اندر یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ جو مال آ گیا ہے، وہ اب کہیں نہ جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں شرعی اعتبار سے خرچ کرنا ضروری ہے، مثلاً زکوٰۃ ہے، مالی حقوقِ واجبہ ہیں، بیوی بچوں کا نفقہ ہے، ان میں بھی انسان پھر صحیح طور پر خرچ نہیں کرتا، بخل کا ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ بس کسی طرح بھی پیسہ میرے پاس آ جائے اور پھر اسی جذبہ کے تحت انسان جائز اور ناجائز کی پرواہ مٹا دیتا ہے۔ بس مال آ رہا ہے، اس کو آنے دو، چاہے وہ حلال طریقے سے آ رہا ہے یا حرام طریقے سے آ رہا ہے۔ اگر مال حرام طریقے سے آ رہا ہے اور وہ شخص مولوی بھی ہے تو اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس حرام مال کو کوئی تاویل کر کے حلال بنا لے، تاکہ یہ حرام مال جو آ رہا ہے یہ کسی طرح میرے پاس رہ جائے اور دوسرے کے پاس نہ جائے۔

☆ اصلاحی مجالس (۵/۴/۷۶ تا ۸۶)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

بخل دو دھاری تلوار ہے

لہٰذا یہ ''بخل'' ایک طرف حقوقِ واجبہ کی ادائیگی میں رکاوٹ بنتا ہے، دوسری طرف معصیتوں کے ارتکاب کا داعی بنتا ہے اور حرام طریقے سے مال اور پیسہ حاصل کرنے کی فکر انسان کے اندر پیدا کرتا ہے، اس لئے یہ ''بخل'' دو دھاری تلوار ہے، اِدھر سے بھی کاٹتی ہے اور دوسری طرف سے بھی کاٹتی ہے، گناہ میں بھی مبتلا کرتی ہے اور حقوقِ واجبہ اور فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی بھی کراتی ہے، اس لئے یہ بڑی خطرناک بیماری ہے اور اس کا علاج بڑا ضروری ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں انفاسِ عیسیٰ میں جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں، ان سے اس بیماری کے کچھ اصول معلوم ہو جاتے ہیں۔

کتاب البخلاء

اگر آدمی اس ''بخل'' کی تفصیلات اور جزئیات کو بیان کرے تو بات بڑی لمبی ہو جاتی ہے، چنانچہ علامہ جاحظ رحمۃ اللہ علیہ جو ایک ادیب آدمی ہے، اس نے اسی موضوع پر ''کتاب البخلاء'' کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جو دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں بخلاء کے حالات بیان کیے ہیں کہ دنیا میں کیسے کیسے بخیل ہوتے ہیں، کیا کیا ان کے اوصاف ہوتے ہیں اور ان بخلاء کے بڑے عجیب و غریب قصے لکھے ہیں۔ اس کتاب کے پڑھنے سے بخل کی اقسام کا پتہ چلتا ہے کہ کن کن دائروں میں ''بخل'' چلتا ہے اور کیا کیا اس کی صورتیں ہوتی ہیں اور یہ کس کس طرح سے انسان کو مارتا ہے۔ یہ کتاب ادب کا شاہکار ہے۔ اس کے علاوہ ''احیاء العلوم'' میں بھی امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ''بخل'' پر لمبی بحث کی ہے۔ لیکن یہاں ''انفاسِ عیسیٰ'' میں حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''بخل'' پر حضرت والا کے جو ارشادات نقل فرمائے وہ اتنے جامع ہیں کہ ایک صفحے میں اس بیماری کے بارے میں جو بنیادی اور اصل الاصول باتیں ہیں، وہ سب یہاں جمع فرما دی ہیں۔

ایک صاحب نے حضرت والا کو خط میں لکھا:

''پیسہ اُٹھاتے ہوئے قلب بہت تنگ ہو جاتا ہے''

حضرت والا نے جواب دیا:

''اگر کوئی حق واجب فوت نہ ہو تو کچھ غم نہیں''

اصلاح کا طریقہ اپنے عیوب کا اظہار کرنا ہے

جو اللہ کے بندے اپنی اصلاح کے لئے کسی شیخ سے رجوع کرتے ہیں تو پھر اپنی ایک ایک

بات اپنے شیخ کو لکھتے ہیں، کیونکہ شیخ سے رجوع کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ جو حالات تم اپنے اندر محسوس کر رہے ہو، وہ شیخ کو بتاؤ۔ پھر شیخ دیکھ کر بتائے گا کہ واقعۃً یہ کوئی بیماری ہے یا نہیں؟ اگر بیماری ہے تو شیخ اس کا علاج کرے گا۔ اگر تم نہیں بتاؤ گے تو شیخ کے پاس علمِ غیب تو ہے نہیں، اس لئے شیخ کو اپنے حالات بتانے پڑتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ انسان کے اندر اپنی اصلاح کی فکر عطا فرما دیتے ہیں تو پھر انسان کی نگاہ اپنے حالات اور اپنے عیوب کی طرف جانے لگتی ہے اور جب تک فکر نہیں ہوتی تو پھر غفلت کی حالت میں انسان کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے، صحیح رخ پر جا رہا ہوں یا غلط رخ پر جا رہا ہوں، دل میں جو خیالات آ رہے ہیں وہ صحیح ہیں یا غلط ہیں، بس کچھ پرواہ نہیں ہوتی، لیکن جب اللہ تعالیٰ فکر عطا فرماتے ہیں تو آدمی کے اندر ایک کھٹک پیدا ہو جاتی ہے۔

دل میں کھٹک پیدا ہونا

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ''تقویٰ'' کے معنی ہیں ''کھٹک'' یعنی دل میں یہ کھٹک پیدا ہو جائے کہ میں جو کام کر رہا ہوں یہ صحیح ہے یا غلط ہے؟ جو خیال میرے دل میں آ رہا ہے، یہ درست ہے یا غلط ہے، یہ کھٹک ہی کامیابی کی کلید ہے، کیونکہ جب کسی کام کے وقت دل میں کھٹک پیدا ہوئی اور پھر شیخ کو اس کھٹک کی اطلاع کر دی تو اب شیخ اس کا علاج بتا دے گا۔ اب دیکھئے! اس اللہ کے بندے کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی کہ جب میں کہیں پیسہ خرچ کرتا ہوں تو دل میں بہت تنگی ہوتی ہے اور دل دکھتا ہے کہ پیسہ جا رہا ہے، تو یہ کہیں بخل کی بیماری تو نہیں ہے، اگر یہ بیماری ہے تو شیخ سے اس کا علاج پوچھنا چاہئے۔

پیسے جانے کا غم گناہ نہیں

جواب میں حضرت والا نے لکھا کہ ''اگر کوئی حق واجب فوت نہ ہو تو کچھ غم نہیں''

مطلب یہ ہے کہ پیسے کے جانے سے دل میں جو غم ہو رہا ہے یا صدمہ ہو رہا ہے یا دکھ ہو رہا ہے، یہ صدمہ اور غم بذاتِ خود کوئی گناہ نہیں، کیونکہ یہ ایک غیر اختیاری معاملہ ہے، انسان کو اس پر اختیار نہیں اور اللہ تعالیٰ انسان کو کسی ایسے عمل پر سزا نہیں دیتے جو اس کے اختیار سے باہر ہو۔ ہاں! اگر یہ صدمہ اور غم کسی حق واجب کی ادائیگی میں رکاوٹ بن جائے، مثلاً زکوٰۃ فرض تھی، وہ ادا نہیں کی، صدقۃ الفطر واجب تھا، وہ نہیں دیا، بیوی بچوں کو جتنا نان ونفقہ دینا چاہئے تھا، اتنا نہیں دیا، کسی ملازم کو رکھا تھا، اس کے پورے حقوق نہیں دیئے اور اس غم اور صدمہ کے نتیجے میں حقِ واجب فوت ہو گیا تو یہ گناہ ہے۔

صرف مال کی محبت مضر نہیں

اور اسی حق واجب فوت ہونے میں یہ بات بھی داخل ہے کہ کسی معصیت کا ارتکاب کرلیا، مثلاً ناجائز اور حرام کام کے ذریعہ پیسے حاصل کرلیے، لہٰذا جب تک کسی حرام اور ناجائز کام کا ارتکاب نہ ہو تو محض دل کا تنگ ہو جانا گناہ کا سبب نہیں۔ اسی لئے جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر کوئی حق واجب فوت نہ ہو تو کچھ غم نہیں۔ کیونکہ بخل کے اصل معنی ہیں ''مال کی محبت'' اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ خود فرمارہے ہیں کہ میں نے تمہارے دل میں مال کی محبت ڈالی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ﴾(۱)

لوگوں کے لئے مرغوب چیزوں کی محبت مزین کردی گئی ہے، مثلاً عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ گھوڑے اور مویشی اور کھیتی، جب اللہ تعالیٰ نے محبت ڈالی ہے تو وہ محبت دل میں موجود ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ﴾(۲)

یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر بنیادی طور پر بخل کا مادہ پیدا کیا ہے۔ لہٰذا محض بخل کا مادہ ہونا کوئی گناہ اور قابلِ مؤاخذہ بات نہیں، البتہ قابلِ مؤاخذہ اس وقت ہے جب انسان اس محبت کو گناہ کے کاموں کے لئے استعمال کرے، یا وہ محبت انسان کو گناہ پر آمادہ کردے، یا حقِ واجب کو فوت کرنے پر آمادہ کردے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی دعا

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ جس وقت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایران فتح ہوا اور کسریٰ کا محل مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تو اس وقت مسجد نبوی میں سونے کے اتنے ڈھیر لگ گئے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس ڈھیر کے پیچھے چھپ گئے۔ سونے کے اس ڈھیر کو دیکھ کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے اللہ! ہم یہ نہیں کہتے کہ

---

(۱) آل عمران: ۱۴، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''لوگوں کے لئے ان چیزوں کی محبت خوشنما بنادی گئی ہے جو ان کی نفسانی خواہش کے مطابق ہوتی ہے، یعنی عورتیں، بچے، سونے چاندی کے لگے ہوئے ڈھیر، نشان لگائے ہوئے گھوڑے، چوپائے اور کھیتیاں''

(۲) النساء: ۱۲۸، آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے: ''اور انسانوں کے دل میں کچھ نہ کچھ لالچ کا مادہ تو رکھ ہی دیا گیا ہے''

ہمیں اس مال سے محبت نہیں ہے، نہ یہ دعا کرتے ہیں کہ یہ محبت بالکل ختم ہو جائے، البتہ ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ اس مال کی محبت آپ کے دین کے لئے فتنہ نہ بنے۔ یہ نہیں فرمایا کہ اس مال کی محبت ہمارے دل سے نکال دیجئے، کیونکہ یہ مال تو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے، اسی کو ''فضل اللہ'' فرمایا ہے، اسی مال کو ''خیر'' فرمایا ہے، اسی مال کو "جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا"(۱) فرمایا ہے، اس لئے اس مال کی نفرت مطلوب نہیں، بلکہ فی نفسہٖ یہ مال کام کی چیز ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کا قوام بنایا ہے، اس لئے نہ تو ہم اس مال کی نفرت مانگتے ہیں اور نہ اس کی محبت کا ازالہ مانگتے ہیں، ہاں! اے اللہ! ہم یہ مانگتے ہیں کہ یہ مال ہمیں معصیت پر آمادہ نہ کرے اور ہمارے دین کو کسی فتنہ میں مبتلا نہ کرے۔

مال کی کونسی محبت گناہ ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ طبعی طور پر دل میں مال کی محبت ہونا نہ گناہ ہے اور نہ مضر ہے، ہاں! اگر مال کی محبت اتنی زیادہ ہو جائے کہ وہ انسان کو صحیح جگہ پر خرچ کرنے سے روک دے تو وہ ''بخل'' ہے اور حرام ہے اور بیماری ہے۔ اب دیکھئے اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان صاحب کو تسلی دے دی کہ ''اگر حق واجب فوت نہ ہو تو کچھ غم نہیں'' لیکن یہ بات خوب سمجھ لیجئے کہ ہر انسان کے لئے ایک نسخہ نہیں ہوتا، طبیب اور معالج ہر مریض کے حالات دیکھ کر اس کے لئے نسخہ تجویز کرتا ہے، چنانچہ حضرت والا نے اس شخص کو دیکھا کہ یہ شخص حدِ اعتدال کے اندر ہے اور اعتدال سے آگے بڑھا ہوا نہیں ہے، اس لئے آپ نے اس کو تسلی دے دی اور کسی خطرے سے متنبہ نہیں فرمایا۔

یہ خطرہ کی گھنٹی ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جو مال کی محبت ہے اور مال خرچ کرتے ہوئے دل دکھ رہا ہے، یہ حالت مذموم تو نہیں اور نہ گناہ ہے، لیکن اس بات کا خطرہ ہے کہ یہ حالت کسی وقت آگے بڑھ کر ''بخل'' کی حد تک پہنچ جائے گی اور کسی بھی وقت حقِ واجب کو بھی ادا کرنے کا راستہ روک دے گی، لہٰذا جب مال خرچ کرنے سے دل دکھ رہا ہے تو یہ خطرہ کی گھنٹی ہے، اس خطرہ کی گھنٹی کا علاج یہ ہے کہ اس محبت کو ذرا پیچھے کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ یہ سرحد سے اتنی دور رہے کہ سرحد پار کر جانے کا احتمال نہ ہو۔ چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس محبت کو کم کرو یہاں تک کہ یا تو یہ دکھ بالکل ختم ہو جائے یا یہ کہ اتنا کم ہو جائے کہ وہ کالعدم ہو جائے، جب مشق کرو گے تو یہ حالت حاصل ہو جائے گی۔

---

(۱) النساء: ۵

دراہم، امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجے کے محدث ہیں، ان کے ایک شاگرد ہیں امام معمر بن راشد رحمۃ اللہ علیہ، وہ شاگرد امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

((مَا رَأَیْتُ أَحَدًا الدُّنْیَا أَھْوَنُ عِنْدَہٗ مِمَّا کَانَتْ عِنْدَ الزُّھْرِیِّ، کَانَتِ الدَّرَاھِمُ عِنْدَہٗ بِمَنْزِلَۃِ الْبِعْرِ))(۱)

''میں نے آج تک کوئی آدمی ایسا نہیں دیکھا جس کے دل میں دنیا اتنی بے وقعت ہو جتنی امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں بے وقعت تھی، دراہم ان کے نزدیک ایسے تھے جیسے مینگنیاں''

جیسے مینگنیوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، اسی طرح ان کے نزدیک دراہم کی بھی کوئی قیمت نہیں تھی، یعنی دراہم کی طرف کوئی التفات ہی نہیں تھا، کوئی محبت ہی نہیں تھی۔

میاں جی نور محمد رحمۃ اللہ علیہ اور دنیا

حضرت میاں جی نور محمد جھنجانوی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات میں لکھا ہے کہ جب بازار جا کر کوئی چیز خریدتے تو پیسوں کی تھیلی دکاندار کو دے دیتے اور کہتے کہ تم اس چیز کی قیمت اس تھیلی میں سے لے لو، خود گن کر نہیں دیتے تھے اور یہ سوچتے کہ جتنا وقت تھیلی میں سے پیسے نکال کر گننے میں صرف ہوگا، اتنا وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر میں کیوں نہ صرف کیا جائے۔ کسی چور نے دیکھ لیا کہ ان کے پاس پیسوں کی تھیلی ہے، چنانچہ وہ تھیلی کندھے پر لٹکائے جا رہے تھے کہ چور پیچھے سے آیا اور تھیلی لے کر بھاگ گیا، انہوں نے کوئی مزاحمت ہی نہیں کی، وہ تھیلی چھوڑ دی اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کون چھین کر لے جا رہا ہے۔

اب وہ چور تھیلی لے کر ان کے علاقے سے باہر نکلنا چاہتا ہے مگر اس کو راستہ ہی نہیں ملتا، وہ گلیاں اس کے لئے بھول بھلیاں بن گئیں، اب پریشانی کے عالم میں کبھی ایک گلی میں داخل ہوتا اور کبھی دوسری گلی میں داخل ہوتا، مگر باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا، آخر میں اس کو خیال آیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اس اللہ کے ولی کے ساتھ زیادتی کرنے کا وبال ہے، چنانچہ وہ چور میاں جی کے گھر پر پہنچا اور دروازے پر دستک دی، انہوں نے اندر سے پوچھا کہ کون ہے؟ چور نے کہا کہ یہ اپنی تھیلی لے لو۔ میاں جی نے فرمایا کہ میں یہ تھیلی نہیں لیتا، اس لئے کہ جس وقت تو نے چھینی تھی، اسی وقت میں

---

(۱) طرح التشریب (۲۳۸/۱)

نے تجھے صدقہ کر دی تھی، لہٰذا اب یہ تھیلی میری ملکیت نہیں رہی۔ وہ چور کہتا ہے کہ خدا کے لئے لے لو۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نہیں لیتا۔ آخر میں چور نے کہا کہ حضرت! مجھے نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا ہے، یہ دعا کر دو کہ راستہ مل جائے۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ اچھا چلا جا، میں دعا کرتا ہوں۔ چنانچہ وہ چور تھیلی لے کر چلا گیا۔

مال کی محبت سے ذرا پیچھے رہو

بہر حال! ایسے بھی اللہ تعالیٰ کے بندے ہوتے ہیں کہ ان کے دل سے مال کی محبت بالکل جاتی رہی، اب یا تو یہ صورتِ حال پیدا ہو جائے یا کم از کم مال کی محبت اتنی کم ہو جائے کہ وہ خطرے کی حد سے دور ہو جائے۔ اس وجہ سے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مال کی محبت سے ذرا پیچھے رہو۔ اس بارے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے دو باتیں بیان فرمائیں۔

اس کیفیت کو برا سمجھو اور دعا کرو

ایک یہ کہ جب تم یہ محسوس کرو کہ پیسوں کے جانے سے دل دکھ رہا ہے اور دل میں تنگی ہو رہی ہے تو ایک کام یہ کرو کہ دل کی اس کیفیت کو برا سمجھو کہ یہ کوئی اچھی کیفیت نہیں۔ دوسرا کام یہ کرو کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ! یہ مال کی محبت کا سانپ کہیں مجھے ڈس نہ لے اور کسی وقت میرے لئے مصیبت نہ بن جائے، لہٰذا یا اللہ! میری اس مال کی محبت کو اعتدال سے بڑھنے سے روک دیجئے اور حد کے اندر رکھئے۔ یہ دعا کرتے رہو گے تو انشاء اللہ تعالیٰ پھر یہ محبت نقصان دہ نہیں ہوگی۔

آپ نے اس کو تسلی دے دی

البتہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں اس شخص کو تسلی دے دی کہ یہ دکھ اور تکلیف بری اور ناجائز نہیں اور اس شخص کو اس دکھ پر متنبہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس شخص کی خصوصیت تھی، آپ جانتے تھے کہ یہ شخص مال کی محبت میں آگے بڑھنے والا نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس کو تسلی نہ دیتے بلکہ اس کو متنبہ فرماتے کہ یہ دکھ ہونا تو بڑی خطرناک بات ہے، اس کی فکر کرو۔ شیخ کا اصل کام ہی یہ ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ کس شخص کو کس وقت کیا نسخہ دیا جائے۔

یہ حبِ مال نہیں، حبِ اعتدال ہے

ایک اور صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا:

''خرچ کرنے میں فی الجملہ گرانی معلوم ہوتی ہے، ناداری اور قرض کرنے سے خوف رہتا ہے، گو حقوق واجبہ میں کوتاہی نہیں کرتا''

جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''یہ حبِ مال نہیں، حبِ اعتدال ہے''(۱)

ایک صاحب نے لکھا کہ جب میں پیسے خرچ کرتا ہوں تو دل میں گرانی ہوتی ہے اور خرچ کرتے ہوئے یہ خوف رہتا ہے کہ کہیں بالکل ہی نادار نہ ہو جاؤں اور پھر قرض لینا پڑ جائے، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ حقوقِ واجبہ کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتا۔ جواب میں حضرت والا نے فرمایا کہ یہ حبِ مال نہیں بلکہ حبِ اعتدال ہے، کیونکہ جب حقوقِ واجبہ میں کوتاہی نہیں ہو رہی ہے تو پھر جو مقصود تھا وہ حاصل ہے، وہ حبِ مال جو مذموم ہے اور جو بیماری ہے اور گناہ ہے، وہ اس میں حاصل نہ ہوا، اس لئے یہ مذموم نہیں۔ البتہ پھر بھی آدمی کو چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی محبت رفتہ رفتہ آدمی کو گناہ میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۹۰

بخل کا علاج ☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ. وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ. وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ. أَمَّا بَعْدُ!

ہر کام اللہ تعالیٰ کے لئے ہونا چاہئے

باطن کی جو بیماریاں انسان کے لئے مہلک ہوتی ہیں، ان کا بیان چل رہا ہے، ان بیماریوں میں سے ایک بیماری ''بخل'' ہے جس کی تھوڑی سی تفصیل گزشتہ کل عرض کی تھی۔ اسی سلسلے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ارشاد ہے:

> ''مَنْ أَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ (۱) اس میں ''اعطاء'' اور ''منع'' دونوں کے ساتھ ''لِلّٰه'' کی قید ہے، جس سے معلوم ہوا کہ سخاوت مطلقاً محمود نہیں اور نہ بخل مطلقاً مذموم ہے بلکہ اگر خدا کے لئے ہوں تو دونوں محمود ورنہ دونوں مذموم، غرض اخلاق سب فطری وجبلی ہیں اور درجہ فطرت میں کوئی خلق نہ مذموم ہے اور نہ محمود بلکہ مواقع استعمال سے ان میں مدح وذم آجاتی ہے''(۲)

''بخل'' مطلقاً مذموم نہیں

''بخل'' کے معنی ہیں ''مال کو خرچ کرنے سے روکنا'' اس کے مقابلے میں سخاوت ہے، اس

☆ اصلاحی مجالس (۸۹/۵ تا ۱۰۸)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

(۱) پوری حدیث کے الفاظ کچھ یوں ہیں: ((مَنْ أَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ وَأَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ إِيْمَانَهُ)) ''جس نے اللہ کے لئے عطا کیا، اللہ کے لئے دینے سے روکا، اللہ کے لئے محبت کی اور اللہ کے لئے دشمنی رکھی، اس نے ایمان کی تکمیل کرلی'' سنن الترمذی، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم: ۲٤٤٥، سنن أبي داود، كتاب السنة، باب الدليل على زيادة الايمان ونقصانه، رقم: ٤٠٦١، مسند أحمد، مسند معاذ بن جبل، رقم: ١٥٠٦٤

(۲) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۹۰

کے معنی ہیں ''کھلے دل سے مال خرچ کرنا اور دل تنگ نہ کرنا'' اس کو سخاوت کہتے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بخل مذموم ہے یعنی بری بات ہے اور سخاوت اچھی بات ہے اور قابلِ تعریف بات ہے۔ اس ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا کہ یہ تصور درست نہیں، نہ تو ہمیشہ مال کو روکنا برا ہے اور نہ ہمیشہ مال کو خرچ کرنا اچھا ہے، بلکہ بعض اوقات مال کو روکنا بھی اچھا ہوتا ہے، قابلِ تعریف اور قابلِ ثواب ہوتا ہے، اور بعض اوقات مال کا خرچ کرنا بھی اچھا نہیں ہوتا بلکہ گناہ ہوتا ہے یا کم از کم مذموم ہوتا ہے۔

صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مال خرچ کرو

دلیل میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پیش کی کہ آپ نے اس حدیث میں اصول بیان فرمادیا:

((مَنْ أَعْطٰی لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ))(۱)

حدیث میں اور الفاظ بھی ہیں مگر یہاں صرف انہی الفاظ کو پیش کرنا مقصود ہے، اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص اللہ کے لئے دے اور اللہ کے لئے روکے، اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔ یعنی جب دے رہا ہے تو اللہ کے لئے دے رہا ہے اور اگر روک رہا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے روک رہا ہے۔ دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہاں بھی خرچ کر رہا ہے، چاہے وہ غریبوں، مسکینوں اور ضرورت مند لوگوں کو صدقہ دے رہا ہو، زکوٰۃ دے رہا ہو، یا اپنے بیوی بچوں کا نفقہ ادا کر رہا ہو، یا ان کے لئے کھانے پینے کا انتظام کر رہا ہو، یا اپنے نفس پر خرچ کر رہا ہو، لیکن ان سب جگہوں پر خرچ کرنے میں اللہ جل شانہ کی رضا مقصود ہو، مثلاً اگر فقیر کو پیسے دے رہا ہے تو اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہے، دکھاوا مقصود نہیں، بیوی بچوں پر خرچ کر رہا ہے تو یہ سوچ کر خرچ کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حقوق میرے ذمے وابستہ فرمائے ہیں، لہٰذا میں ان کے حقوق کی ادائیگی کا مکلف ہوں اور میں اپنے اس فریضے کو ادا کر رہا ہوں، تو یہ خرچ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہوگیا اور ''من أعطٰی لِلّٰہ'' میں داخل ہے۔

اپنی ذات پر خرچ کرنا بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہے

اسی طرح جو کچھ خود کھا رہا ہے، اس میں بھی اس کی یہ نیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نفس جو دیا ہے، یہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور اس نفس کا بھی میرے اوپر حق ہے، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول الله صلی الله علیه وسلم، رقم: ۲٤٤٥، سنن أبی داؤد، کتاب السنة، باب الدلیل علی زیادة الایمان ونقصانه، رقم: ٤٠٦١، مسند أحمد، مسند معاذ بن جبل، رقم: ١٥٠٦٤

نے فرمایا:

((إِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا))(۱)

''تیرے نفس کا بھی تیرے اوپر حق ہے''

اب اگر میں اس نفس کو نہیں کھلاؤں گا اور بھوک کی وجہ سے یہ مر جائے گا تو یہ خودکشی ہوگی اور حرام موت ہوگی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نفس کا مجھ پر حق رکھا ہے۔ لہٰذا میں جو کچھ اس نفس کو کھلا رہا ہوں، یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے کھلا رہا ہوں۔ یہ سب ''مَنْ اَعْطٰی لِلّٰہِ'' میں داخل ہے۔

بازار سے چیز خریدنا اللہ تعالیٰ کے لئے ہے

اگر بازار میں کوئی چیز خرید رہا ہے تو بظاہر اپنے نفع کے لئے وہ چیز خرید رہا ہے، لیکن مآل کار یا تو وہ چیز اپنے نفس کے لئے خرید رہا ہوگا یا اپنے بیوی بچوں کے لئے خرید رہا ہوگا یا کسی محتاج اور ضرورتمند کو دینے کے لئے خرید رہا ہوگا، ان تینوں باتوں میں کوئی ایک بات ضرور ہوگی اور ان تینوں باتوں میں سے ہر بات ایسی ہے کہ جس میں صحیح نیت کر لینے سے وہ عمل اللہ تعالیٰ کے لئے بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا دین دیا ہے جو ''ہم خرما و ہم ثواب ہے'' کہ کام تو اپنے لئے یا اپنے بیوی بچوں کے لئے کر رہے ہو لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ذرا سا زاویۂ نگاہ بدلو تو یہ سب کام میرے لئے ہو رہا ہے اور ''مَنْ اَعْطٰی لِلّٰہِ'' میں داخل ہے۔

بیوی کے منہ میں لقمہ دینا اللہ تعالیٰ کے لئے ہے

اسی لئے حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((حَتَّى اللُّقْمَةَ الَّتِيْ تَرْفَعُهَا إِلٰى فِيْ امْرَأَتِكَ وَهِيَ صَدَقَةٌ))(۲)

''جو ایک لقمہ تم اُٹھا کر اپنی بیوی کے منہ میں دیتے ہو، یہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک صدقہ کے حکم میں ہے''

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الزھد عن رسول اللہ، باب منہ، رقم: ۲۳۳۷، سنن أبی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب ما یؤمر بہ من القصد فی الصلاۃ، رقم: ۱۱۶۲، مسند أحمد، رقم: ۲۵۱۰۴۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب النفقات، باب فضل النفقۃ علی الأھل، رقم: ۴۹۳۵، سنن الترمذی، کتاب الوصایا عن رسول اللہ، باب ما جاء فی الوصیۃ بالثلث، رقم: ۲۰۴۲، سنن أبی داؤد، کتاب الوصایا، باب ما جاء فی ما لا یجوز للموصی فی مالہ، رقم: ۲۴۸۰، مسند أحمد، رقم: ۱۳۹۹

یہ دین جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے، یہ مٹی کو سونا بنانے والا ہے۔ کھانا اپنے فائدہ کے لئے کھایا جارہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم یہ لکھ لیتے ہیں کہ یہ کھانا تم نے ہمارے لئے کھایا ہے، لہٰذا تمہارے اس عمل کو بھی تمہارے نیک اعمال میں اور ثواب والے اعمال میں درج کر لیتے ہیں۔ آخرت میں جو نیکیوں کا حساب ہوگا تو یہ کھانا پینا بھی تمہارے نیک اعمال کے اکاؤنٹ میں داخل ہو چکا ہوگا۔

یہ روکنا اللہ تعالیٰ کے لئے ہے

حدیث میں دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا "مَنَعَ لِلّٰہِ" اگر روکے تو اللہ تعالیٰ کے لئے روکے، یعنی ایک جگہ پر پیسے دینے کا موقع آیا لیکن پیسے نہیں دیئے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے لئے روک لیا۔ مثلاً مجمع عام میں کسی کام کے لئے چندہ ہو رہا تھا اور ہر شخص آگے بڑھ کر چندہ دے رہا تھا، تمہارے دل میں یہ خیال آیا کہ چندہ دینے کو دل تو نہیں چاہ رہا ہے، لیکن سب لوگ تو بڑھ چڑھ کر دے رہے ہیں، اگر میں نہیں دوں گا تو ناک کٹ جائے گی اور مجمع کے اندر بدنامی ہوگی کہ سب لوگ تو دے رہے ہیں اور یہ کنجوس بیٹھا ہے، لوگ مجھے کنجوس اور بخیل کہیں گے، اس خیال کے آنے پر چندہ دینے کا ارادہ کر لیا اور جیب سے پیسے نکال لیے، پھر خیال آیا کہ اگر اس وقت میں چندہ دوں گا تو یہ دکھاوے کا چندہ ہوگا، اللہ تعالیٰ کے لئے نہ ہوگا، اس طرح چندہ دینا تو جائز نہیں اور اس پر ثواب بھی نہیں، چنانچہ دوسرا خیال آنے کے بعد وہ پیسے واپس جیب میں رکھ لیے، اب یہ واپس رکھ لینا اور چندہ نہ دینا "مَنَعَ لِلّٰہِ" میں داخل ہے۔ اس لئے کہ یہ روکنا اللہ تعالیٰ کے لئے ہوا، اس نے سوچا کہ چاہے دنیا مجھے بخیل کہے چاہے کنجوس کہے، لیکن چونکہ اس وقت دینا جائز نہیں ہے، اس لئے میں نے روک لیا، لہٰذا یہ بھی "مَنَعَ لِلّٰہِ" ہوگیا۔

شادی بیاہ کے موقع پر دینا

آج کل شادی بیاہ کے موقع پر جو ہدیے اور تحفے دیئے جاتے ہیں اور اس میں باقاعدہ لکھت پڑھت ہوتی ہے کہ کس شخص نے کس کی شادی کے موقع پر کتنا دیا تھا، اب دوسرا شخص اس سے بڑھا کر دے یا برابر کر کے دے، یہ سب "نیوتہ" ہے جس کو قرآن کریم نے حرام کہا ہے، لہٰذا ایسے موقع پر مت دو۔ ہاں! اگر دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ یہ میرا بھائی ہے اور اس کے گھر میں خوشی ہے، میرے اندر سے دل میں یہ داعیہ پیدا ہو رہا ہے کہ میں اس کو ہدیہ اور تحفہ پیش کروں۔ سبحان اللہ! بڑی اچھی بات ہے، تحفہ اور ہدیہ پیش کر دو، لیکن اگر ہدیہ اور تحفہ دینے کو دل تو نہیں چاہ رہا ہے، اس لئے کہ پیسے کی تنگی ہے یا اس سے کوئی خاص قریبی تعلق بھی نہیں ہے، مگر چونکہ اس شخص نے میری فلاں تقریب میں اتنے

پیسے دیئے تھے، لہٰذا اس شخص کی تقریب میں مجھے دینا ضروری ہوگیا، یا یہ کہ اگر میں کوئی ہدیہ تحفہ نہیں دوں گا تو سارے معاشرے میں نکوں بن جاؤں گا اور سب لوگ یہ کہیں گے کہ یہ اتنا کنجوس آدمی ہے کہ چاہے کسی کی شادی بیاہ ہو یا کوئی تقریب ہو، مگر اس کی جیب سے پیسے نہیں نکلتے، یہ سوچ کر تحفہ یا ہدیہ دیا، ایسا ہدیہ تحفہ دینا حرام اور ناجائز ہے۔

یہ صورت "مَنَعَ لِلّٰہِ" میں داخل ہے

اور اگر اس نے یہ سوچا کہ کوئی مجھے کنجوس کہتا ہے تو کہے، کوئی بخیل کہتا ہے تو کہے، کوئی مجھے غیر مہذب کہتا ہے تو کہے، کوئی مجھے ناشائستہ کہتا ہے تو کہے، مجھے تو اپنے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے میں نہیں دیتا۔ یہ نہ دینا "مَنَعَ لِلّٰہِ" میں داخل ہے۔ یا اس شخص کو معلوم ہے کہ میں اگر فلاں شخص کو پیسے دوں گا تو وہ اس کو ناجائز اور غلط کاموں میں استعمال کرے گا، ایسے شخص کو ہدیہ تحفہ یا پیسے دینا درست نہیں، یہ سوچ کر اس نے پیسے نہیں دیئے، یہ صورت بھی "مَنَعَ لِلّٰہِ" میں داخل ہے۔

دوسروں کو دینا جائز طریقے پر ہونا چاہئے

اس لئے اس ملفوظ میں حضرت تھانویؒ فرما رہے ہیں کہ نہ تو دینا ہمیشہ اچھا ہے اور نہ ہی روکنا ہمیشہ برا ہے بلکہ اس کا دار و مدار نیت اور حالات پر ہے، بعض اوقات دینا برا ہے جیسا کہ ابھی چند مثالیں پیش کیں اور بعض حالات میں روکنا ثواب ہے، اصل مدار اس پر ہے کہ دینا مشروع طریقے پر ہو رہا ہے یا نہیں؟ اور یہ دینا اللہ تعالیٰ کے لئے ہو رہا ہے یا نہیں؟ مشروع طریقے پر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دینا شریعت کے مطابق ہے یا نہیں؟ جہاں شریعت کے خلاف دیا جا رہا ہے وہ دینا بیکار ہے۔ اور دیتے وقت نیت اللہ جل شانہٗ کو راضی کرنے کی ہو، دکھاوے اور نام و نمود کی نیت نہ ہو، جب دو شرطیں پائی جائیں گی تو دینا ثواب ہوگا اور جب یہ دونوں شرطیں روکنے میں پائی جائیں گی تو روکنا ثواب ہوگا۔

مال کی طرف میلان فطری ہے

حدیث میں فرمایا کہ جو شخص یہ کام کرلے اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔ ایسے شخص کو اتنی بڑی بشارت یعنی تکمیلِ ایمان کی بشارت دی جا رہی ہے۔ بہر حال! اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سخاوت مطلقاً محمود نہیں اور نہ بخل مطلقاً مذموم ہے بلکہ اگر خدا کے لئے ہوں تو دونوں محمود اور قابلِ تعریف ہیں اور اگر خدا کے لئے نہ ہوں تو دونوں مذموم ہیں۔ غرض اخلاق سب فطری اور جبلی ہیں اور درجہ فطرت

میں کوئی خلق نہ مذموم ہے اور نہ محمود۔ جیسا کہ کل عرض کیا تھا کہ محض یہ بات کہ دل میں مال کی محبت ہے یا جب ہاتھ سے پیسے جاتے ہیں تو دل میں تنگی پیدا ہوتی ہے، محض یہ باتیں انسان کی طبیعت کا حصہ ہیں، اس لئے کہ فطری طور پر انسان کی طبیعت مال کی طرف مائل ہوتی ہے، ''مال'' کی تعریف ہی یہ ہے کہ ''مَا يَمِيْلُ إِلَيْهِ الطَّبْعُ'' یعنی جس کی طرف طبیعت مائل ہو، لہٰذا مال کی طرف دل کا مائل ہونا فطرت کا ایک حصہ ہے۔

مال کی محبت کا صحیح استعمال اور غلط استعمال

اب اگر اس مال کی محبت کو جائز طریقے سے استعمال کیا تو اس میں کچھ حرج نہیں، مثلاً مال کی محبت میں تم نے حلال طریقے سے روزی کمانے کا اہتمام کیا اور اس میں اس بات کی بھی فکر کی کہ حلال طریقے سے جتنا زیادہ سے زیادہ مجھے مل جائے، تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اسی طرح جو تجارت، زراعت اور ملازمت وغیرہ ہے، یہ سب مال کی محبت کی وجہ سے کر رہے ہو، چونکہ مال کی محبت کو تم نے ایک جائز اور مباح کام میں استعمال کیا تو یہ مال کی محبت بری نہ ہوئی اور اس محبت نے تمہارے اوپر کوئی برا اثر نہیں چھوڑا، لیکن اگر مال کی محبت کو تم نے ناجائز کاموں میں استعمال کیا کہ ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنا شروع کر دیا اور مواقع واجبہ پر خرچ کرنے سے مال کو روک دیا تو یہ مال کی محبت کا غلط استعمال ہوا۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ مال کی محبت اپنی ذات میں نہ محمود ہے اور نہ مذموم ہے، لیکن اگر اس محبت کو صحیح استعمال کرو گے تو ٹھیک ہوگی اور اگر غلط استعمال کرو گے تو غلط ہوگی۔ البتہ جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس محبت کو ذرا کم رکھو، بالکل سرحد پر نہ کھڑے ہو جانا ورنہ اگلا قدم تمہیں گناہ کے اندر مبتلا کر دے گا، اس لئے اس مال کی محبت کو کم کرنے کی کوشش کرو۔

دوسروں کی چیزوں کا استعمال کب جائز ہے؟

ایک اور ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''اگر دل گواہی دے کہ میرا بدون اذن کے کھانا اس شخص کو ناگوار نہ ہوگا بلکہ خوش ہوگا، وہاں بدون اذن کے بھی کھانا جائز ہے بلکہ چھین کر بھی کھا سکتا ہے بشرطیکہ وہ دوست سخی ہو بخیل نہ ہو، کیونکہ بخیل کو کسی سے محبت نہیں ہوتی، اگر ہوتی بھی ہے تو مال کے برابر نہیں، اس لئے بخیلوں کی اجازت بھی مشکوک ہے، ہاں سخی دوستوں سے اگر پوری بے تکلفی ہو تو چھین کر بھی کھانا جائز ہے''(۱)

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۹۰

اصل حکم یہ ہے کہ کسی بھی شخص کی کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر استعمال کرنا حلال نہیں، حدیث شریف میں ہے:

((لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسِهٖ مِنْهُ))(۱)

اس حدیث سے پتہ چلا کہ دوسرے شخص کی چیز کے استعمال کے لئے صرف اجازت ہی نہیں بلکہ خوشدلی سے اجازت دے تب تو استعمال کرنا جائز ہے ورنہ جائز نہیں۔

بلا اجازت بلکہ چھین کر کھانا

حضرت والا اس ملفوظ میں فرما رہے ہیں کہ بعض لوگوں سے ایسی بے تکلفی کا تعلق ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں سو فیصد پکا یقین ہوتا ہے کہ اگر میں اس کی کوئی چیز اُٹھا کر کھالوں گا تو اس کو ناگوار تو کجا بلکہ یہ خوش ہوگا، ایسی صورت میں صریح لفظوں میں اجازت لینے کی ضرورت بھی نہیں، کیونکہ معلوم ہے کہ یہ شخص خوش ہوگا، بلکہ ایسی صورت میں چھین کر کھانا بھی جائز ہے، مثلاً وہ شخص کوئی چیز کھا رہا ہے، آپ نے جھپٹا مار کر اس سے وہ چیز چھین کر کھالی تو یہ بھی جائز ہے، اس لئے کہ چھیننے سے وہ دوست ناراض کیا ہوتا بلکہ اور خوش ہوگا اور اس کو راحت ہوگی، بلکہ ہوسکتا ہے کہ ظاہری اعتبار سے وہ روکنے کی بھی کوشش کرے، لیکن وہ دوست سے راضی اور خوش ہوگا کہ اگر یہ چیز میرا دوست کھالے تو اچھا ہوگا، جب یہ یقین ہو تو چھین کر بھی لے لو تو بھی کوئی حرج نہیں۔

خوش دلی کا یقین ہونا ضروری ہے

لیکن خوش دلی کا یقین واقعی ہونا چاہئے، یہ نہیں کہ اپنی طرف سے فرض کر کے بیٹھ گئے کہ ہمارے کھانے سے اس کو خوش ہونا چاہئے، لہٰذا میں کھاؤں گا تو میرے لئے یہ کھانا جائز ہوگا، یہ کافی نہیں، بلکہ اس کے سابقہ طرزِ عمل سے یہ بات واضح ہو کہ میرے کھانے سے خوش ہوتا ہے، تب تو اس کی چیز چھین کر کھالو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مشکیزہ سے منہ لگا کر پانی پینا

فقہاء کرام کو دیکھئے کہ وہ کس کس طرح احادیثِ نبویہ سے مسائل مستنبط فرماتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ جس وقت مکہ مکرمہ فتح ہوا اور فتح کے بعد آپ مسجد حرام میں داخل ہوئے تو مسجد حرام

(۱) مسند أحمد، أول مسند البصريين، رقم: ۱۹۷۷٤، حدیث مبارک کا ترجمہ یہ ہے: ’’کسی مسلمان کا مال اس کی دلی اجازت کے بغیر استعمال کرنا جائز نہیں‘‘

کے برابر میں حضرت اُم ہانی رضی اللہ عنہا کا گھر تھا۔ حضرت اُم ہانی رضی اللہ عنہا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی چچازاد بہن تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حقیقی بہن تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے گھر میں جا کر کچھ دیر آرام فرمایا۔ ان کے گھر میں ایک پانی کا مشکیزہ لٹکا ہوا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشکیزہ سے منہ لگا کر پانی پیا۔(۱)

پانی کی ملکیت کا شرعی حکم

اس حدیث سے فقہاء کرام نے کم از کم دو درجن احکام مستنبط فرمائے ہیں، جب کوئی حدیث فقہاء کرام تک پہنچتی تھی تو فقہاء کرام خوردبین لگا کر بیٹھ جاتے اور یہ دیکھتے کہ اس حدیث سے اُمت کی رہنمائی کے لئے کیا کیا احکام نکل رہے ہیں۔ بہر حال! وہ مکان جس میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے وہ اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا کا تھا اور وہ مشکیزہ بھی انہی کا تھا، اور پانی کا قاعدہ یہ ہے کہ جب تک وہ پانی دریا یا سمندر یا بڑے تالاب میں ہے تو وہ پانی سب کے لئے مباح عام ہے کہ جو شخص جتنا چاہے پانی حاصل کرلے، لیکن اگر کوئی شخص وہاں سے پانی لے کر اپنے گھر میں لے آیا اور مشکیزے میں یا مٹکے میں رکھ لیا تو اب وہ پانی اس کی ملکیت ہوگیا، اب وہ اس پانی کو فروخت بھی کرسکتا ہے، خود بھی استعمال کرسکتا ہے، دوسرے کو ہدیۃً اور تحفۃً بھی دے سکتا ہے اور دوسرے کو حلال نہیں کہ اس کی اجازت کے بغیر وہ پانی پیئے، یہ شرعی حکم ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بلا اجازت پانی پینا جائز تھا

چنانچہ فقہاء کرام نے اس حدیث میں یہ سوال اُٹھایا کہ یہ مشکیزہ حضرت اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا کا تھا، لیکن حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اجازت کے بغیر اس مشکیزے سے پانی پی لیا، یہ پانی پینا آپ کے

---

(۱) محدثین کی ذکر کردہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر حضرت اُم ھانی رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے تھے اور وہاں چاشت کی نماز ادا فرمائی تھی۔ صحیح البخاری، كتاب الجمعة، باب صلاة الضحى في السفر، رقم: ١١٠٥، صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب استحباب صلاة الضحى وأن أقلها ركعتان، رقم: ١١٨٠، سنن الترمذي، كتاب الصلاة، باب ماجاء في صلاة الضحى، رقم: ٤٣٦، جبکہ دوسری طرف حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی والدہ اُم سلیم رضی اللہ عنہا کی روایت ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکیزہ کے ساتھ منہ مبارک لگا کر پانی پیا، حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ((أن رسول الله صلى الله دخل عليها وفي بيتها قربة معلقة قالت فشرب من القربة قائما قالت فعمدت إلى فم القربة فقطعتها)) مسند أحمد، رقم: ٢٥٨٦٦، گویا کہ حضرت اُم ہانی رضی اللہ عنہا کی روایت میں فتح مکہ کا ذکر ہے اور حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہا کی روایت میں کھڑے ہوکر مشکیزہ سے پانی پینے کا ذکر ہے۔

لئے کیسے جائز ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بغیر اجازت آپ کے لئے پینا اس لئے جائز ہوا کہ اگر چہ صریح لفظوں میں تو اجازت آپ نے ان سے نہیں لی، لیکن آپ ﷺ جانتے تھے کہ اگر میں اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر کی کوئی بھی چیز استعمال کروں گا تو وہ اپنے استعمال کرنے سے بھی زیادہ خوش ہوں گی، اس وجہ سے حضورِ اقدس ﷺ کے لئے ان کی اجازت کے بغیر ان کے مشکیزے سے پانی پینا جائز ہوگیا۔

قوم کی کوڑی کو پیشاب کے لئے استعمال کرنا

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ کسی جگہ سے گزر رہے تھے، وہاں پر اس قوم کا کوڑا دان تھا، لوگ اپنے گھروں کا کوڑا وہاں ڈالا کرتے تھے، اس کوڑے کے ڈھیر کے پاس جا کر آپ ﷺ نے پیشاب فرمایا۔(۱)

فقہاء کرام نے یہاں بھی یہ سوال اُٹھایا کہ یہ تو ایک قوم کی "کوڑی" تھی، آپ ﷺ نے ان کی اجازت کے بغیر اس کوڑی کو پیشاب کرنے کے لئے کیسے استعمال فرمایا؟ پھر اس کا جواب دیا کہ حضور ﷺ نے اس وجہ سے استعمال کیا کہ وہ کوڑی کی جگہ مباح عام تھی اور حدیث کے الفاظ "سُباطة قوم" میں لفظ "سُباطة" کی لفظ قوم کی طرف اضافت "اضافتِ مِلک" نہیں بلکہ یہ اضافت بادنیٰ ملابست ہے اور بعض حضرات فقہاء نے یہ جواب دیا کہ وہ "کوڑی" اگر چہ قوم کی ملکیت تھی، مگر قوم کا کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں تھا کہ وہ حضورِ اقدس ﷺ کے استعمال کرنے سے ناگواری محسوس کرتا، لہٰذا قوم کی اجازت متعارفہ موجود تھی۔

سلام کے جواب کے لئے تیمّم کرنا

ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ راستے میں تشریف لے جارہے تھے، ایک شخص نے راستے میں آپ ﷺ کو سلام کیا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"۔ آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب دینا چاہا لیکن آپ اس وقت وضو سے نہیں تھے، قریب ہی کسی شخص کے گھر کی دیوار تھی، آپ نے اس گھر کی دیوار پر ہاتھ مار کر تیمّم کیا اور پھر اس کے سلام کا جواب دیا "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" چونکہ سلام

---

(۱) صحيح البخاری، كتاب الوضوء، باب البول قائما وقاعدا، رقم: ۲۱۷، صحيح مسلم، كتاب الطهارة، باب المسح على الخفين، رقم: ٤٠٢، سنن الترمذی، كتاب الطهارة عن رسول الله، باب الرخصة فی ذلك، رقم: ۱۳، سنن النسائی، كتاب الطهارة، باب الرخصة فی ترك ذلك، رقم: ۱۸، سنن أبی داؤد، كتاب الطهارة، باب البول قائما، رقم: ۲۱، سنن ابن ماجه، كتاب الطهارة وسننها، باب ما جاء فی البول قائما، رقم: ۳۰۱، مسند أحمد، رقم: ۲۲۱۵۷

کے جواب میں اللہ تعالیٰ کا نام آ رہا تھا، اس لئے آپ ﷺ نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اللہ تعالیٰ کا نام بغیر وضو کے لیا جائے، اس لئے آپ نے تیمّم کر کے پھر جواب دیا۔(۱)

ایسا کرنا واجب اور ضروری نہیں تھا، محض اللہ تعالیٰ کے نام کے ادب کی خاطر تیمّم کر لیا۔ یہ بات یاد رکھئے کہ اگر کوئی شخص اس مقصد کے لئے تیمّم کر لے تو اس کے لئے اس تیمّم سے نماز پڑھنا جائز نہیں۔

تیمّم کے لئے دوسرے کی دیوار کا استعمال

اس حدیث پر فقہاء کرام نے پھر سوال اُٹھا دیا کہ یہ گھر تو کسی اور شخص کا تھا، اس شخص کے گھر کی دیوار کو اس کی اجازت کے بغیر تیمّم کرنے کے لئے کیسے استعمال فرمایا؟ پھر جواب دیا کہ کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جس کو اس بات سے ناگواری ہو کہ حضورِ اقدس ﷺ اس کے گھر کی دیوار کے ذریعہ تیمّم کر لیں۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اجازت متعارفہ کی وجہ سے اس دیوار کو استعمال فرمایا۔

دوسروں کی چیزوں کا استعمال شریعت کی نظر میں

ان واقعات کو بیان کرنے سے دراصل یہ بتلانا مقصود ہے کہ اسلامی شریعت اور اسلامی فقہ دوسرے شخص کی چیز کو استعمال کرنے کے معاملے میں کتنی حساس ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کے بارے میں بھی یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ آپ نے ان چیزوں کو مالک کی اجازت کے بغیر کیسے استعمال فرمایا۔ لیکن ہمارے یہاں معاملہ ایسا بنا ہوا ہے کہ حلال و حرام کی کچھ پرواہ نہیں، خاص کر جو لوگ ساتھ ساتھ رہتے ہیں، ان میں یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کی چیز استعمال کر لیتے ہیں اور اس کی فکر نہیں کہ دوسرے سے اجازت لی جائے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ حدیث کی رو سے صرف اجازت بھی کافی نہیں جب تک کہ وہ اجازت خوشدلی کے ساتھ نہ ہو۔

بخیل کی اجازت مشکوک ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ "بخیل" کی اجازت بھی مشکوک ہے، مثلاً

(۱) صحیح البخاری، کتاب التیمم، باب التیمم فی الحضر إذا لم یجد الماء وخاف فوت الصلاة، رقم: ۳۲۵، صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب التیمم، رقم: ۵۵٤، سنن النسائی، کتاب الطهارة، باب التیمم فی الحضر، رقم: ۳۰۹، سنن أبی داؤد، کتاب الطهارة، باب التیمم فی الحضر، رقم: ۲۷۸، مسند أحمد، رقم: ١٦٨٨٣

آپ نے کسی بخیل سے اس کی چیز کو استعمال کرنے کی اجازت لے لی، جب اس نے اجازت دی تو اس وقت اس کے دل پر آرے چل گئے، اس نے سوچا کہ اگر اجازت نہیں دوں گا تو بری بات ہوگی، اب اجازت دوں تو مشکل، نہ دوں تو مشکل، اس مصیبت میں آکر اس نے اجازت دے دی۔ اس بخیل کی یہ اجازت مشکوک ہے، معتبر نہیں، کیونکہ خوشدلی سے اجازت نہیں دی۔

بخیل سے حق واجب زبردستی لینا

لیکن یہاں ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے، وہ یہ کہ اگر ''بخیل'' زبردستی اپنے دل پر پتھر رکھ کر دباؤ میں آکر اجازت دیدے تو اس کے دو حال ہیں: ایک حال یہ ہے کہ اس ''بخیل'' نے دباؤ میں آکر اگر ایسی چیز کی اجازت دی ہے جو اس بخیل کے ذمے حق واجب تھا اور وہ بخیل دیتا نہیں تھا، لیکن آپ نے زبردستی کر کے اس سے اجازت لے لی تو اس صورت میں اس چیز کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

مثلاً بخیل کی بیوی ہے، اس بیوی کا نفقہ اس کے شوہر کے ذمے واجب ہے، اب وہ شوہر اپنے بخل کی وجہ سے بیوی کو نفقہ نہیں دیتا یا ضرورت سے کم دیتا ہے جس سے بیوی کا گزارہ نہیں ہوتا، اب بیوی نے مجمع کے اندر نفقہ کا مسئلہ اُٹھادیا اور مجمع کے دباؤ میں شوہر سے نفقہ کی اجازت حاصل کر لی، حالانکہ بیوی جانتی ہے کہ اجازت دیتے وقت اس کے دل پر سانپ لوٹ رہے ہوں گے، بہر حال! شوہر نے مجمع کے دباؤ میں آکر اجازت دے دی، لیکن چونکہ بیوی کا حق شوہر کے ذمے واجب تھا، لہٰذا اگر اس شوہر نے زبردستی خوشدلی کے بغیر بھی اجازت دے دی تب بھی بیوی کے لئے نفقہ لینا حلال ہے، بلکہ ایسی حالت میں بیوی کے لئے اجازت کے بغیر بھی حلال ہے۔

شوہر کے مال سے بیوی کو خرچہ لینا

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی ''ہندہ'' تھیں، وہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور کہا:

"يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّ أَبَا سُفْيَانَ رَجُلٌ مُمْسِكٌ"

''میرے شوہر پیسے روک روک کر استعمال کرنے کے عادی ہیں''

میرا گزارہ نہیں ہوتا، میری اولاد کو اور مجھے خرچ نہیں دیتے، کبھی کبھار وہ اپنا روپیہ پیسہ گھر میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں تو کیا میں ان کے علم کے بغیر ان کے پیسوں میں سے لے لیا کروں؟ جواب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((خُذِيْ مَا يَكْفِيْكِ وَوَلَدَكِ بِالْمَعْرُوْفِ))
''جتنا تمہارے اور تمہاری اولاد کے نفقہ کے لئے ضروری ہے، اتنا لے لیا کرو، اس میں کچھ حرج نہیں''(۱)

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت کے بغیر بھی لینے کی اجازت دے دی، اس لئے کہ حق واجب تھا۔

غیر حق واجب وصول کرنا جائز نہیں

لیکن جہاں حق واجب نہ ہو وہاں زبردستی کر کے لینا جائز نہیں۔ بعض لوگ باقاعدہ اس کی پلاننگ کرتے ہیں کہ ہمارا فلاں دوست بڑا کنجوس ہے، لہٰذا ایک دن سب مل کر اس پر دھاوا بولو اور سب مل کر اس کو زچ کر دو کہ وہ کسی طرح کچھ کھلانے پلانے پر آمادہ ہو جائے، یا ہدیہ تحفہ دینے پر آمادہ ہو جائے، آج اس سے ہر قیمت پر اس کے پیسے خرچ کروانے ہیں۔ چنانچہ سب نے اس کے گھر پر دھاوا بول دیا اور سب اس کے پیچھے پڑ گئے، اب وہ بیچارہ عاجز آ گیا اور ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا، اب دل پر پتھر رکھ کر ان کی بات مان لی اور ان پر پیسے خرچ کر دیئے اور انہیں کھلایا پلایا۔ مگر اس کے دل پر قیامت گزر گئی۔ اس صورت میں جو کچھ تم نے اس بخیل سے زبردستی کھایا، وہ سب حرام ہوا، اس لئے کہ وہ شخص اگرچہ بخیل تھا، لیکن اس کے ذمے تمہارے اوپر خرچ کرنا واجب نہیں تھا، تم نے اس کو اس کی مرضی کے خلاف اور اس کی خوشدلی کے خلاف خرچ کرنے پر مجبور کیا، لہٰذا یہ خرچ کرنا ((لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسِهٖ مِنْهُ))(۲) کے اندر داخل ہو کر حرام ہو گیا۔

مدارس کے لئے چندہ کرنا

مدارس کا چندہ کرنا بھی اسی حدیث کے اندر داخل ہے، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنی وجاہت سے فائدہ اُٹھا کر چندہ کرتے ہیں، وہ چندہ مشکوک

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب البيوع، باب من أجرى أمر الأمصار على ما يتعارفون بينهم، رقم: ٤٩٤٥، سنن النسائي، كتاب آداب القضاة، باب قضاة الحاكم على الغائب إذا عرفه، رقم: ٥٣٢٥، سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب ما للمرأة من مال زوجها، رقم: ٢٢٨٤، مسند أحمد، رقم: ٢٢٩٨٨

(۲) مسند أحمد، أول مسند البصريين، رقم: ١٩٧٧٤، حدیث مبارک کا ترجمہ یہ ہے: ''کسی مسلمان کا مال اس کی دلی اجازت کے بغیر استعمال کرنا جائز نہیں''

ہے، اس لئے کہ جس سے چندہ کیا جارہا ہے، جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ اتنے بڑے مولانا صاحب چندے کے لئے میری دکان پر تشریف لائے ہیں، اب دل تو چندہ دینے کو نہیں چاہ رہا ہے، مگر ان بڑے مولانا صاحب کو کیسے رد کروں۔ چنانچہ اس نے دل پر پتھر رکھ کر کچھ پیسے بطور چندہ کے ان کو دے دیئے، لیکن یہ پیسے خوشدلی سے نہیں دیئے اور ایسا چندہ جو خوشدلی سے نہ ہو، وہ لینا جائز نہیں۔

مجمع عام میں چندہ کرنا

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آج کل مجمع عام میں چندہ کرنا مناسب نہیں، مجمع عام میں چندہ کرنے سے بکثرت لوگ محض سر سے بلا ٹالنے کے لئے اور لوگوں کی ملامت سے بچنے کے لئے چندہ دے دیتے ہیں، اس دینے میں اخلاص بہت کم ہوتا ہے۔ آج کل کی قید اس لئے لگادی کہ لوگ مجمع عام میں چندہ کے جواز پر ''غزوۂ تبوک'' کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ''غزوۂ تبوک'' کے موقع پر مسجد نبوی میں عام چندہ کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جن حضرات سے چندہ مانگا جارہا تھا، وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، جن کے بارے میں یہ یقین تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے لئے چندہ دینا ہوگا تو دیں گے، اگر اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں دینا ہوگا تو نہیں دیں گے، آج ہم اپنے آپ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کیسے قیاس کرسکتے ہیں۔ لہٰذا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجمع عام میں چندہ کرنے کی ریت اچھی نہیں ہے، اس میں اس بات کا اندیشہ ہے کہ لوگوں کی خوشدلی کے بغیر چندہ وصول کرلیا گیا ہو، لہٰذا ایسا چندہ ((لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسِہٖ مِنْہُ)) میں داخل ہونے کی بناء پر جائز نہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ان سب باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

اِسراف اور اس کا علاج☆

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ. وَعَلٰی آلِہٖ وَأَصْحَابِہٖ أَجْمَعِیْنَ. وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ. أَمَّا بَعْدُ!

''بخل'' کی ضد ''اِسراف''

گزشتہ تین دن سے ''بخل'' کا بیان چل رہا تھا، الحمد للہ! وہ مکمل ہوگیا۔ اب آگے حضرت نے ''اسراف'' کا عنوان قائم کیا ہے، یہ ''اسراف'' ''بخل'' کی ضد ہے، کیونکہ بخل کے معنی یہ ہیں کہ جہاں آدمی کو خرچ کرنا چاہئے، وہاں خرچ نہ کرے اور ''اسراف'' کے معنی یہ ہیں کہ جہاں خرچ نہ کرنا چاہئے، وہاں خرچ کرے اور دونوں منع ہیں اور ناجائز ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ''عِبَادُ الرحمٰن'' کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ إِذَا أَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا﴾(۱)

''رحمان کے بندے وہ ہیں کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف اور فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں اور اعتدال کا راستہ ان دونوں کے درمیان ہے''

نہ تو انسان ''اسراف'' کے اندر مبتلا ہو اور نہ ہی ''بخل'' کے اندر مبتلا ہو۔

خرچ سے پہلے سوچو

''اسراف'' کے بیان میں سب سے پہلے حضرت والا کا ایک ملفوظ نقل فرمایا ہے جو حضرت والا نے اپنے کسی مرید کے خط کے جواب میں ''تربیت السالک'' میں تحریر فرمایا تھا۔ وہ ملفوظ یہ ہے:

''خرچ کرنے سے قبل دو امر کا انتظام کرلیں، ایک یہ کہ پہلے سوچا کریں کہ اگر اس

☆ اصلاحی مجالس (۵/۱۴۴ تا ۱۶۴)، بعد از نماز ظہر، رمضان المبارک، جامع مسجد دار العلوم، کراچی

(۱) الفرقان: ۶۷

جگہ خرچ نہ کروں تو آیا کچھ ضرر ہے یا نہیں؟ اگر ضرر نہ ہو تو اس کو ترک کر دیں، اور اگر ضرر معلوم ہوتا ہو تو کسی منتظم سے مشورہ کریں کہ یہ خرچ خلافِ مصلحت اور نامناسب تو نہیں، وہ جو بتلائے اس پر عمل کریں، ضرر سے مراد ضرر واقعی اور حقیقی ہے جس کا معیار شریعت ہے، وہمی اور خیالی ضرر مراد نہیں''

مریض کے مطابق نسخہ

اس ملفوظ میں حضرت والا نے ''اسراف'' سے بچنے کا طریقہ لکھا ہے، جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ طبیب اپنے زیرِ علاج مریض کا جائزہ لے کر اس کے حالات کے مناسب نسخہ تجویز کرتا ہے، چنانچہ اس ملفوظ میں بھی حضرت والا نے یہ فرمادیا کہ اگر کسی جگہ خرچ کرنے میں ضرر معلوم نہ ہو تو وہاں بھی کسی منتظم سے مشورہ کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ملفوظ میں جو صاحب مخاطب تھے، وہ شاید بہت زیادہ فضول خرچی میں مبتلا ہوں گے اور ان کی رائے پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ہوگا، اس لئے آپ نے یہ علاج تجویز فرمایا۔

ایسی صورت میں خرچ نہ کرے

ورنہ اصل بات یہ ہے کہ انسان خرچ کرنے سے پہلے سوچے کہ اگر خرچ نہ کروں تو کیا نقصان ہے، اگر خرچ نہ کرنے میں نقصان ہے تو پھر خرچ کرلے، لیکن اگر خرچ نہ کرنے میں کوئی نقصان نہیں تو پھر خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے، وہ خرچ ضرورت سے زائد ہے اور اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

نقصان کا فیصلہ کون کرے؟

لیکن اب سوال یہ ہے کہ کہاں خرچ نہ کرنے میں نقصان ہے اور کہاں نقصان نہیں؟ یہ ایسا سوال ہے جس کا دو اور دو چار کر کے جواب دینا مشکل ہے، کسی بھی علم و فن میں جو قاعدے اور ضابطے ہوتے ہیں، وہ ایک حد تک کام دیتے ہیں، اس حد سے آگے پھر انسان کو اپنے مذاقِ سلیم سے فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔

خرچ کرنے میں فائدہ ہے یا نہیں؟

یہ تو ہے منفی طریقہ کہ خرچ کرنے سے پہلے یہ دیکھو کہ خرچ نہ کرنے میں نقصان ہے یا نہیں۔ ایک اس کے مقابلے میں مثبت طریقہ ہے، وہ یہ کہ خرچ کرتے وقت یہ دیکھو کہ خرچ کرنے میں فائدہ

ہے یا نہیں؟ اگر خرچ کرنے میں فائدہ ہے تو خرچ کرلو، اگر فائدہ نہیں تو ترک کردو، اصل معیار یہ ہے۔لہٰذا ''اسراف'' کے اصل معنی ہیں ''ایسا خرچ جس کا کچھ فائدہ نہ ہو''، فائدہ سے مراد عام ہے، چاہے وہ دین کا فائدہ ہو یا دنیا کا فائدہ ہو، اور دنیا کے فائدے سے بھی وہ فائدہ مراد ہے جو مشروع ہو اور جائز ہو، ناجائز فائدہ مراد نہیں۔لہٰذا جس خرچ میں دین کا فائدہ ہو یا دنیا کا جائز اور مشروع فائدہ ہو، وہ ''اسراف'' میں داخل نہیں اور اگر کوئی ایسا خرچ ہے جس کا سرے سے کوئی فائدہ ہی نہیں یا فائدہ ایسا ہے جس کا حاصل کرنا شرعاً جائز نہیں، ایسا خرچ اسراف میں داخل ہے۔

یہ صورت ''اسراف'' نہیں

اسی تفصیل سے یہ اصول نکلتا ہے کہ بہت سے خرچ جن کو لوگ ''اسراف'' سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ اسراف نہیں ہوتے، مثلاً ایک آدمی اپنی حدود استطاعت میں رہتے ہوئے اپنے راحت اور آرام کے لئے یا اپنا دل خوش کرنے کے لئے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ پیسے خرچ کر کے ایک چیز خرید کر لے آتا ہے۔مثلاً ایک چیز بازار میں دس روپے کی بھی مل رہی ہے اور ۱۵ روپے کی بھی مل رہی ہے اور ۲۰ روپے کی بھی مل رہی ہے اور وہی چیز سو روپے کی بھی مل رہی ہے، البتہ معیار اور درجات میں فرق ہے۔اب ایک آدمی کو وہی چیز خریدنے کے لئے سو روپے خرچ کرنے کی استطاعت ہے اور اس کو وہ چیز خریدنے کے لئے کسی سے قرض لینے کی بھی ضرورت نہیں، لہٰذا وہ شخص اپنی راحت کے لئے دس روپے والی چیز کے بجائے سو روپے والی چیز خریدتا ہے تو یہ ''اسراف'' نہیں اور کوئی گناہ نہیں۔

سفر کے لئے سہولت کی سواری اختیار کرنا

اسی طرح مثلاً تمہیں سفر کر کے دوسرے شہر جانا ہے، اب تم اس کے لئے ریل گاڑی کی تھرڈ کلاس میں بھی سفر کر سکتے ہو اور سیکنڈ کلاس میں بھی سفر کر سکتے ہو اور فرسٹ کلاس میں بھی کر سکتے ہو اور ایئر کنڈیشن میں بھی کر سکتے ہو اور ہوائی جہاز میں بھی کر سکتے ہو اور ان سب کے کرایوں میں بڑا فرق ہے۔لیکن ایک شخص جو ایئر کنڈیشن کلاس میں سفر کرنے کی استطاعت رکھتا ہے، وہ کہتا ہے کہ میں تو اپنی راحت کے لئے ایئر کنڈیشن کلاس میں سفر کروں گا تو یہ کوئی اسراف نہیں اور کوئی گناہ نہیں۔اسی طرح کوئی شخص اپنا دل خوش کرنے کے لئے یا اپنے بیوی بچوں کا دل خوش کرنے کے لئے کچھ خرچ کر دے تو یہ اسراف میں داخل نہیں۔

رہائش میں تین درجے جائز ہیں

حضرت والا نے مکان کے سلسلے میں ایک اصول بیان فرمایا ہے جو اصول تمام چیزوں پر منطبق ہوتا ہے، فرمایا کہ مکان کے اندر چند درجات ہوتے ہیں، ایک درجہ ہے ''رہائش'' یعنی آپ کچا سا مکان بنالیں یا صرف پتھروں کا ایک مکان بنالیں اور ٹین کی چھت ڈال دیں اور اس میں رہائش اختیار کرلیں، اس میں نہ پلستر کیا اور نہ رنگ و روغن، یہ رہائش کا پہلا درجہ ہے۔ رہائش کا دوسرا درجہ ہے ''آسائش'' یعنی آرام دہ رہائش، مثلاً ایک مکان بنوایا، اس کی چھت پکی ڈلوائی اور سونے کے لئے چارپائی پر گدا بھی بچھایا تاکہ آرام اور سکون کی نیند آئے، یہ سب ''آسائش'' ہے اور جائز ہے، یہ دوسرا درجہ ہے۔ تیسرا درجہ ہے ''آرائش'' یعنی زینت اختیار کرنا، مثلاً پختہ مکان بنوایا اور آرائش کے لئے اس پر پلستر بھی کرایا اور پھر رنگ و روغن بھی کرایا تاکہ خوبصورت معلوم ہو اور باتھ روم میں ٹائل بھی لگوائے تاکہ خوبصورت معلوم ہو، یہ سب ''آرائش'' کے اندر داخل ہے۔ اگر حلال مال سے یہ سب کام کرایا ہے اور اس کام کے لئے کسی سے قرض وغیرہ نہیں لینا پڑا تو یہ بھی جائز ہے۔ یہ تینوں درجے جائز ہیں، یعنی رہائش جائز، آسائش جائز، آرائش جائز۔

چوتھا درجہ جائز نہیں

چوتھا درجہ ہے ''نمائش'' یعنی دکھلاوا، کوئی کام صرف اس لئے کیا جائے تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ یہ بڑا آدمی ہے، یہ بڑا دولت مند ہے، لوگ یہ کہیں کہ اس کا مکان بڑا شاندار ہے، اس کی گاڑی بڑی شاندار ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اس لئے اختیار کی ہیں تاکہ اپنی دولت کی نمائش کرے، یہ درجہ حرام ہے۔ اس ''نمائش'' میں فائدہ تو ہے، اس لئے کہ جب وہ اپنی دولت کی نمائش کرے گا تو لوگ اس کو بڑا سمجھیں گے اور بڑا سمجھ کر اس کی تعظیم کریں گے اور اس کی عزت کریں گے اور اس کا حکم مانیں گے، لہٰذا اس ''نمائش'' کے اندر فائدہ تو ہے لیکن یہ فائدہ مشروع نہیں اور شریعت کے اندر معتبر نہیں۔ لہٰذا یہ فائدہ کالعدم ہے۔

اصل معیار ''مشروع فائدہ'' ہے

دیکھئے! ''رہائش'' فائدہ ہے، ''آسائش'' فائدہ ہے، ''آرائش'' فائدہ ہے، ان تینوں اغراض کی وجہ سے جو کچھ خرچ کیا جا رہا ہے، وہ ''اسراف'' میں داخل نہیں، لیکن نمائش میں فائدہ تو ہے مگر وہ فائدہ مشروع نہیں، اس لئے وہ ''اسراف'' میں داخل ہے۔ لہٰذا اگر کوئی کام ایسا ہے جس میں کوئی فائدہ

ہی نہیں، مثلاً پیسے اُٹھا کر پھینک دیئے یا مثلاً ایک چیز مہنگے داموں میں خرید لی، اگر ذرا توجہ سے کام لیتا تو چیز سستی مل جاتی لیکن اس نے وہی چیز خریدنے میں اپنی غفلت، بے پرواہی اور ناقدری سے زیادہ پیسے خرچ کر دیئے تو یہ اسراف ہوگیا۔

دو پیسوں کی تلاش کا واقعہ

ایک مرتبہ میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ لاہور گیا ہوا تھا، اس وقت میں چھوٹا بچہ تھا، لاہور میں میرے بڑے بھائی جناب ذکی کیفی صاحب مرحوم رہتے تھے، وہاں لاہور میں کسی جگہ میں اور والد صاحب اور بھائی صاحب ہم تینوں پیدل جا رہے تھے، ایک جگہ لاہور میں ''کپورتھلہ ہاؤس'' کہلاتی تھی، رات کا وقت تھا، اندھیرا تھا، ایک جگہ پر خاردار تار لگے ہوئے تھے، آدمی بڑی مشکل سے وہاں سے نکلتا تھا۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم جیب سے پیسے نکال رہے تھے کہ اس اندھیرے میں پیسے نکالتے ہوئے کوئی سکہ زمین پر گر گیا، اب اندھیرا بھی تھا، جلدی بھی تھی اور خاردار تار بھی لگے ہوئے تھے، اس لئے بھائی صاحب نے سوچا کہ کون اس سکے کو اندھیرے میں تلاش کرے، چنانچہ وہ اس کو چھوڑ کر آگے بڑھنے لگے۔ حضرت والد صاحب نے بھائی سے پوچھا کہ کیا گرا؟ بھائی صاحب نے کہا کہ کچھ سکے گر گئے۔ والد صاحب نے فرمایا کہ ان کو کیوں نہیں اُٹھاتے؟ بھائی صاحب نے کہا کہ وہ صرف دو پیسے یا ایک آنہ تھا۔ والد صاحب نے فرمایا کہ دو پیسے تھے یا ایک آنہ تھا، پہلے تھوڑی دیر اس کو تلاش ضرور کرو، پھر اگر ملنے سے مایوسی ہو جائے تو خیر ہے، چھوڑ دو، لیکن تلاش ضرور کرو۔ چنانچہ والد صاحب نے کہیں سے ماچس منگوائی اور خود ہی ماچس جلائی اور پھر فرمایا کہ اب تلاش کرو۔ اب وہ دو پیسے تلاش کیے جا رہے ہیں۔

پھر فرمایا کہ چاہے ایک پیسہ ہو یا دو پیسے ہوں، یہ اللہ جل شانہ کی نعمت ہے، اس کے بارے میں یہ سوچنا کہ یہ معمولی چیز ہے، گر گیا تو بس گر گیا، پھر اس کو اس طرح چھوڑ کر چلے جانا اللہ جل شانہ کی نعمت کی ناقدری ہے۔

اجزاءِ قلیلہ کی قدر بھی ضروری ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ملفوظ میں فرمایا ہے کہ ''جس نعمت کے اجزاءِ کثیرہ سے تم انتفاع کرتے ہو، اس کے اجزاءِ قلیلہ کی عزت کرنا تمہارے ذمے ضروری ہے۔ یعنی جس چیز کی بہت بڑی مقدار سے تم فائدہ اُٹھاتے ہو، اس چیز کی تھوڑی مقدار بھی اگر تمہارے پاس ہے تو اس کی بھی عزت کرو۔ اس لئے حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ جو پیسے گر گئے ہیں، چاہے وہ ایک آنہ ہے یا دو پیسے

ہیں، اس کو تھوڑی دیر کے لئے تلاش ضرور کرو، اس پر تھوڑا وقت صرف کرو تاکہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری نہ ہو، بغیر تلاش کیے ہوئے چھوڑ کر چلے جانا ''اسراف'' اور ناقدری ہے۔ البتہ اگر تمہیں سخاوت کرنی ہے تو کسی ضرورت مند کو دے دو، اس کے کام آجائے گا، وہ اسراف نہ ہوگا بلکہ صدقہ ہوگا اور وہ پیسہ صحیح جگہ پر پہنچ جائے گا۔

فائدہ غیر مشروعہ میں خرچ

جب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چھوٹی چھوٹی نعمتوں کی قدر کرو گے اور اس پر شکر کرو گے تو اللہ تعالیٰ اور عطا فرمائیں گے اور اگر ناقدری کرو گے تو پھر وبال کا اور اس نعمت کے چھن جانے کا اندیشہ ہے۔ بہرحال پیسے گم ہونے پر تلاش نہ کرنا اس بات کی مثال ہوئی جہاں فائدے کے بغیر خرچ ہوا اور پیسے ویسے ہی ضائع ہوگئے۔ اور ''نمائش'' اس صورت کی مثال ہے جس میں خرچ کرنے پر فائدہ تو ہے لیکن وہ فائدہ مشروع نہیں، شرعاً جائز نہیں، یا پیسے خرچ کر کے کوئی ایسی لذت حاصل کی جارہی ہے جو جائز نہیں، اس میں خرچ سے فائدہ ہے لیکن فائدہ غیر مشروعہ ہے، لہٰذا وہ ''اسراف'' میں داخل ہے۔

''اسراف'' اور ''تبذیر'' میں فرق

علماء فرماتے ہیں کہ ''اِسراف'' اور ''تبذیر'' میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ ''اِسراف'' عام ہے اور تبذیر خاص ہے۔ تبذیر صرف اس صورت میں ہوتی ہے جب خرچ کا محل غیر مشروع ہو، یعنی ناجائز کام میں پیسہ خرچ کرنا ''تبذیر'' ہے، مثلاً فلم دیکھنے میں یا جوے میں پیسے خرچ کر دے تو یہ تبذیر ہے اور یہی صورتیں ''اِسراف'' میں بھی داخل ہیں، البتہ جہاں پیسہ ناجائز اور حرام کام میں خرچ نہیں ہورہا ہے لیکن بے فائدہ کام پر ہورہا ہے تو اس صورت میں ''اِسراف'' تو ہے لیکن ''تبذیر'' نہیں۔ بہرحال! چونکہ ''اِسراف،، تبذیر کو بھی شامل ہے، اس لئے میں نے ''اِسراف'' کی تعریف یہ کر دی کہ پیسے ایسی جگہ خرچ کرنا جہاں فائدہ نہ ہو، یا فائدہ ہو لیکن ناجائز ہو۔

مجاہدہ کیا ہے؟

جیسا کہ پہلے میں نے عرض کیا تھا کہ جب کسی آدمی کی تربیت کی جاتی ہے تو اس کی جو اصل منزل ہے اور جہاں اس کو پہنچنا ہے، اس منزل تک پہنچنے سے پہلے اس کو تیار کیا جاتا ہے، اسی تیاری کا نام ''مجاہدہ'' ہے، مثلاً مقصود اصلی تو حرام سے بچنا ہے، لیکن اس مقصود اصلی تک پہنچنے کے لئے تمہیداً بعض اوقات کچھ جائز چیزیں بھی چھڑائی جاتی ہیں، یہ اس لئے چھڑائی جاتی ہیں تاکہ حرام سے بچنے کے

لئے راستہ ہموار کیا جا سکے، اسی کو ''مجاہدہ'' کہتے ہیں، اسی لئے مشائخ اپنے زیرِ تربیت افراد سے بعض اوقات کچھ جائز چیزیں بھی چھڑواتے ہیں۔ بہر حال! ''اِسراف'' کی جو اصل ممنوع حد ہے، وہ تو اس وقت آتی جبکہ خرچ کرنے میں کوئی فائدہ ہی نہ ہوتا، یا فائدہ ہوتا مگر وہ غیر مشروع ہوتا۔

خرچ نہ کرنے میں نقصان نہ ہو تو چھوڑ دو

لیکن تربیت کرنے کی غرض سے حضرت والا نے اپنے زیرِ تربیت افراد سے یہ کہہ دیا کہ خرچ کرنے سے پہلے یہ دیکھو کہ خرچ نہ کرنے میں ضرر ہے یا نہیں؟ اگر خرچ نہ کرنے میں کوئی نقصان نہیں تو چھوڑ دو، خرچ مت کرو۔ کیونکہ یہ صورت ''سلبِ ضرورۃ عن الجانب المخالف'' اور ''اِمکان عام'' ہے۔ حالانکہ اگر غور کرو گے تو اس میں ایسی صورت نکل آئے گی جو جائز ہے، مثلاً یہ کہ خرچ نہ کرنے میں کوئی نقصان تو نہیں لیکن خرچ کرنے میں فائدہ ہے، یہاں دونوں باتیں جمع ہو گئیں، لہٰذا اس میں اِسراف کی جائز صورت بھی شامل ہو گئی لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تربیت کی خاطر یہ حکم دے دیا کہ ''تمہارے لئے حکم یہ ہے کہ اگر نہ خرچ کرنے میں نقصان نہ ہو تو بھی چھوڑ دو، خواہ اس خاص جگہ پر اصلاً خرچ کرنا جائز ہی کیوں نہ ہو''

خرچ سے پہلے کسی منتظم سے مشورہ

پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آگے ارشاد فرمایا کہ ''اگر ضرر معلوم ہوتا ہو تو کسی منتظم سے مشورہ کرو'' یعنی خرچ کرتے وقت یہ سوچو کہ اگر خرچ نہ کروں تو کوئی نقصان ہے یا نہیں؟ سوچنے پر پتہ چلا کہ اگر اس خاص موقع پر خرچ نہ کیا تو نقصان ہوگا تو اس صورت میں بھی خرچ کرنے سے پہلے کسی منتظم سے مشورہ کرو کہ یہ خرچ نامناسب اور خلافِ مصلحت تو نہیں، پھر وہ جو بتلائے، اس پر عمل کرو، خود اپنی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔

یہ علاج ہر شخص کے لئے نہیں

البتہ یہ علاج ہر آدمی کے لئے نہیں ہے کہ ہر آدمی خرچ کرنے سے پہلے یہ سوچے کہ خرچ نہ کرنے میں نقصان ہے یا نہیں؟ اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ خرچ نہ کرنے میں نقصان ہے تو پھر بھی خرچ کرنے سے پہلے منتظم سے مشورہ کرے اور پھر خرچ کرے، یہ علاج ہر آدمی کے لئے نہیں ہے، بلکہ جو آدمی ضرورت سے زیادہ اسراف میں مبتلا ہے، اس کے لئے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ علاج تجویز فرمایا ہے۔

فائدہ اور عدم فائدہ کی تعیین شیخ سے کرائے

پھر آگے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمادیا کہ ''ضرر'' سے مراد حقیقی اور واقعی ''ضرر'' ہے جس کا معیار شریعت ہے، وہمی اور خیالی ضرر مراد نہیں۔ بہر حال! اصل حقیقت وہ ہے جو میں نے آپ کے سامنے عرض کردی، وہ یہ کہ بغیر فائدہ کے خرچ کرنا یا فائدہ غیر مشروعہ کے ساتھ خرچ کرنا ''اسراف'' ہے، البتہ یہ بات کہ کہاں فائدہ ہے اور کہاں فائدہ نہیں، اس کے بارے میں دو اور دو چار کی طرح کوئی اصول بتانا مشکل ہے۔ بعض مرتبہ آدمی یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ یہاں خرچ کرنے میں فائدہ ہے لیکن حقیقت میں فائدہ نہیں ہوتا، یہ وہ مقام ہے جہاں شیخ کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے سامنے صورتِ حال بیان کر کے اس سے پوچھا جاتا ہے کہ میں یہاں پر خرچ کروں یا خرچ نہ کروں؟ اگر قاعدہ اور ضابطہ بتانے سے کام چل جاتا تو پھر شیخ کی ضرورت ہی کیا تھی، بس ''اسراف'' کی تعریف بیان کردی جاتی اور ''اسراف'' کے فوائد و قیود بیان کردیئے جاتے، ہر آدمی اس کو پڑھ کر اس پر عمل کر لیتا، لیکن ایسا نہیں ہوتا، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم تنہا نازل نہیں فرمایا بلکہ قرآن کریم کے ساتھ پیغمبر بھی بھیجا، اس لئے کہ انسان صرف پڑھ کر ہر بات سمجھ نہیں سکتا جب تک کسی ہادی اور رہبر کی رہنمائی نہ ہو۔

رہبر اور رہنما کی ضرورت

حضرات صحابہ کرام کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہدایت ملی اور تابعین کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعہ ہدایت ملی، تبع تابعین کو تابعین کے ذریعہ ہدایت ملی، اسی طرح آج تک یہ سلسلہ چلا آرہا ہے، اس لئے کہ قاعدے اور ضابطے ایک حد تک ساتھ دیتے ہیں، اس سے آگے ان قاعدوں اور ضابطوں کو حالات پر منطبق کرنے کا عمل شیخ کے ذریعہ ہوتا ہے، اسی مقصد کے لئے شیخ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور اس سے پوچھا جاتا ہے کہ یہاں پر خرچ کروں یا نہ کروں؟

وہ حقیقی ضرورت نہیں

آگے ایک اور ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''اِسراف کے متعلق یہ کہتا ہوں کہ جب کوئی چیز خریدنا چاہو تو سوچ لو کہ ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر ذہن میں ضرورت فوراً آجائے تو خریدلو اور اگر فوراً ضرورت ذہن میں نہ آئے تو نہ خریدو، کیونکہ جس ضرورت کو آدھے گھنٹے تک سوچ سوچ کر پیدا کیا جائے وہ ضرورت نہیں اور اگر دل میں بہت تقاضہ ہو اور ضرورت معتد بہا سمجھ میں نہ

آئے تو ایسی صورت میں چیز خرید لو اور اطمینان سے بیٹھ کر سوچتے رہو، اگر اسراف نہ ہونا متحقق ہو جائے تو کھالو ورنہ خیرات کر دو''(۱)

یعنی اگر ایک چیز کی ضرورت فوری طور پر سمجھ میں آ جائے تو ٹھیک ہے، خرید لو، لیکن اب آدھے گھنٹے تک سوچ رہے ہیں کہ اس چیز کا کیا مصرف ہو سکتا ہے، اور پھر اس کا مصرف سمجھ میں آیا، تو سوچ سوچ کر چیز کا مصرف اور ضرورت نکالی تو حقیقت میں وہ ضرورت ہی نہیں۔ لیکن اگر ایک چیز کے خریدنے کا دل بہت چاہ رہا ہے اور پھر سوچا کہ اس کی ضرورت ہے یا نہیں؟ تو سوچنے کے بعد بھی اس کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی کہ کیا ضرورت ہے، اس کے بارے میں فرمایا کہ وہ چیز خرید لو اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر سوچتے رہو، اگر ''اسراف'' نہ ہونا متحقق ہو جائے تو کھالو ورنہ خیرات کر دو۔ اس لئے کہ اس وقت اگر نہ خریدی تو موقع نکل جائے گا، لہٰذا اس وقت خرید تو لو لیکن بعد میں سوچو کہ ضرورت کی چیز لی یا بغیر ضرورت کے چیز لے لی، اگر سوچنے کے بعد پتہ چلا کہ ضرورت ہے تو اس کو استعمال کر لو اور اگر ضرورت نہیں ہے تو اس چیز کو خیرات کر دو۔

بیوی بچوں کو خوش کرنے کے لئے خرچ کرنا

آگے اسی ملفوظ میں ارشاد فرمایا:

''اور بیوی کو کھلا دینا بھی خیرات ہی ہے اور اگر بیوی کا جی خوش کرنے کو بلا ضرورت بھی کوئی چیز خرید لو تو وہ بھی اسراف نہیں، کیونکہ تطییب قلب زوجہ بھی مطلوب ہے، بشرطیکہ اس میں طاقت سے زیادہ قرض نہ کرے''(۲)

یعنی بیوی کا دل خوش کرنے کے لئے بلا ضرورت بھی کوئی چیز خریدنا اسراف نہیں، بیوی میں بچے بھی داخل ہیں۔ کیوں؟ اس کی وجہ بھی بیان فرما دی کہ تطییب قلب زوجہ بھی مطلوب ہے۔ بات وہی ہے جو اوپر عرض کی کہ خرچ کرنے میں فائدہ ہونا چاہئے، اب یہ ضروری نہیں کہ اپنا ہی فائدہ ہو بلکہ دوسرے کا فائدہ بھی اس میں داخل ہے، کیونکہ دوسرے کا دل خوش کرنا اور اس کی دلداری کرنا بھی فائدہ ہے، چاہے یہ دلداری بیوی کی ہو، بچوں کی ہو، ماں باپ کی ہو، بہن بھائیوں کی ہو، یہ بھی ایک معتدبہ فائدہ ہے، اس پر جو کچھ خرچ کیا جائے وہ بھی ''اسراف'' نہیں۔

استاذ کے اکرام میں باون قسم کے کھانے

ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ان کے استاذ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۹۱ (۲) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۹۱

آئے۔ میں نے اپنے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاذ کے اکرام کے لئے باون قسم کے کھانے تیار کرائے۔ جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے دسترخوان پر باون کھانے دیکھے تو فرمایا کہ بھائی تم نے یہ کیا کرلیا؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سچی بات تو یہ ہے کہ دل تو اب بھی نہیں بھرا، دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ اور تیار کراتا۔ اب دوسرا آدمی تو ان باون قسم کے کھانوں کو دیکھ کر یہ کہے گا کہ یہ ''اسراف'' ہے، لیکن حقیقت میں یہاں پر استاذ کا اکرام مقصود تھا اور یہ معلوم تھا کہ کوئی چیز ضائع نہیں ہوگی بلکہ جو بچے گا وہ ضرور کسی اللہ کے بندے کے کام آئے گا، اگر خدانہ کرے ضائع ہوتا تو بیشک وہ ''اسراف'' تھا، لیکن وہاں تو اس بات کا یقین تھا کہ ضائع نہیں ہوگا۔ اور وہاں کوئی دکھاوا تو تھا نہیں کہ باون قسم کے کھانے لوگوں کو دکھانے کے لئے تیار کرائے ہوں بلکہ اپنی طبیعت کا تقاضا تھا اور استاذ کی خدمت اور استاذ کا اکرام مقصود تھا، اس لئے اس میں کوئی اسراف نہیں تھا۔

نیت کے فرق سے گناہ اور ثواب

اگر یہی کام آدمی اس نیت سے کرے کہ تاریخ میں ریکارڈ ہو جائے کہ فلاں شخص نے ایسی دعوت کی تھی کہ اس میں باون قسم کے کھانے تھے تو اس صورت میں یہی کام ''اسراف'' بھی ہے اور حرام بھی ہے۔ اسی طرح شادی بیاہ کے موقع پر ہدیہ تحفہ دیا جاتا ہے، اگر یہ ہدیہ محبت میں دل کے تقاضے سے دیا کہ یہ شخص میرا قریبی عزیز ہے، دل چاہتا ہے کہ میں اس کی خدمت کروں اور کچھ دے کر اپنی خوشی کا اظہار کروں تو یہ سنت پر عمل ہے اور اس پر بڑا اجر وثواب ہے اور یہ برکت کی چیز ہے، اور اگر یہی کام اس نیت سے کیا کہ اس ہدیہ کے دینے سے نام ہوگا کہ فلاں نے شادی کے موقع پر یہ تحفہ دیا تو یہی چیز اسراف ہے اور گناہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے بخل سے بھی ہماری حفاظت فرمائے اور اسراف سے بھی حفاظت فرمائے۔

اسراف سے بچنے کی ترکیب

اس ملفوظ پر حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''اسراف سے بچنے کی ترکیب'' کا عنوان لگایا ہوا ہے۔ اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کسی مرید کو کچھ نصیحتیں فرمائی ہیں، وہ نصیحتیں اس ملفوظ میں درج ہیں، اگر ان نصیحتوں پر عمل کرلیا جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ اسراف سے نجات مل جائے گی اور چونکہ یہ نصیحتیں عام نوعیت کی ہیں، اس لئے ان پر عمل کرنے سے دوسری خرابیوں سے بھی نجات مل جائے گی، چنانچہ پہلی نصیحت یہ فرمائی:

''اہل اللہ کا مذہب رکھو، وضعدار لوگوں کا مت رکھو، رسم و رواج کے ذرا بھی مقید نہ ہو۔''(۱)

اہل اللہ کی وضع اختیار کریں

اللہ تعالیٰ نے مباحات کا دائرہ بہت وسیع رکھا ہے، لیکن ان مباحات میں کچھ مباحات ایسے ہیں جن کو ہر دور کے اہل اللہ اختیار کر لیتے ہیں، پھر ان مباحات کے اختیار کرنے میں برکت ہوتی ہے، البتہ یہ بات نہیں ہے کہ ان مباحات کے خلاف کرنے میں گناہ ہے اور نہ ہی اہل اللہ کے اختیار کیے ہوئے طریقے کا مسنون ہونا ضروری ہے، مثلاً ''لباس'' ہے، لباس کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے ''مباحات'' کا دائرہ بہت وسیع رکھا ہے، کسی خاص لباس کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں پابند نہیں کیا کہ یہ لباس پہنو، شریعت نے ہم پر ایسی پابندی نہیں لگائی۔

رسم اور فیشن کے قیدی مت بنیں

اب ایک ''لباس'' وہ ہے جس کو اس دور کے علماء نے اور اہل اللہ نے اختیار کیا ہوا ہے اور ایک لباس وہ ہے جس کو عام لوگوں نے اختیار کیا ہوا ہے۔ جو لباس عام لوگوں نے اختیار کیا ہوا ہے وہ بھی کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ وہ بھی مباحات کے اندر داخل ہے۔ مثلاً کسی خاص قسم کے لباس کا ایک فیشن چلا ہوا ہے، جس میں کوئی اور محظور شرعی نہیں ہے، مثلاً شلوار قمیص کا سوٹ اور اس پر واسکٹ پہنتے ہیں، اس کا فیشن چلا ہوا ہے، یہ کوئی گناہ اور ناجائز نہیں ہے بلکہ یہ بھی مباحات میں دخل ہے۔ جو لباس علماء کرام، بزرگانِ دین اور اہل اللہ نے اختیار کیا ہوا ہے، وہ بھی مباحات میں ہے، لیکن تم اس بات کی کوشش کرو کہ اہل اللہ کا طریقہ اختیار کرو اور وضع دار لوگوں کا مذہب اور طریقہ اختیار مت کرو۔ ''وضعدار'' سے مراد ہیں ''فیشن والے'' اور رسم و رواج کے مقید نہ بنو، یعنی یہ مت دیکھو کہ آج کل تو ایسے لباس کا فیشن چل رہا ہے، یہ لباس پہننا چاہئے اور فلاں لباس آؤٹ آف فیشن ہو گیا ہے، اس لئے اس کو چھوڑ دینا چاہئے۔

بزرگوں کے لباس کی نقل کرنا اچھا ہے

اب یہاں چند باتیں سمجھنے کی ہیں جس میں ہمارے یہاں افراط اور تفریط پائی جاتی ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جو لوگ اہل اللہ کے لباس کی نقل اُتارنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً اہل اللہ کی دوپلی ٹوپی

(۱) انفاسِ عیسی: ۱۹۲

دیکھ کر یا ان کی گول ٹوپی دیکھ کر ان کی نقل کرتے ہیں، یا اہل اللہ کا سلیم شاہی جوتا دیکھ کر اس کی نقل کرتے ہیں یا اہل اللہ کے کرتے جیسا کرتا پہننے کی کوشش کرتے ہیں، خاص طور پر جب کوئی شخص نیا نیا دین کے قریب آتا ہے تو وہ بزرگوں کی نقل اُتارنے کی کوشش کرتا ہے۔

اب لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ بزرگوں کے لباس پوشاک کی نقل کرنے اور اس کا اہتمام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا حضور اقدس ﷺ نے دوپلی ٹوپی پہنی تھی؟ کیا آپ نے ایسا جوتا اور ایسی قمیص اور ایسی شلوار پہنی تھی؟ قمیص کے بارے میں تو اتنا کہہ سکتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے قمیص پہنی تھی لیکن حضور اقدس ﷺ کی قمیص ہماری قمیص سے مختلف تھی، ہماری قمیص اونچی ہوتی ہے، آپ ﷺ کی قمیص نیچی ہوتی تھی، اسی طرح شلوار پہننا حضور اقدس ﷺ سے ثابت نہیں، البتہ شلوار کو پسند کرنا ثابت ہے، لیکن یہ ٹوپی اور جوتا پہننا حضور اقدس ﷺ سے ثابت نہیں، یہ صدری اور یہ واسکٹ پہننا ثابت نہیں، لہٰذا لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب یہ چیزیں پہننا سنت نہیں ہے تو پھر لوگ ان کی طرف کیوں اتنا التفات کرتے ہیں اور ان کے پہننے کا اتنا اہتمام کیوں کرتے ہیں؟

اس کو سنت سمجھنا غلط ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اہتمام اس وجہ سے نہیں ہے کہ ان چیزوں کو پہننا سنت ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص دوپلی ٹوپی یا پانچ کلی کی ٹوپی اس نیت سے پہنے کہ یہ سنت ہے تو اس کا پہننا بدعت اور گناہ ہوگا، بلکہ یہ اہتمام اس وجہ سے ہے کہ ہر دور کے صلحاء اور علماء جو لباس اختیار کرتے ہیں، اس کے پہننے میں فائدہ ہے، وہ فائدہ یہ ہے کہ ایسا لباس پہننے کے نتیجے میں ان سے قرب ہوتا ہے اور ان سے مشابہت حاصل ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ فال نیک ہوتی ہے کہ جب ہم نے ان کا لباس اختیار کیا ہے تو اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے اخلاق اور ان کی سیرت اپنانے کی بھی توفیق عطا فرمائیں گے۔ لہٰذا اس لباس کو سنت سمجھ کر اختیار کرنا تو غلط ہے اور اس کو ضروری سمجھ کر اختیار کرنا تو بہت ہی غلط ہے۔

حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

مثلاً ہمارے بزرگوں نے اس کا اہتمام کیا کہ جب بھی جوتا پہنیں گے تو سلیم شاہی پہنیں گے۔ حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے، حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد تھے، اس زمانے میں ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور برطانیہ کی طرف سے حکمران مقرر ہوتا تھا، اس کو ''وائسرائے'' کہا جاتا تھا، اس نے سرکاری اعزاز کے طور پر حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ''شمس العلماء'' کا خطاب دیا تھا۔ ایک مرتبہ اس وائسرائے نے حضرت والا کو ملاقات

کے لئے دہلی بلایا، اب حاکم وقت نے اعزاز کے ساتھ بلایا تھا، اس لئے آپ ملاقات کے لئے تشریف لے گئے، جب اس کے محل میں داخل ہونے لگے تو دروازے پر جو جنٹلمین دربان تھا، اس نے آپ کو روک لیا اور کہا کہ یہ جوتا جو آپ پہنے ہوئے ہیں، اس کو پہن کر اندر نہیں جا سکتے۔ آپ اس وقت دھوڑی کا جوتا پہنے ہوئے تھے، آج کل سلیم شاہی ناگرا جو رائج ہے، یہ تو بہت نازک قسم کا ہوتا ہے، وہ دھوڑی کا جوتا بہت موٹا ہوتا تھا۔ بہرحال! اس نے کہا کہ آپ وائسرائے سے ملنے کے لئے یہ جوتا پہن کر نہیں جا سکتے بلکہ آپ کو بوٹ پہننے پڑیں گے۔

مجھے ملاقات کا شوق نہیں

حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے خود تو وائسرائے سے ملنے کی درخواست نہیں دی ہے کہ میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں، لہٰذا مجھے ملاقات کرنے کی کوئی حاجت نہیں، البتہ انہوں نے ہی مجھے ملاقات کے لئے بلایا ہے، اب اگر وہ ملاقات کے لئے یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ میں اپنی مرضی کا جوتا اُتار دوں اور ان کی مرضی کا جوتا پہنوں تو پھر مجھے ان کی ملاقات کی یہ دعوت قبول نہیں، میں معذرت خواہ ہوں اور اگر وہ میری مرضی کے لباس میں مجھ سے ملنے کو تیار ہیں تو پھر میں تیار ہوں، میرا یہ پیغام ان تک پہنچا دو، اگر نہیں ملنا چاہتے تو میں واپس چلا جاتا ہوں اور اپنا منہ موڑ لیا۔

اب اس دربان کی ساری جنٹلمینی دھری رہ گئی۔ اس نے سوچا کہ جب وائسرائے کو یہ اطلاع ملے گی کہ مولانا صاحب تشریف لائے تھے اور اس وجہ سے واپس چلے گئے تو میری اپنی کھچائی نہ ہو جائے، چنانچہ اس نے جا کر اندر اطلاع دی کہ وہ مولانا صاحب تو یہ کہہ رہے ہیں۔ وہ وائسرائے بھی ناراض ہوئے کہ تم نے مولانا کے ساتھ کیا حرکت کی، ان کو فوراً اندر بلالو، چنانچہ آپ کو فوراً اندر بلوالیا۔

آپ نے ایسا جوتا کیوں اختیار کیا؟

اب حضرت مولانا کا ایسا جوتا پہننے کا اہتمام کرنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ یہ سنت تھا، لہٰذا کوئی یہ اعتراض نہ کرے کہ ایسا جوتا پہننا کونسا فرض و واجب تھا، اگر اس وقت وہ دوسرے جوتے پہن کر چلے جاتے تو کوئی حرام اور گناہ نہیں تھا، لیکن دو وجہ سے اس جوتے کے پہننے کا اہتمام کیا، ایک وجہ تو یہ تھی کہ آپ نے اپنے علماء اپنے اساتذہ، اپنے صلحاء و مشائخ کو ایسا جوتا پہنتے دیکھا تھا تو ان کی سی صورت اختیار کرنے کی کوشش کی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ بات وقار کے خلاف تھی کہ ایک طرف عالم کو بلایا جا رہا ہے اور دوسری طرف شرطیں عائد کی جا رہی ہیں کہ ایسا لباس اور ایسا جوتا پہن کر آؤ ورنہ داخل نہیں ہونے دیں گے۔ چونکہ یہ بات وقار کے خلاف تھی، اس لئے حضرت والا نے اس کو گوارا نہیں فرمایا۔

کیا اہتمام بدعت ہے؟

اب بعض لوگ یہاں تک کہتے ہیں کہ تم لوگ جو یہ اہتمام کرتے ہو کہ ایسا لباس ہو، ایسا کرتا ہو، ایسی شلوار ہو، ایسا جوتا ہو، ایسی ٹوپی ہو، یہ اہتمام کرنا بدعت ہے، کیونکہ سنت سے ایسا لباس، ایسا جوتا، ایسی ٹوپی ثابت نہیں اور تم ان چیزوں کا ایسا التزام کررہے ہو جیسا التزام سنتوں کا اور واجبات کا ہوتا ہے، لہٰذا یہ "التزام ما لا یلزم"[1] ہے، اس لئے یہ بدعت ہے۔

محبوب کی شباہت

یہ بات درست نہیں، اس لئے کہ اس لباس کا اور اس جوتے کا اور اس ٹوپی کا سنت یا واجب ہونے کی وجہ سے التزام نہیں کیا جارہا ہے بلکہ اس لئے التزام کیا جارہا ہے کہ یہ ہمارے بزرگ، ہمارے اساتذہ اور ہمارے مشائخ کا طریقہ ہے۔ اگر ہم ان کا طریقہ اختیار کریں گے تو ان کی صورت بنانے کی برکت سے اللہ تعالیٰ ہماری سیرت بھی ان جیسی بنادیں گے۔

تیرے محبوب کی یا رب شباہت لے کر آیا ہوں
حقیقت اس کو تو کردے میں صورت لے کر آیا ہوں

بزرگوں کا لباس اختیار کرنے سے یہ مشابہت مقصود ہوتی ہے اور کچھ مقصود نہیں ہوتا۔

التزام کرنا بدعت ہے

دوسری طرف بعض لوگوں نے واقعۃً ایسا سمجھ لیا ہے کہ یہ ہیئت اور یہ لباس اختیار کرنا فرض و واجب ہے یا کم از کم سنتِ مؤکدہ تو ضرور ہے۔ اگر کوئی شخص اس لباس اور اس ہیئت سے انحراف کرے تو اس پر نکیر کی جاتی ہے، ملامت کی جاتی ہے کہ اس نے یہ لباس کیوں اختیار نہیں کیا۔ یہ اہتمام اور التزام واقعۃً اس ہیئت اور لباس کو بدعت بنا دیتا ہے، مثلاً یہ نکیر کرنا کہ فلاں شخص نے پنج گوشہ ٹوپی کیوں نہیں پہنی؟ اس نے فلاں قسم کا جوتا کیوں نہیں پہنا؟ اس نے فلاں طرز کا لباس کیوں نہیں پہنا؟ لہٰذا جب اس لباس اور اس ہیئت کے ترک پر اس طرح کی نکیر ہونے لگے جس طرح فرائض و واجبات کے ترک پر نکیر ہوتی ہے تو یہی لباس اور ہیئت بدعت بن جائے گا۔ بعض اوقات یہ بات ہمارے طبقے میں پیدا ہوجاتی ہے۔ اصل بات تو وہاں سے چلی تھی کہ اہل اللہ کا لباس اختیار کرو، اس میں برکت ہے، لیکن آگے چل کر اس لباس کو اتنی اہمیت دے دی کہ وہ فرائض و واجبات کا درجہ اختیار کرگیا، اس

(۱) یعنی جو چیز لازم نہ تھی اسے لازم کرلیا گیا۔

وجہ سے وہ لباس بدعت بن گیا، یہ بڑی خطرناک بات ہے۔

غیر منکر پر نکیر کرنا خود منکر ہے

ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی عجیب بات فرمایا کرتے تھے، اور یہ بات ویسے ہی نہیں فرمائی بلکہ پہلے علماء کی کئی مجلسوں میں اس کی تصدیق کرائی اور ان علماء کے سامنے آپ نے فرمایا کہ میرے ذہن میں ایک بات آتی ہے، آپ حضرات سوچ کر بتائیں کہ وہ بات صحیح ہے یا غلط ہے؟ جب آٹھ دس علماء کی مجلسوں میں اس کی تصدیق ہوگئی کہ یہ بات بالکل صحیح ہے، اس کے بعد اس بات کو بطور قاعدہ کے آپ نے لوگوں کے سامنے بیان فرمایا، چنانچہ آپ نے فرمایا:

"غیر منکر پر نکیر کرنا خود منکر ہے"

یعنی جس کام کو شریعت نے منکر اور حرام اور ناجائز قرار نہیں دیا، اگر کوئی شخص وہ کام کر رہا ہے تو اس پر طعن و تشنیع کرنا اور اس کو برا بھلا کہنا خود منکر ہے اور قابلِ ترک ہے۔

زیرِ تربیت افراد کا معاملہ الگ ہے

یہ قاعدہ جو بیان کیا جا رہا ہے وہ عام انسانوں کے ساتھ طرزِ عمل کا بیان کیا جا رہا ہے، جہاں تک ان افراد کا تعلق ہے جو انسان کے زیرِ تربیت ہیں، جیسے استاذ کے لئے شاگرد، شیخ کے لئے مرید اور باپ کے لئے اولاد، ان کا معاملہ عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے، کیونکہ بعض اوقات ان کو مستحبات کا بھی پابند کیا جاتا ہے اور ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ ان مستحبات کو ادا کرو اور پھر ان مستحبات کے ترک پر نکیر بھی کی جاتی ہے۔ چونکہ ان افراد کو مستحبات کے پابند بنانے کا مقصد ان کی تربیت ہے تاکہ ان کو مستحبات کے ادا کرنے کی عادت پڑے، لہٰذا زیرِ تربیت افراد اس قاعدے کے اندر داخل نہیں۔ مثلاً اگر کسی شاگرد پر یا مرید پر یا اپنی اولاد پر کسی مستحب کے ترک پر نکیر ہو رہی ہے تو یہ نکیر کرنا درست ہے۔

کیا تم خدا ہو؟

لیکن عام آدمی جو تمہارے زیرِ تربیت نہیں، اس کے بارے میں آپ یہ چاہیں کہ یہ بھی ایسا ہی ہو جائے جیسا میں ہوں یا جیسا میں چاہتا ہوں تو تم پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تم خدا ہو؟ یا تم اللہ کے پیغمبر ہو؟ یا اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس بات کا ٹھیکیدار بنایا ہے کہ ہر انسان تمہارے جیسا ہو جائے؟ بلکہ شریعت نے جو دائرہ مقرر کیا ہے، اگر ایک انسان اس دائرہ کے اندر رہتے ہوئے کسی مباح کام پر عمل کر رہا ہے تو تمہیں نکیر کرنے کا کوئی حق نہیں اور نہ ہی اس مباح پر عمل کرنے والے کو برا سمجھنے کا حق ہے۔

اہل اللہ کی نقل اُتاریں

بہر حال! اہل اللہ کا طریقہ اختیار کرنے کی فکر کرنی چاہئے، اسی میں برکت ہے، اسی میں خیر ہے، اسی میں حفاظت ہے اور اسی کی برکت سے اللہ تعالیٰ سیرت و کردار بھی ان جیسی بنانے کی توفیق عطا فرمادیتے ہیں بشرطیکہ اس نیت سے اس طریقے کو اختیار کیا جائے کہ جب ہم ظاہر میں اہل اللہ کی نقل اُتاریں گے تو یہ فال نیک ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں باطن میں بھی ان جیسا بنادیں گے۔

نیت کی خرابی سے وبال کا اندیشہ

لیکن اگر بزرگوں کی نقل اس نیت سے کی جائے تاکہ ذرا ہم بھی دیکھنے میں بزرگ معلوم ہوں اور اس کے نتیجے میں لوگوں کی نگاہوں میں ہماری عزت ہو تو اس نیت کے نتیجے میں اُلٹا وبال کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا نیت یہ ہونی چاہئے کہ ان کی صورت اختیار کرنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان جیسی سیرت بھی عطا فرمادیں گے۔

وضعداری اچھی چیز نہیں

دوسرا جملہ حضرت والا نے یہ ارشاد فرمایا کہ ''وضعدار لوگوں کا مت رکھو''

''وضعداری'' کا مطلب یہ ہے کہ کسی نے اپنا خاص طریقہ بنالیا کہ میں ہمیشہ اس انداز کی ٹوپی پہنوں گا، ہمیشہ ایسا کرتا پہنوں گا، ایسا پاجامہ پہنوں گا، ایسا موزہ پہنوں گا، ایسا جوتا پہنوں گا، اور پھر اس خاص لباس کا اتنا اہتمام کرلیا کہ وہ لباس اس آدمی کی پہچان بن گیا۔ یہ ہے ''وضعداری'' اس کے بارے میں حضرت والا فرماتے ہیں کہ طریقِ سلوک کے اندر یہ چیز اچھی نہیں، کیونکہ اس کے نتیجے میں لوگوں کی انگلیاں اُٹھتی ہیں اور لوگ اس کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص ایسا وضعدار ہے کہ جب بھی یہ شخص ٹوپی پہنے گا تو اس انداز کی پہنے گا، یہ شخص ہمیشہ سفید شیروانی پہنے گا، ہمیشہ ایسا جوتا پہنے گا۔ اس پر حضرت والا فرماتے ہیں کہ ایسا کام کیوں کرتے ہو جس کے نتیجے میں لوگوں کے درمیان تمہارا امتیاز پیدا ہو بلکہ وقت پر جیسا میسر آجائے وہ اختیار کرلو اور جس وقت جس لباس میں راحت معلوم ہو وہ پہن لو۔

اکبر الٰہ آبادی کا ایک واقعہ

اکبر الٰہ آبادی مرحوم جو مشہور شاعر گزرے ہیں، میں نے ان کے بارے میں اپنے والد

ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک دن لوگوں نے ان کو سڑک پر اس طرح جاتے ہوئے دیکھا کہ تہبند پہنا ہوا ہے اور اس کے اوپر کالر والی شرٹ پہنی ہوئی ہے اور سر پر ہیٹ پہنا ہوا ہے۔ اب جو شخص بھی ان کو اس حالت میں دیکھتا تو اس کو ایک ہیولیٰ نظر آتا، اس لئے کہ لباس میں کوئی مطابقت نہیں تھی۔ کسی نے ان سے پوچھ لیا کہ جناب! یہ آپ کیسا لباس پہنے جا رہے ہیں؟ جواب میں انہوں نے کہا کہ تمہیں کیا اعتراض ہے؟ بھائی! ہمیں جس چیز میں راحت معلوم ہوئی وہ ہم نے پہن لی، ہمیں اس وقت تہبند پہننے میں راحت معلوم ہو رہی تھی، اس لئے تہبند پہن لی اور کالر دار شرٹ پہننے میں راحت معلوم ہو رہی تھی، وہ شرٹ پہن لی اور چونکہ دھوپ تھی، دھوپ سے بچنے کے لئے سر پر ہیٹ پہن لیا، جس چیز میں راحت معلوم ہوئی وہ پہن لیا، آپ کو کیا اعتراض ہے؟

من بھاتا کھاؤ، من بھاتا پہنو

لوگوں میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ کھائے من بھاتا اور پہنے جگ بھاتا، یعنی وہ چیز کھائے جو آدمی کے دل کو اچھی لگے، یہ نہ ہو کہ اچھی تو دوسروں کو لگ رہی ہے اور کھا تم رہے ہو، یہ فضول بات ہے، لہٰذا وہ چیز کھاؤ جو تمہارے من کو بھائے، تمہارے دل کو اچھا لگے، جس کا ذائقہ تمہیں پسند ہو۔ اور پہنے وہ لباس جو ساری دنیا کو پسند ہو، اس لئے کہ جگ سے مراد زمانہ ہے، یعنی زمانہ جس لباس کو پسند کرے وہ پہنو۔ لوگوں میں یہ مقولہ مشہور ہے۔

لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ مقولہ درست نہیں، بلکہ انسان کھائے بھی من بھاتا اور پہنے بھی من بھاتا، یعنی جو اصول کھانے میں ہے وہی اصول پہننے میں ہے کہ جو کھانا تمہیں پسند ہے وہ کھاؤ اور جو لباس تمہیں پسند ہے وہ پہنو، یہ نہ ہو کہ تمہیں تو کوئی اور لباس پسند آرہا تھا، لیکن زمانے نے فیشن بدل دیا، لہٰذا اب تم نے زمانے کی تقلید میں ایسا لباس پہن لیا جو تمہیں پسند نہیں تھا، یہ حماقت کی بات ہے۔

زمانے کی تقلید میں اسراف ہے

اور زمانے کی تقلید کرنے میں ''اسراف'' لازمی ہے، کیونکہ جو کپڑے پہلے بنائے تھے وہ اب بیکار ہو گئے اور ان کے استعمال کرنے کا مصرف نہیں رہا، اس لئے اب نئے کپڑے سلوائے جائیں گے، لہٰذا اس فیشن پرستی کا ایک لازمی نتیجہ ''اسراف'' ہے۔

دو باتیں اختیار کرلیں

بہر حال! حضرت والا کے ملفوظات پڑھ کر جو بات سمجھ میں آئی، وہ یہ ہے کہ ہر زمانے میں علماء اور صلحاء کا لباس اور ان کا طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور یہ نیت ہونی چاہئے کہ میں ان کا لباس اس لئے اختیار کر رہا ہوں تا کہ اللہ تعالیٰ ان جیسی صورت اختیار کرنے کی برکت سے ان کی جیسی سیرت بھی عطا فرما دیں۔ لیکن اس لباس اور اس طریقہ کو سنت اور واجب نہیں سمجھنا چاہئے، لہٰذا اگر دوسرا آدمی اس طریقے اور اس لباس کے علاوہ دوسرا طریقہ اختیار کیے ہوئے ہے اور وہ طریقہ مباحات کے دائرے میں ہے تو اس پر نہ تو نکیر کرے اور نہ ہی اس کو برا سمجھے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ کسی خاص طریقے کا ایسا التزام کہ کبھی اس سے تخلّف ہی نہ ہو، یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں، بلکہ جس وقت جیسا لباس میسر ہو وہ لباس اختیار کرلے، کبھی ایسی ٹوپی پہن لی، کبھی ویسی پہن لی، کبھی ایسا جوتا پہن لیا، کبھی دوسرا جوتا پہن لیا، ایک لباس کا بہت زیادہ اہتمام نہ ہونا چاہئے، اس اہتمام میں ایک طرف تو "التزام ما لا یلزم" کا خطرہ بھی ہے اور دوسری طرف اس اہتمام سے امتیاز پیدا ہوتا ہے اور یہ انسان کی بے تکلفی اور تواضع کے بھی منافی ہے۔

قرض لینے سے پرہیز کریں

دوسری نصیحت حضرت والا نے یہ فرمائی:

> "بلاضرورت ہرگز مقروض مت بنو، گو رسم و رواج کے خلاف کرنا پڑے، مقروض ہونے سے بڑی پریشانی ہوتی ہے جس کا انجام بہت برا ہے، ہر مسلمان کو وہی مذہب رکھنا چاہئے جو اہل اللہ کا ہے"(۱)

اس نصیحت میں "اسراف" سے بچنے کا بڑا زبردست قاعدہ بیان فرما دیا، وہ یہ کہ "قرض" سے بھاگو اور شدید ضرورت کے بغیر قرض نہ لو، کسی وقت پیٹ پر پتھر باندھنا پڑ جائے تو وہ گوارا کرلو لیکن قرض لینا گوارا نہ کرو۔ اگرچہ بعض اوقات آدمی بھوک سے مجبور ہو جاتا ہے تو بہر حال لینا پڑتا ہے، اس وقت اگر کوئی لے لے تو کوئی حرام اور ناجائز نہیں، لیکن اپنی ذہنیت یہ بناؤ کہ کسی غیر اللہ کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا، نہ تو مانگنے کے لئے ہاتھ پھیلانا ہے اور نہ ہی قرض کے لئے، یہ ذہنیت بنالو۔

---

(۱) انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۹۲

اخراجات کم کرلیں

جب تم یہ اصول بنالو گے کہ قرض نہیں لینا تو پھر خود بخود تمہیں اخراجات کم کرنے پڑیں گے۔ اب اس صورت میں اخراجات آمدنی کے دائرے میں کرنے پڑیں گے، کیونکہ اس سے زیادہ اخراجات کرے گا تو آدمی کو قرض لینا پڑے گا اور یہ اصول بنالیا ہے کہ قرض لے کر کوئی کام نہیں کرنا۔

استطاعت کم، کام زیادہ

ہمارے معاشرے میں یہ زبردست فساد پھیلا ہوا ہے کہ آدمی کی استطاعت تو تھوڑی ہے اور اخراجات زیادہ ہیں اور وہ اخراجات چونکہ تھوڑی آمدنی میں پورے نہیں ہوتے تو اب ان کے لئے قرض لیتا ہے اور پھر قرض در قرض ہوتے ہوتے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ یہ قرض لینے کی خرابی ہمارے اندر انفرادی سطح پر تو تھی مگر اب اجتماعی سطح پر ہمارا پورا ملک قرضوں پر چل رہا ہے۔

چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ

پہلے بزرگ کہا کرتے تھے کہ "چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ" یعنی یہ دیکھو کہ چادر کتنی ہے، پھر جتنی چادر ہے اتنے پاؤں پھیلاؤ، اس سے آگے مت پھیلاؤ۔ آج کا اصول یہ ہے کہ پاؤں پہلے پھیلاؤ اور پھر اس کے مطابق چادر بعد میں تلاش کرو اور اگر چادر نہ ملے تو بھیک مانگو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج پوری کی پوری قوم مقروض ہے، آج ہمارے ملک کے بجٹ کا ۴۶٪ حصہ صرف قرضوں کی ادائیگی میں جاتا ہے۔ شیطان نے سود کا ایسا چرخہ چلایا ہے کہ آج پوری دنیا قرض کے اندر ڈوبی ہوئی ہے، صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ امریکہ بھی اتنے بڑے قرض میں ڈوبا ہوا ہے کہ کوئی حدوحساب نہیں، لیکن چونکہ وہ امیر ملک ہے، اس لئے فی الحال وہ اس قرض کو برداشت کر رہا ہے، مگر یہ ایک ایسا غبارہ ہے جو کسی وقت بھی پھٹ جائے گا۔ ہمارا ملک چونکہ غریب ہے، اس لئے ان قرضوں کا بوجھ ہمارے اُوپر بہت زیادہ ہے، اس وقت ہماری آزادی اور ہماری عزت ہر چیز داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ بہرحال، بلاوجہ قرض نہ کرو۔

مقروض کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے انکار

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک جنازہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نمازِ جنازہ کے لئے لایا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے پوچھا کہ ان پر قرض ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بتایا کہ ان پر قرض

ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((صَلُّوْا عَلٰی صَاحِبِکُمْ))(۱)

''تم ہی اپنے ساتھی پر نماز پڑھ لو، میں نہیں پڑھتا''

ایک معمولی خاتون کی قبر پر نمازِ جنازہ

دوسری طرف وہ حدیث یاد رکھنی چاہئے کہ ایک دن حضورِ اقدس ﷺ نے صحابہ کرام سے پوچھا کہ ایک خاتون جو مسجد نبوی میں جھاڑو دیا کرتی تھی، وہ بہت دن سے نظر نہیں آرہی ہے، کہاں گئی؟ ایک روایت میں ہے کہ مرد تھا، ایک روایت میں ہے کہ عورت تھی۔ صحابہ کرام نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اس کا انتقال ہوگیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہمیں بتایا نہیں۔ صحابہ کرام نے فرمایا کہ وہ ایسا وقت تھا کہ آپ کو اس وقت نمازِ جنازہ میں شریک ہونے میں زحمت ہوتی، اس لئے آپ کو نہیں بتایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، ایسا نہ کرو، بلکہ جب کسی کا انتقال ہوجائے تو مجھے بتاؤ۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اچھا اس کی قبر دکھاؤ، کہاں ہے؟ چنانچہ آپ اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور قبر پر آپ نے نمازِ جنازہ پڑھی۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ هٰذِهِ الْقُبُوْرَ مَمْلُوَّةٌ ظُلْمًا فَيُنَوِّرُهَا اللّٰهُ بِصَلَاتِيْ))(۲)

''یہ قبریں اندھیرے سے بھری ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ میری نماز پڑھنے کی برکت سے ان میں نور پیدا فرما دیتے ہیں''

اسی لئے علماء حنفیہ فرماتے ہیں کہ یہ حضورِ اقدس ﷺ کی خصوصیت تھی، کوئی دوسرا شخص قبر پر جا کر نماز نہ پڑھے، اس لئے کہ ولی کے علاوہ دوسرے شخص کے لئے قبر پر نماز پڑھنا جائز نہیں، البتہ اگر ولی نے نمازِ جنازہ نہیں پڑھی تو اس کے لئے قبر پر نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔

دیکھئے! ایک طرف تو یہ حال ہے کہ ایک ایسی خاتون جس کی نمازِ جنازہ پڑھا دی گئی ہے اور اس کو دفن کر دیا گیا، البتہ آپ ﷺ کے علم میں اس کے انتقال کی خبر نہیں آئی، لیکن جب آپ ﷺ کو

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الحوالات، باب ان أحال دین المیت علی رجل جاز، رقم: ۲۱۲۷، سنن الترمذی، کتاب الجنائز عن رسول اللّٰہ، باب ما جاء فی الصلاۃ علی المدیون، رقم: ۹۸۹، سنن النسائی، کتاب الجنائز، باب الصلاۃ علی من علیه دین، رقم: ۱۹۳۴، سنن أبی داؤد، کتاب البیوع، باب فی التشدید فی الدین، رقم: ۲۹۰۲، سنن ابن ماجه، کتاب الأحکام، باب الکفالة، رقم: ۲۳۹۸

(۲) صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب الصلاۃ علی القبر، رقم: ۱۵۸۸، مسند أحمد، رقم: ۸۶۷۶

اس کے انتقال کا علم ہوا تو آپ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی تا کہ اللہ تعالیٰ اس کی قبر کو نور سے بھر دے۔

دوسری طرف یہ حال ہے کہ جنازہ سامنے رکھا ہے، اس لئے رکھا ہے تا کہ حضور ﷺ اس پر نمازِ جنازہ پڑھیں، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم ان پر نماز پڑھ لو، میں نہیں پڑھتا، کیونکہ ان کے ذمے قرض ہے۔

قرض کا ذمہ لینے کے بعد نمازِ جنازہ پڑھائی

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ان کا قرض میں اپنے ذمے لیتا ہوں۔ آپ ﷺ نے سوال کیا کہ کیا پورا قرض اپنے ذمے لیتے ہو؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں یا رسول اللہ ﷺ! میں پورا قرض اپنے ذمہ لیتا ہوں۔ پھر آپ ﷺ نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔

واپس کرنے کی طاقت نہ ہونے کے باوجود قرض کیوں لیا؟

آنحضرت ﷺ نے یہ جو مقروض آدمی کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے منع فرمایا، اس کی کیا وجہ تھی؟ بظاہر تو وہ شخص دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ستم رسیدہ تھا اور دوسروں کے مقابلے میں رحم کا زیادہ مستحق تھا لیکن حضورِ اقدس ﷺ نے اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھائی، اس سے اس طرف توجہ دلائی کہ جب قرض واپس کرنے کی استطاعت نہیں تھی تو پھر قرض لیا ہی کیوں تھا؟ معلوم ہوا کہ بلاضرورت قرض لینا اور یہ معلوم ہوتے ہوئے قرض لینا کہ میں واپس ادا نہیں کر سکوں گا، یہ اتنی وبال کی بات ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کی نمازِ جنازہ سے محرومی کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا کسی شخص کو بھی حتی الامکان قرض لینے کا اقدام نہیں کرنا چاہئے۔

ہمارے معاشرے میں قرض کی وبا

آج ہمارے معاشرے کے اندر اس معاملے میں بڑی افراط و تفریط پائی جا رہی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے طبقے میں جو دیندار طبقہ کہلاتا ہے، اس میں خاص طور پر یہ وبا عام ہو رہی ہے۔ نہ تو اس کا اہتمام ہے کہ قرض ہی نہ لیں اور نہ ہی اس کا اہتمام ہے کہ اگر قرض لیا ہے تو وقت پر واپس کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سالہا سال گزر جاتے ہیں اور قرض واپس نہیں ہوتا۔ اس لئے میں حتی الامکان اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ کسی کو قرض نہ دینا پڑے۔ اللہ تعالیٰ کسی کی مدد کرنے کی جو توفیق دیتے ہیں وہ کر دیتا ہوں، لیکن قرض دینے سے بچتا ہوں، اس لئے کہ قرض دینے کے بعد اس کا حساب لکھواور پھر ہر وقت دماغ پر یہ فکر سوار ہے کہ وہ قرض واپس آئے گا اور وہ واپس آتا نہیں۔ ساری زندگی میں چند

واقعات کے علاوہ مجھے یاد نہیں کہ کوئی آدمی قرض لے کر واپس کر گیا ہو، حالانکہ قرض لے جانے والے اچھے خاصے دیندار، عالم و فاضل اور بزرگوں کی صحبت میں عمریں گزار دینے والے، قرض لے کر گئے مگر آج تک پتہ نہیں کہ وہ قرض کہاں گیا۔

آج گناہ کے لئے قرض لیے جاتے ہیں

بہر حال! اوّل تو آدمی قرض کیوں لے؟ اگر لے تو پھر وقت پر ادائیگی کا اہتمام کرے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس ملفوظ میں فرمارہے ہیں کہ "بلا ضرورت ہرگز مقروض مت بنو، گو رسم و رواج کے خلاف کرنا پڑے" یعنی اس لئے قرض لے رہے ہیں کہ ہمارے ہاں فلاں موقع پر دعوت کی جاتی ہے۔ العیاذ باللہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کرنے کے لئے قرض لے رہے ہیں۔ آگے فرمایا کہ "مقروض ہونے سے بڑی پریشانی ہوتی ہے جس کا انجام بہت برا ہے، لہٰذا ہر مسلمان کو وہی مذہب رکھنا چاہئے جو اہل اللہ کا ہے"

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ